شہاب

جلد (۱۰) امرداد ۱۳۵۱ف م جون ۱۹۴۲ء نمبر (۹)

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (عہ)

مضمون نگار حضرات اپنے مضامین ۵ تاریخ تک ارسال فرمائیں

غزل

جنابِ ضامن صاحب کنتوری

رنگینیٔ خونِ شہیداں کو نہ حقیقتِ فاش مجاز سمجھ
پھولی ہی وفا کی افق پہ شفق اس موت کو زیست کا راز سمجھ

میں تجھ سے کہونگا سوچ ذرا بہتی ہی کہیں اُلٹی گنگا
یہ جذبۂ شوق مفرط تھا اِس ناز کو عین نیاز سمجھ

ہرچند کہ اولیٰ طاعت ہے تکلف میں کلفت ہے
عبدیت عین عبادت ہے تسلیم خودی کو نماز سمجھ

ہر آساں کو مشکل نہ سمجھ آساں نہ سمجھ ہر مشکل کو!
منزل پر تجھکو پہنچنا ہے رستے کا نشیب و فراز سمجھ

منسوب ہے آخر سے اوّل تکمیل ہی پہلی شرطِ عمل!
آغاز ہی سے انجام پہ چل انجام کو ہی آغاز سمجھ

جُز دل کے مکیں مکاں نہیں وہ پابندِ زمین و زماں نہیں یا
محدُودِ حدودِ جہاں نہیں وہ نہ عراق سمجھ نہ حجاز سمجھ

ساقی کے کرم کا ٹھکانا ہی وہ رحمت و فیض کا دریا ہے
ہم پیتے ہیں وہ پلاتا ہے ضامن درِ توبہ کو باز سمجھ

غم مخور

جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا
استاد فلسفہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

زندگی کی غایت لذت نہیں، آسان اور آسودہ زندگی بسر کرنا نہیں، راحت و فرحت کا حصول نہیں؛ بلکہ سیرت کی پختگی ہے، ربط بہ حق پیدا کرنا ہے، ظلمت سے نکلنا نور کی طرف رخ کرنا ہے، نورانی بننا ہے بلکہ نور بن جانا ہے۔ جہل کی تاریکی سے نکل کر علم صحیح کے نور کو حاصل کرنا گویا نورانی بننا ہے مبدء نور کے روبرو جو شخص بھی آتا ہے خود نور بن جاتا ہے۔ غایت کا علم خود ایک بڑی چیز ہے، اب ہمیں اس کے حصول کے ذرائع پر غور کرنا چاہیے۔

سیرت کی پختگی حق کے ساتھ ربط قایم کرنے سے ہوتی ہے۔ درد و غم اس غایت کے حصول کے ذرائع ہیں۔ بلاحقیقت میں عطا ہے، اس سے ہمارے اخلاقی اعصاب میں قوت پیدا ہوتی ہے [illegible] احساسات بیدار ہوتے ہیں۔ حقائق اشیاء کا علم ہوتا ہے، ہم دھوکے سے نکل آتے ہیں، خیر و شر کی خوب تمیز ہو جاتی ہے، چیزوں کو 'ابدیت کی روشنی' میں دیکھنے لگتے ہیں، ان کی حقیقی قیمت سے واقف ہو جاتے ہیں، علم الیقین عین الیقین سے بدل جاتا ہے، اور قدرتی طور پر سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح غم سعادت و سکون کا ذریعہ بن جاتا ہے!

غم کے وقت غور کے قابل ایک چیز ہے اور وہ یقین کا معاملہ ہے۔ حق تعالیٰ "حاکم" ہیں اور "حکیم" ہیں۔ مومن کا یہ بنیادی تیقن ہے کہ حق تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہیں "لہ ما فی السمٰوات و ما فی الارض"۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب ان کی ملک ہے، بلا شرکت غیر مالک وہ ہیں، ہم "امین" ہیں، جو کچھ ہمارے ہاں ہے وہ بطور امانت ہے۔ یہ امانت ہماری موت کے وقت ہم سے واپس لیلی جاتی ہے اور دوسروں کے حوالہ کر دیجاتی ہے، بعض دفعہ زندگی ہی میں چھین لیجاتی ہے، اگر ہم میں خیانت اور غصب کی جہت نہیں تو ہم امانت کو طلب کے وقت خوشی سے واپس کر دیتے ہیں، ہمیں غم ہوتا ہے اور نہ غصہ، بلکہ فرحت ہوتی ہے، بار ہلکا ہو جاتا ہے اور ہم شکر کرتے ہیں کہ ہم نے امانت کو حفاظت کے ساتھ رکھا اور وقت طلب حفاظت کے ساتھ واپس کیا، اب جس کی امانت ہے اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی کے موافق اس میں تصرف کرے، جس کو چاہے دے اور جتنے روز کیلئے چاہے دے! کسی چیز کے چھن جانیکے وقت جو ہمیں غم ہوتا ہے یاد رکھو کہ خیانت کی جہت کی وجہ سے ہوتا ہے، ہماری مثال اس چوہے کی سی ہوتی ہے جو بنئے کی

دکان کی ساری چیزیں اپنی سمجھتا ہے، یہ کیسا زبردست مغالطہ ہے، اس کو "غرورِ علم" کہتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ ہم وغم درد وحزن، رنج والم ہے، یہ پیدا ہوتا ہے، غصب سے، خیانت سے، شرک سے، دور ہوتا ہے، علم صحیح سے، توحید سے، اس اقرار سے کہ لہٗ ما فی السمٰوات وما فی الارض، حق تعالیٰ کو 'حاکم' جاننے سے اور خود کو 'محکوم' ماننے سے۔

" گماں مبر کہ زر و سیم دادہ اند ترا ودیعتے است کہ داری بدست روزے چند
چہ سود گر بشوی غرّہ بر متاع کسے چو موش بر سرِ دکان روستا خور بند! "
بقال ۱۲

اب اس پر غور کرو کہ حق تعالیٰ کو حکیم جاننے سے غم سے کس طرح نجات ملتی ہے۔ حق تعالیٰ ہمہ داں و ہمہ بین ہیں، علیم ہیں بصیر ہیں اور حکیم ہیں، اب حکیم سے کوئی باطل فعل کا صدور کیسے ہو سکتا ہے " فعلِ حق باطل نباشد اے سلیم" جو کچھ وہ کرتے سراسر حکمت سے مملو ہوتا ہے، باطل کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ وہ قادرِ مطلق بھی ہیں، اپنے فعل میں عاجز نہیں کیوں نہ ہم ان ہی کے حکم موافق ان کو کاموں میں اپنا وکیل بنالیں، " فاتخذوہ وکیلا" ان کا فرمان ہے، کیوں نہ ہم کہیں کفیٰ باللہ وکیلا" اور آزادی و اطمینان کے ساتھ مصروف عمل نہ ہو جائیں؟ اس یقین سے ہمیں کتنی حریت نصیب ہوتی ہے! غم واندوہ کے بادل کیسے چھٹ جاتے ہیں، فکر کے بار سے کیسے نجات ملجاتی ہے اور صحیح معنی میں کتنی آزادی وطمانیت حاصل ہوتی ہے! ہم کیا اور ہمارا علم کیا؟ ماعلم لنا الا ما علمتنا! ظلوم وجہول ہماری یاست! ناک سے کچھ گز آگے ہم کو نہیں سوجھتا، اس پر ہمہ دانی کے دعوے ٹھیک نہیں معلوم ہوتے! کیوں نہ اس یقین کو ہم اپنی سپر بنائیں کہ حاکم و حکیم اللہ ہماری "حقیقت" ہیں، جہاں داری ان ہی کو زیبا ہے، حکم ان ہی کا چلتا ہے، الحکم للہ"! اور وہ جو کچھ کرتے ہیں خیر محض ہوتا ہے ع

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

میری تجویز اگر ٹوٹے تو کیا پرواہ ہے، میری تجویز کیا اور میں کیا، میں اپنی بھلائی سے کیا واقف، جاہل کو علم کا دعویٰ زیب نہیں دیتا، وہ جہل کا اعتراف کرلے تو پھر اس کو علم ملتا ہے اور یہ علم آزادی بخش ہوتا ہے، غم والم سے نجات دیتا ہے، فرحت و سرور پیدا کرتا ہے، قوۃ کا مبدء ہے، مجاہدہ کو آسان بناتا ہے اور بالآخر خدا تک پہنچا دیتا ہے جس کو پاکر ہم 'غنی عن الشئی' ہو جاتے ہیں، ہماری قسمت کسی شئی کے ملنے سے نہیں جانچی جا سکتی ہم کسی شئی کے محتاج نہیں رہتے ہم کسی شئی کی خواہش نہیں کرتے، اللہ کو رکھکر ہمیں کس چیز کی خواہش ہو سکتی ہے!

در ہجر تو بودہ اندوہ و آزارم از وصل تو رفت ہستی و پندارم
شادی آمد و نصیب جانم شد اکنوں جان و تنِ خویش را برادارم

الذین امنوا وتطمئن قلوبہم بذکر اللہ، الا بذکر اللہ تطمئن القلوب!

پہلا تجربہ

(ایک ریڈیو ڈراما)

جناب فسیعض محمد صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایڈ

(نعمت خانہ پر سے برتنوں کے گرنے کی آواز)

بچہ۔ ممی۔ ممی

(نسیمہ "اونہہ" کر کے کروٹ لیتی ہے)

بچہ۔ ممی۔ ممی

نسیمہ۔ (نیم بیداری کی حالت میں) کیا ہے بیٹا؟

بچہ۔ ممی بلی آئی ہے۔

نسیمہ۔ (چونک کر) بلی..... ہاں.....

کچھ نہیں سو رہو بیٹا۔

(گھنٹہ کی آواز۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن)

نسیمہ۔ ایں کیا تین بج رہے ہیں۔ اور یہ...

... یہ ابھی تک بستر پر نہیں آئے۔ افضل......

افضل.... کیا ابھی تک کام کر رہے ہو..... اے

کیا میری آواز سنائی نہیں دیتی ؟

افضل۔ (ذرا فاصلہ سے) سن رہا ہوں بیگم،

سن رہا ہوں۔

نسیمہ۔ کیا خاک سن رہے ہو، اگر سنتے ہوتے تو پہلے

ہی جواب دیتے۔

افضل۔ ہوں..... اچھا غلطی ہوئی معاف کرو۔

نسیمہ۔ مگر یہ کام کب تک کرتے رہوگے۔ تین بج چکے ہیں

کیا ابھی تک نیند نہیں آئی ؟

افضل۔ نیند........ ہاں ذرا ایک ضروری کام

کر رہا ہوں..... تم سو رہو میں ابھی آتا ہوں۔

نسیمہ۔ آپکے ضروری کام تو کبھی ختم نہ ہوں گے....

.... آپ اس طرح نہ مانیں گے۔ میں خود آتی ہوں۔

(چلنے کی آواز)

یہ کیا تمہاری آنکھیں تو دیکھو کتنی سرخ ہو گئیں

ہیں اور تم ہو کہ لکھے جا رہے ہو۔ کیا تمہیں اپنی آنکھوں

پر بھی رحم نہیں آتا..... اس حالت میں کام کرنے

سے بصارت خراب ہو جائے گی نا۔

افضل۔ بھلا لکھنے پڑھنے سے کہیں آنکھیں خراب

ہوتی ہیں بیگم۔ اس سے بصارت نہیں جاتی بلکہ بصیرت

آتی ہے..... کیا واقعی آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں؟

نسیمہ۔ اونہہ، لگے بات میں بات بنانے۔ چلو رات

بہت زیادہ ہو گئی..... سو رہو، بچے بھی اکیلے ہیں۔

(یہ کہکر نسیمہ میز پر کے کاغذ گھسیٹتی ہے۔ کاغذ

گھسیٹنے کی آواز)

افضل۔ ار ر ر۔ بیگم ذرا رحم کرو۔ میں کہا، نا

تم جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

نسیمہ - میں نہیں مانتی آپ کی بات

افضل - ارے کیا غضب ہے - کیا اچھا پلاٹ سوچا تھا - کیسی نزاکت پیدا کی تھی فسانے میں - تم نے سب پر پانی پھیر دیا۔

نسیمہ - چلو اچھا ہوا ، نجات ملی - بھلا کوئی شریف آدمی اتنی رات گئے تک کام کرتا ہے - ساری دنیا تو چین کی نیند سو رہی ہے اور آپ ہیں کہ لکھنے میں مصروف ـــ یہ بھی کوئی سمجھ کی بات ہے۔

افضل - اہاہاہا - بیگم تم اتنی سی بات نہ سمجھ سکیں جب ساری دنیا سو چکتی ہے تو مصنف کی دنیا جاگ اٹھتی ہے - رات کے اس سکوت میں فطرت کی ساری نیرنگیاں اس کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں اور وہ مزے سے ان کا تماشا کرتا ہے - یہی وہ وقت ہے جبکہ شاعر کو وجدان ہوتا ہے - یہی وقت ہے جبکہ آسمانی تجلیات سے ساری دنیا روشن ہوجاتی ہے اور دیکھنے والی آنکھ کے لئے زندہ ہوتی ہے یہی وہ وقت ہے جبکہ......

نسیمہ - (بیزارگی سے) بس... بس ..... بس ..... رہنے دیجئے آپ کے اس فلسفہ کو..... اب چلئے اور آرام کیجئے۔

افضل - خیر اگر تمہیں ان باتوں کا یقین نہیں آتا تو چلو چلتا ہوں ..... مگر ذرا اجازت دیتیں تو یہ سین ختم کرلیتا۔

نسیمہ - سین - کیا کوئی ڈراما لکھا جارہا ہے۔

افضل - ہاں - ہاں - ڈراما اور بہت ہی زوردار ڈراما۔

نسیمہ - خوب - تو افسانے لکھتے لکھتے یہ سودا کب سے سمایا۔

افضل - سودا کیسے - افسانے کا ارتقا ہی ڈراما ہے - افسانہ میں زندگی کی صرف ایک جھلک ہوتی ہے - اور ڈراما پوری زندگی کا ایک مرقع .... بیشمار افسانوں کا مجموعہ - افسانہ نویس افسانہ لکھنے میں جب کمال حاصل کرلیتا ہے تو ڈراما کی طرف رجوع ہوتا ہے .... میں تو کئی دنوں سے اسرار زندگی کو اس سانچے میں ڈھال رہا ہوں ..... اور یہ ...... یہ تو میرا دوسرا ڈراما ہے

نسیمہ - دوسرا - اچھا تو گویا پہلے ایک لکھا جاچکا ہے۔

افضل - ہاں۔

نسیمہ - خوب تو پھر ہمیں بھی اسے بتایا ہوتا - خیر سے ہم بھی اسے ایک نظر دیکھ لیتے۔

افضل - ایک نظر کیا - تم ہزار دفعہ پڑھ سکتی ہو۔

نسیمہ - پڑھنا تو خیر دور کی بات ہے - آپ نے تو اس کا ذکر تک نہ کیا۔

افضل - ہاں بیگم - ذکر نہ کرسکا مگر مجھے یقین ہے کہ تم اسے پڑھوگی تو ضرور داد دوگی - بھئی ہم تو تمہارے مذاق کے قائل ہیں - یوں تو بہت سی عورتیں پڑھی لکھی ہوتی ہیں لیکن تم سا مذاق بہت کم نے پایا ہوگا سچ پوچھو تو

ہم اپنے کو بڑا خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ تم جیسی بیوی ہمیں مل گئی۔ مگر

نسیمہ۔ مگر کیا؟

افضل۔ نہیں کچھ نہیں!

نسیمہ۔ کچھ نہیں کیسے۔ کہتے کہتے تو رک گئے اور پھر کہتے ہو کہ کچھ نہیں۔

افضل۔ بات یہ ہے بیگم کہ بلا شبہ تم آرٹ کی قدر دان ہو، اور جس نظر سے اسے دیکھنا چاہئے ضرور دیکھتی ہو۔ لیکن بعض وقت...... میں کہہ رہا تھا بعض وقت......

نسیمہ۔ ہاں ہاں کہئے چلئے رکتے کیوں ہیں۔

افضل۔ ہاں بعض وقت ضروری میں غیر ضروری باتیں ملا کر ذرا...... ذرا ہمارا موڈ (MOOD) خراب کر دیتی ہو۔

نسیمہ۔ تو گویا یہ مطلب ہوا کہ میری باتیں آپ کو کڑوی لگتی ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔

افضل۔ نہیں نہیں۔ میں نے یہ کب کہا۔ میں نے ابھی کہا نا کہ تم آرٹ کی قدر دان ہو۔

نسیمہ۔ قدر افزائی شکریہ۔ مگر یہ بھی صحیح ہے نا کہ ضروری میں غیر ضروری کو ملا کر آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہوں.... (ذرا زور سے) اچھا اب میں یہ پوچھتی ہوں کہ آپ کے اس طرح صبح سے شام اور شام سے صبح تک مغز مارنے سے کیا حاصل۔

افضل۔ بھئی واہ مغز مارنے کی ایک ہی کہی۔ ارے یہ تو اپنا اپنا شوق ہے۔

نسیمہ۔ شوق ہے.... دیکھئے مجھے آپ کا یہ شوق ایک پل بھی نہیں بھاتا۔ اچھا ہوتا کہ آپ کو مرغی پالنے بٹیر لڑانے یا کبوتر اڑانے کا شوق ہوتا۔ اس سے کم از کم کھانے کو انڈے ملتے اور بچوں کی دل بہلائی ہو جاتی...... مگر آپ کا شوق یہ شوق بھی کس کام کا کہ جس سے ایک تو خود تباہ، دوسرے گھر والے بیزار اور پھر نتیجہ...... نتیجہ یہ کہ ہمیشہ سولہ سو کے ہزار۔

افضل۔ نسیمہ۔ یہ آج تم کو ہو کیا گیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ کیا کوئی برا خواب تو نہیں دیکھا۔

نسیمہ برا خواب۔ جس کو دن بھر خواب خواب نظر آتے ہوں۔ بھلا اسے رات میں خراب خواب کیا دکھائی دیں گے...... اور دیکھتی ہوں۔ صبح ناشتہ کیا۔ دفتر گئے اور واپس آئے تو آپ چلے اپنا کتاب خانہ بہلانے نہ بیوی کی فکر نہ بچوں کا خیال۔ ایسا ہی تھا تو پھر شادی کیوں کی اور یہ نصف درجن بچے........

افضل۔ بیگم۔ آخر ایسی آج بگڑی کیوں ہو۔

نسیمہ۔ نہ بگڑوں تو کیا کروں، میرا دل جلتا ہے اس لئے کہتی ہوں۔ سچ بتاؤ آخر اس سارے دھندے سے حاصل۔

افضل۔ حاصل کیا مطلب۔ بھلا تم پڑھی لکھی ہو تم کو اس کے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک

تو علم میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسرے جب ہمارا کام اخبار و
اور رسالوں کے ذریعہ عوام کے سامنے آتا ہے تو اس سے نام
بھی ہوتا ہے۔

نسیمہ۔ (طنز آمیز لہجہ میں) بس دل کے بہلانے کو
غالب یہ خیال اچھا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اخبار اور رسالے والے
بیچارے مصنفین پر کیا جادو چلا بیٹھے ہیں کہ یہ بھولے بھالے
ان کے دام میں آجاتے ہیں اور مفت میں اپنی زندگی ان کے
ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

افضل۔ ارے اس میں جادو کی کیا بات ہے تم ان
بیچاروں پر کیوں برس پڑیں۔ باہمی اتحاد ہی سے تو دنیا
کے کام چلتے ہیں۔ ہمارا کام ان کی وجہ سے عوام کے سامنے
آتا ہے اور ہماری وجہ سے وہ اپنا پرچہ چلاتے ہیں۔ یہ تو تم
جانتی ہو نا کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔

نسیمہ۔ میں یہ کہنا چاہتی نہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے
نہیں بجتی۔ دو ہاتھ سے بجتی ہے مگر حیرانی تو یہ ہے کہ ایسا
نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔

افضل۔ مطلب۔

نسیمہ۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ مصنفوں کی محنت بلکہ
سچ پوچھئے تو ان کا خون سینچ سینچ کر اپنے گھر گھی کے چراغ
جلاتے ہیں اور انہیں الٹے مفلسی کی تاریکی میں جھونک
دیتے ہیں۔

افضل۔ یعنی

نسیمہ۔ (ایک ٹھنڈا سانس لے کر) اب آپ کو
کس طرح سمجھایا جائے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ
آپ کی محنت کا معاوضہ کیوں نہیں دیتے؟

افضل۔ (زوردار قہقہہ لگاکر) اتنی بات تھی
اسے افسانہ کردیا۔ بیگم یہ علمی خدمت ہے علمی خدمت۔۔۔
۔۔۔۔ علمی خدمت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

نسیمہ۔ (حقارت آمیز انداز میں) علمی۔۔۔۔۔۔
خدمت۔۔۔۔۔۔ اس علمی خدمت کو میں علمی افلاس سمجھتی
ہوں۔ جب تمہارے ایڈیٹر بھیک کے مضامین سے اپنے
رسالے یا اخبار سیاہ کرتے رہیں گے تمہارا ادب فقیر
رہے گا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور یہ بھی سن لیجئے کہ افلاس
کے بانی آپ جیسے چند خوش خیال بیکار سے ہیں نہ آپ
لوگوں نے ان کے منہ کو اس طرح کا خون لگایا ہوتا اور
نہ وہ یوں مفت خوری کے عادی ہوتے۔

افضل۔ مگر بیگم۔ علمی خدمت تو کسی صلے کی
خاطر نہیں کیجاتی۔۔۔۔۔۔ علم تو محض علم کی خاطر۔۔۔

نسیمہ۔ لیکن ایک حد تک۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کہ
ایک تو اپنی زندگی اس کے لئے وقف کردے، اور دوسرا
اوس سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔

افضل۔ تو آخر اس میں ہمارا نقصان ہی کیا ہے۔

نسیمہ۔ نقصان۔۔۔۔ نقصان معلوم کس طرح ہو
کبھی آپ نے نقصان کا پتہ چلانے کی کوشش کی ہوتی تو آپ کو
اس کا علم بھی ہوتا۔ یہ تو مجھ سے پوچھئے کہ روزانہ اپنی

آنکھوں سے گھر کی کمائی کو لٹتا ہوا دیکھتی ہوں اور
زبان پر ایک حرف شکایت بھی نہیں لاتی۔

افضل - آخر وہ کیا بات ہے۔ کیسی کمائی کیسی
لوٹ۔ کیسا ڈاکہ - یہ تم آج شاعری تو نہیں کر رہی ہو۔

نسیمہ - خوانخواستہ - دنیا میں کوئی دوسرا کام
نہیں جو شاعری کروں۔ میں وہ کہہ رہی ہوں جو روز
اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ گھر کی ہزار ضرورتیں رک
جاتی ہیں۔ مگر کتب فروش کے بل میں کمی نہیں ہوتی۔ گھر
کے سارے کام کاج بالائے طاق رہ جاتے ہیں لیکن مطالعہ
کے اوقات میں کمی نہیں ہوتی...... بڑی عرق ریزی
کے بعد کوئی فسانہ یا مضمون تیار کیا جاتا ہے تو ستم ظریفی یہ
کہ اسے جیب کے پیسوں سے رجسٹری کرا کے بھیجا جاتا ہے
...... اچھا صاحب یہ سب درست ...... لیکن....
اس کا صلہ کیا...... شکریہ ایک دو حرفی خط۔

افضل - نسیمہ - تم اس مسئلہ پر بالکل افادی نقطہ
نظر سے غور کر رہی ہو۔

نسیمہ - کیوں نہ کروں - جب ساری دنیا زندگی
کے ہر پہلو میں افادیت کو ڈھونڈتی ہے تو پھر میں نے کیا
غلطی کی۔

افضل - بھئی - دوسری باتوں سے تو مجھے کچھ انکار
نہیں لیکن تحصیل علم اور اشاعت علم میں تو اس نقطۂ نظر کو
بیچ میں نہ لانا چاہیئے۔

نسیمہ - یہ ہندوستانی ذہنیت ہے - آج متمدن
ممالک میں...... میرا مطلب ہے کہ ان ملکوں میں
جہاں علم کی نہریں بہتی ہیں وہاں اسی نقطۂ نظر کا چلن ہے
آپ نے بھی ساری نہیں تو آدھی دنیا کی سیر کی ہے نا۔
بہت سے مصنفین سے بھی واقف ہیں نا۔ کیا یہ سب سارا
کام مفت کرتے ہیں۔

افضل - کیوں نہیں - بہت سے ایسے لوگ ہیں۔

نسیمہ - چند ایک کے نام تو بتلایئے۔

افضل - نام..... نام تو مجھے اس وقت ٹھیک
طور پر یاد نہیں۔

نسیمہ - یاد کس طرح آئیں - ہوتے تو یاد آتے....
سنئے کوئی بڑا مصنف ایک حرف بھی مفت نہیں لکھتا۔ برنارڈ
شا کولڈ ورنگ واٹر (   )
کیا یہ سب مفت میں مضامین لکھتے ہیں۔ کیا کپلنگ اور کنین
ڈائیل بلا معاوضہ مضامین لکھا کرتے تھے کیا؟

افضل - مگر یہ لوگ......

نسیمہ - مگر یہ لوگ شاید علم کے شیدائی نہیں ہیں۔
علم کو علم کی خاطر نہیں سیکھتے - محض روپیہ کمانے کی خاطر لکھتے
ہیں..... افضل..... تم بہت بھولے ہو میں تمہارے
علمی شوق کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے
یہ بھی بتلانا چاہتی ہوں کہ ہمارا ملک جب تک ادب کو ایک
باعزت ذریعۂ معاش نہ بنائے ادب میں ترقی ممکن نہیں۔
جہاں مقابلہ نہیں وہاں ترقی نہیں۔

افضل - بیگم تم جو کچھ کہتی ہو وہ درست ہے میں بھی

اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن ان باتوں پر غور کرتے وقت ہمیں اپنے ماحول کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ ہندوستان کے رسالوں میں اتنی سکت کہاں کہ وہ مصنفین کو خاطر خواہ معاوضہ دیکر مضامین لکھوائیں ادب کی جو کچھ بھی اشاعت ہو رہی ہے اس کو غنیمت سمجھو۔

نسیمہ - یہ بالکل غلط بات ہے۔ میں اسے ہرگز نہیں مانتی۔ اول تو بیسیوں اخبار اور رسالے ایسے ہیں جن کی آمدنی کافی سے زیادہ ہے اور وہ اپنی آمدنی سے مصنفین کو پھوٹی کوڑی بھی دینا گوارا نہیں کرتے اور دوسری بات یہ کہ اگر کسی اخبار یا رسالے میں چلنے کی سکت نہیں ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ لنگڑاتا ہوا چلے اور سسکتا ہوا جیئے۔ اس کو اس دنیا میں جنم لینے ہی کا کیا حق حاصل ہے۔

افضل - نسیمہ - یہ تو تمہاری بہت زیادتی ہے ہمارے ملک میں تو رسالوں اور اخباروں کی اتنی کمی ہے کہ جتنے زیادہ نکلیں اتنا ہی اچھا ہے۔ ان کی کثرت سے عوام میں پڑھنے لکھنے کا شوق بڑھے گا اور ایک مذاق تو پیدا ہو جائے گا۔ . . . .

نسیمہ - مگر میں ایسے مذاق کی قائل نہیں۔ مذاق پیدا ہی کرنا ہے تو اچھا مذاق پیدا کیجئے ورنہ بد مذاقی پیدا کرنے سے تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ انہیں اپنے حال ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

افضل - مگر موجودہ حالات میں اس کی کیا صورت ممکن ہے۔

نسیمہ - کیوں نہیں - معاوضہ پر مضامین لکھوائے جائیں، سب حالات اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔

افضل - معاوضہ - معاوضہ - معاوضہ۔ بیگم میں تمہاری ان دلیلوں کا قائل نہیں۔ تم صرف تصویر کے ایک ہی رخ کو دیکھ رہی ہو۔ مگر ہاں تمہارے خیال کے مطابق میں نے اپنے پہلے ڈرامے . . . . . .

بچہ - ممی - ممی -

نسیمہ - لو بچہ بھی اوٹھ گیا . . . . کیا ہے بٹیا ؟

. . . . . . ابھی آتی ہوں -

بچہ - مجھے پیاس لگی ہے -

نسیمہ - ابھی آتی ہوں بٹیا . . . . . تو ہماری گڑ بڑ سے -

افضل - ہماری کیا معنی - گڑ بڑ تو صرف تم نے کی۔

نسیمہ - اچھا صاحب - میرے شور و پکار سے بچے جاگ اوٹھے ہیں۔

بچہ - ممی - جلدی آؤ -

نسیمہ - آ رہی ہوں بٹیا . . . چلیئے اوٹھئے۔

افضل - چلتا ہوں بیگم - اب چلیئے اور سونے کے سوا کیا کام باقی ہے - رہا سہا موڈ تو جاتا رہا . . .

. . . . چلو . . . . . ان کاغذوں کو جما کر آتا ہوں -

(کاغذوں کے جمانے کی آواز - نسیمہ کے پیروں کی چاپ)

نسیمہ ۔ بس ...... اور پیو گے ۔

بچّہ ۔ نہیں ممی بس ۔

نسیمہ ۔ اچھا اب سوجاؤ ۔

(بچے تھپکنے کی آواز اور افضل کے پیروں کی چاپ)

آ گئے آپ ......

افضل ۔ کیا اب بھی یقین نہیں آتا ۔

نسیمہ ۔ ہیئں ۔ آہستہ آہستہ ۔ بچے جاگ اُٹھیں گے ۔

افضل ۔ بہت اچھا ۔

نسیمہ ۔ کیا خفا ہو گئے آپ

افضل ۔ نہیں بھئی بھلا تمھاری باتوں سے میں خفا ہوتا ہوں ۔

نسیمہ ۔ اچھا سناؤ کیا قصہ لکھ رہے تھے ۔

افضل ۔ اب تمھیں اس سے کیا کام ؟

نسیمہ ۔ پھر تو آپ واقعی خفا ہو گئے ہیں معاف کرنا غلطی ہوئی ۔

افضل ۔ نہیں نہیں وہ تو ایک بیکار سی چیز ہے ۔

نسیمہ ۔ بیکار سی ہرگز نہیں آپ کا لکھا اور بیکار ۔ غلط بات ۔ مجھے اختلاف تو صرف ......

افضل ۔ بیگم خدا کے لئے اس قصہ کو پھر سے نہ چھیڑو ۔

نسیمہ ۔ اچھا تو پھر بتلاؤ کیا لکھ رہے تھے ۔

افضل ۔ کہا ، ناٹ را ما لکھ رہا تھا ۔

نسیمہ ۔ اچھا ۔ کیا نام ہے اس کا ۔

افضل ۔ بڑا ہی پیارا نام ہے اس کا نسیمہ

نسیمہ ۔ خود ہی مزے لیتے رہو گے یا کچھ سناؤ گے بھی !

افضل ۔ بتاؤں اس کا نام ..... اس کا نام ہے نسیمہ!

نسیمہ ۔ (ہنس کر) ارے یہ میرا نام کیوں لکھدیا ۔

افضل ۔ نہ صرف نام بلکہ اس میں قصہ بھی ہم دونوں ہی کا ہے ۔

نسیمہ ۔ کیا مطلب ؟

افضل ۔ بات یہ ہے کہ میں نے سوچا ۔ جگ بیتیاں تو بہت ہی لکھ ڈالیں اب آپ بیتی لکھنی چاہئے ۔

نسیمہ ۔ خوب ۔ تو کیا کیا باتیں لکھیں اس میں ۔

افضل ۔ لکھتا کیا ۔ سارا پلاٹ تو جما جمایا تھا ۔ اپنی شادی سے پہلے کے رنگین حالات ، اپنی لندن کی پہلی ملاقات ..... وہاں کی دلچسپ اور نہ بھولی جانے والی محبتیں ..... بہر حال ہوتے ہواتے اس کے بعد شادی ۔

نسیمہ ۔ (ہنستی ہوئی) اور پھر اس کے بعد ان سب بچوں کی چیاؤں میاؤں ۔

افضل ۔ بیگم ۔ جہاں ارمان ختم ہوا ۔ وہیں قصہ بھی ختم ہوا ۔

نسیمہ ۔ ہوں ۔ تو گویا اب ہماری زندگی کا ارمان ختم ہو چکا ۔

افضل ۔ یہ تو واقعہ ہے نا بیگم ۔

نسیمہ۔ تو گویا وہ زندگی ایک ارمان تھی ——
اور یہ زندگی . . . . . . یہ زندگی شاید ایک (ہنس کر)
طوفان ہے۔

میاں صاحب۔ آپ کا ڈراما بالکل نامکمل ہے۔

افضل۔ کیوں۔

نسیمہ۔ اسلئے کہ جسے آپ ارمان سمجھ رہے ہیں
وہ تو گڑیا کا کھیل تھا۔ زندگی کا زبردست ارمان تو
شادی کے بعد شروع ہوتا ہے اور یہ چیاؤں میاؤں
اس ڈراما کا اوج (   ) ہے۔

افضل۔ یہ تو نقطۂ نظر کا فرق ہے . . . . . .
میں نے زندگی کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی اور
اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح سے ڈراما بہت
طویل ہو جاتا تھا . . . . . . مگر سچ کہتا ہوں بیگم۔
تم اسے دیکھوگی تو بس پھڑک اٹھوگی۔ اس میں تم اپنے
آپ چلتا پھرتا، بولتا ہوا پاؤگی لیکن . . . .
لڑتا جھگڑتا نہیں۔

نسیمہ۔ (ہنس کر) شکریہ۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ
یہ کس رسالے کے لئے لکھا جا رہا ہے۔

افضل۔ رسالے کے لئے نہیں۔

نسیمہ۔ تو پھر شائد اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے
اسٹیج کیا جائیگا۔

افضل۔ نہیں یہ بات بھی نہیں۔

نسیمہ۔ پھر؟

افضل۔ یہ ڈراما ایک فلم کمپنی کے لئے لکھ رہا ہوں۔

نسیمہ۔ اچھا۔ یہ نیا جنون کب سے سوار ہوا۔

افضل۔ دیکھئے بیگم پھر تم نے وہی قصہ چھیڑ دیا۔
ارے ایک فلم کمپنی نے مجھ سے ڈراما لکھنے کی خواہش کی۔
اور لکھا ہے کہ کافی معاوضہ دیا جائے گا۔

نسیمہ۔ اوہو۔ فلم کمپنی والے معاوضہ بھی دیتے
ہیں۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ وہ بھی ادھر ادھر سے مانگ کر
کچھ جمع کر لیتے ہیں۔ اچھا یہ بات ہمیں پہلے کیوں نہ بتلائی۔
خیر ہمیں بھی اس میں سے کچھ دوگے۔

افضل۔ کچھ۔ کچھ کیا معنی۔ سب کچھ تمھارا ہے جب
تم میری ہو تو میری کونسی چیز تمھاری نہیں۔

نسیمہ۔ پھر شروع ہو گیا ارمان۔ یہ زندگی تو . .
. . . . ارمان سے خالی تھی نا۔

افضل۔ بیگم۔ تمھاری بھی باتیں تو دل میں اترتی
ہیں۔ اجی یہ کیا پہلے ڈراما کا بھی سارا معاوضہ تم ہی
لے لو۔

نسیمہ۔ اچھا تو پہلا ڈراما بھی فلم کمپنی کے لئے لکھا
گیا ہے اور معاوضہ بھی مل چکا ہے۔

افضل۔ ملا تو نہیں۔ مل جائے گا۔ میں نے تو
ہزار کے لئے لکھا ہے۔

نسیمہ۔ ہزار کے لئے۔ مجھے تو ہندستانی فلموں
کی کہانیاں ہزار روپیے دام کی تو معلوم نہیں ہوتیں۔

افضل۔ نہیں بیگم۔ مجھے یقین ہے کہ ہزار روپیہ

معاوضہ مل ہی جائے گا، صرف خط کا انتظار ہے۔

نسیمہ۔ ارے اچھا یاد آیا۔خیر صبح دیکھ لینا۔

افضل۔ کیا ہے کیا کوئی خط آیا ہے؟

نسیمہ۔ ہاں صبح آپکے جانے کے بعد ایک خط آیا تھا۔ نہ معلوم کہاں سے آیا ہے۔

افضل۔ یقیناً اسی فلم کمپنی سے آیا ہوگا۔ لاؤ اسے ذرا دیکھ لوں۔

نسیمہ۔ اجی سو بھی رہو۔ جلدی کیا پڑی ہے۔ صبح دیکھ لینا۔

افضل۔ نہیں میں ایک منٹ میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔ فلم کمپنی والے خط وکتابت میں بڑے تیز ہوتے ہیں۔ بتاؤ کہاں رکھا ہے خط۔ ممکن ہے تمھیں بھی خوشخبری دے سکوں۔

نسیمہ۔ اچھا تو جائیے میرے سنگاردان پر رکھا ہوا ہے وہ خط۔

(قدموں کی چاپ۔ خط کو چاک کرنے کی آواز)

افضل۔ (آہستہ آہستہ اور رکتے ہوئے) آپ کا ڈراما بہت اچھا ہے۔ بڑی عمدگی سے لکھا گیا ہے ہماری ضروریات کے عین مطابق ہے۔ ہم نے مکالمے اپنے اداکاروں میں تقسیم بھی کر دئے ہیں۔ معاوضہ کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ بھلا ہم آپکے احسان کا کیا معاوضہ دے سکتے ہیں یہ تو آپ جیسے بلند پایہ ادیبوں کی مہربانی ہے کہ ہمارے لئے کچھ لکھ دیتے ہیں۔ آپنے اس کا ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا ہے بھلا ہم اس بار کو برداشت کرنے کے کہاں قابل ہیں ہم تو اسٹوری کے لئے صرف پچیس روپئے معاوضہ دیتے ہیں آپ کی خدمت میں اس کا دوچند یعنی پچاس روپیہ گذراننے تیار ہیں قبول ہو تو بذریعہ تار مطلع فرمائیے ....

ہمیں پوری توقع ہے کہ آپ اسے ضرور قبول فرمالیں گے۔

پچاس روپے ..... بدتمیز ......

انہیں آدمی کی حیثیت کا بھی خیال نہیں ہوتا ...... کام کی نوعیت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے ..... اتنے اہم کام کا معاوضہ پچاس روپیہ .... اس بدتمیز کو لکھتے ہوئے بھی شرم نہ آئی ..... ڈراما کیلئے پچاس روپیے ...... خود لاکھوں روپیے کمائیں گے اور مصنف کو دیں گے پچاس روپیے۔ میں کل ہی اس کو تار کردوں گا کہ فوراً ڈراما واپس کر دیا جائے ..... واقعی بیگم سچ کہتی تھیں کہ ہم لوگوں نے مفت لکھ لکھ کر ان لوگوں کا دماغ خراب کر دیا۔ اور اپنا وقار بھی گرالیا ــــــ میں اس بے عزتی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا ...... بدتمیز کہیں کے۔

(یہ کہکر وہ خط چاک کر دیتا ہے)

نسیمہ۔ کیا گڑبڑ ہے۔ ہزار روپیے کی اتنی خوشی۔

افضل۔ خوشی ہزار روپیے۔ بدتمیز

(زور سے چلاتا ہوا آتا ہے)

نسیمہ نسیمہ تم نے ابھی ابھی جو کچھ کہا وہ سچ ہے

یہ لوگ ہماری محنت کی قدر نہیں کرسکتے۔ جب قدر نہیں کرسکتے تو ایسے نا اہلوں کے ساتھ نیکی کرنا گناہ ہے

...... گناہ عظیم۔

نسیمہ۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔

افضل۔ لکھتا ہے ڈراما کا معاوضہ پچاس روپیے۔

نسیمہ۔ چلو اچھا ہے۔ کچھ نہیں سے تو پچاس روپیہ بہتر ہے نا۔

افضل۔ ہرگز نہیں۔ اس میں میری توہین ہے میں یہ ذلت ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ ڈراما کو جلا دوں گا۔ لیکن اسے پچاس روپیے معاوضہ پر تو نہ بیچوں گا۔ بدتمیز نالائق۔

نسیمہ۔ اتنے غصہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ کیا مضائقہ ہے یہ آپ کا پہلا تجربہ ہے۔ آئندہ احتیاط کیجیے۔

(بچہ روتے ہوئے اٹھتا ہے)

آئی۔ آئی ۔ دلگیر ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ بات پچیس سے پچاس تک تو پہنچ گئی۔

بچہ۔ ممی ممی۔

نسیمہ۔ ہاں بٹیا خدا کیلئے سو رہیئے۔ بچے اوٹھنے لگے ہیں۔ کہیں یہ سب اوٹھ بیٹھیں تو پھر یہیں ڈراما شروع نہ ہو جائے۔

(حیدرآباد سے نشر ہوا۔)

غزل

جناب میر عابد علی صاحب سعید

آئیں کیوں ہچکیاں نہیں معلوم
کون ہے مہرباں نہیں معلوم

جا رہا ہوں غبار کے پیچھے!
ہے کہاں کارواں نہیں معلوم

خود بخود جھک گئی جبینِ شوق
کس کا تھا آستاں نہیں معلوم

لے رہے ہیں وہ امتحانِ وفا
حاصلِ امتحاں نہیں معلوم

سُن کے سکتے میں ہیں مرا قصۂ غم!
کس کی ہے داستاں نہیں معلوم

اتنا واقف ہوں برق چمکی تھی
کیا ہوا آشیاں نہیں معلوم

بیخودی میں بڑھا رہا ہوں قدم
جا رہا ہوں کہاں نہیں معلوم

کہتے کہتے فسانۂ غم کا سعید
رک گئی کیوں زباں نہیں معلوم

ایک تھا شوہر!

جناب ناکارہ صاحب (حیدرآبادی)

"تعجب ہے کہ آپ نے اپنے لئے "ناکارہ" نام کیوں پسند کیا، حالانکہ تجربہ شاہد ہے کہ آپ 'ہرکارہ' ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ مضامین کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ذیل کا مضمون آپ کی کئی شب بیداریوں کی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ پڑھئے کہ "ایک تھا شوہر" اور فرمائیے کہ ایک غریب شوہر کیا کرے؟" بسمل

مشتاق ڈاکٹر فاروقی کے بنگلہ کے احاطہ میں داخل ہوا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ورانڈے میں پہنچا۔ اس کے لب ہل رہے تھے لیکن اس کی گفتگو بے آواز تھی وہ ایک خاموش فلم کا اداکار معلوم ہو رہا تھا۔ ملازم نے اطلاع کی اور ڈاکٹر فاروقی پروفیسر فلسفہ باہر آئے۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے پر سلامتی بھیجی اور ڈاکٹر صاحب مشتاق کو لے کر ڈرائینگ روم میں گئے۔

فاروقی نے پوچھا "کیوں بھئی، مشتاق۔ میری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کر رہے ہو نا؟" مشتاق نے جواب دیا "ہاں فاروقی۔ عمل کر رہا ہوں" فاروقی نے پوچھا "کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے؟" جواب ملا "ہاں فرق محسوس تو ہو رہا ہے۔ یار نسخہ مجرب معلوم ہوتا ہے" فاروقی نے مسکرا کر کہا "ہاں ہاں۔ آزمایا ہوا ہے۔ مگر یہ تو کہو۔ تمہاری بیوی کے کان میں اس کی بھنک تو نہیں پڑ گئی؟" مشتاق نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ شہر بانو کو اس کی کانوں کان خبر نہیں" فاروقی نے از راہ پسندیدگی سر ہلا کر کہا "تمہیں یہ عمل شروع کئے ہوئے شاید دس بارہ روز ہوئے ہیں۔ اچھا۔ ذرا میں دیکھوں، تم کس طرح عمل پڑھتے ہو۔؟"

یہ سن کر مشتاق اٹھا، اور ٹہلنا شروع کیا، اور ٹہلتے ٹہلتے کہنے لگا "میں اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا۔ میں اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا" کبھی ہاتھ زور زور سے ہلاتا۔ کبھی مٹھیاں بند کرتا اور کھولتا۔ کبھی بلند آواز سے، کبھی دبی زبان سے وہ فقرہ دھرائے جا رہا تھا۔ گویا کوئی طالبعلم سبق رٹ رہا ہو۔ آواز کے اتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کی حرکت سے ایک عجیب ڈرامائی سماں پیش نظر تھا۔ اور ڈاکٹر فاروقی غور سے اسے دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے اور جب مشتاق اختتامی تان کے طور پر زور سے "میں اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا آ آ آ" کہکر صوفے پر بیٹھا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے

قہقہہ لگاکر تالی بجائی اور کہنے لگے "شاباش شاباش! بہت خوب، بہت کامیاب! تم ہونہار شوہر ہو، اپنا مقصد بہت جلد حاصل کرلوگے" مشتاق پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "ہاں فاروقی۔ خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ میں بھی اب اپنے اندر خود اعتمادی محسوس کرنے لگا ہوں۔"

بات یہ تھی کہ مسٹر مشتاق تھے فدوی قسم کے شوہر، بیوی سے ڈرتے، دبتے، دبکتے تھے۔ پہلے تو اس نیاز مندانہ کیفیت کو تہذیب و روشن خیالی پر محمول کرتے رہے۔ دل کو یہ کہکر مناتے رہے۔ کیا مضائقہ ہے؟ یہ بھی ایک فیشن ہے مگر جب انگلیاں اٹھنے لگیں اور دوست احباب کے جگر خراش طعنے سننے میں آنے لگے تو ذرا چونکتے ہوئے سوچنے لگے بات بہت آگے بڑھگئی ہے۔ خیر الامور اوسطہا۔ لیکن بیوی سے ڈرنا تو ایک ایسا امر ہے کہ اس کا اوسط بھی ایک شر سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ بیوی کے رعب داب، اثر و اقتدار کے مقابلہ میں غیر محسوس طور پر ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ مگر بات ان کے بس کی نہ تھی۔ کمزوری فطری تھی۔ سوائے اس کے کہ پسینہ پسینہ ہوا کرتا، تھوک نگل نگل کر، یا اگر ذرا مبالغہ کی اجازت ہے، خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جائیں۔ کچھ اور ان سے نہ بن پڑا۔ ویسے بھی ان کی بیوی شہربانو بہت خوبصورت عورت تھی، خصوصاً اس کی بڑی بڑی جادو بھری آنکھیں تو ایسی تھیں کہ نظریں چار کرنا ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ رعب حسن ان پر روز اول ہی سے چھا گیا تھا۔ روز اوّل ہی وہ نفسیاتی لمحہ ہوتا ہے جب کہ شوہر یا بیوی کی جیت یا ہار کا آخری فیصلہ ہوجاتا ہے۔

غرض کہ مسٹر مشتاق نے [illegible] ہستی اور الادستی کو منوانے کے سب جتن چپکے ہی چپکے کر ڈالے۔ مگر برا ہو اس ازلی کمزوری کا کہ وہ غالب ہی ر[illegible] اد دوران میں شہربانو کو احساس تک نہ ہوا کہ اس کے آقائے مجازی کیسے سخت انقلابی دَور سے گذر رہے ہیں۔ وہ بدستور محبت اور حکومت دونوں کرتی چلی گئی۔

بالآخر ذکی الحس اور رقیق القلب شوہر نے پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنے دوست ڈاکٹر فاروقی سے رجوع کیا جو فلسفہ کے پروفیسر ہیں اور نفسیات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مشتاق نے رازداری کا حلف لے کر اپنی رام کہانی سنائی اور مشورہ طلب کیا، ڈاکٹر صاحب ہیں منچلے آدمی۔ مشتاق کی نفسی کیفیت انھیں بہت دلچسپ معلوم ہوئی اور انھوں نے ایک تجربہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ انھوں نے مشتاق کو یہ وظیفہ بتایا، کہ تنہائی میں کبھی زیر لب، کبھی سرگوشی کے انداز میں اور کبھی زور سے یہ فقرہ دھراتا رہے، "میں اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا"۔ گویا یہ خودی کے احساس کو جگانے کے لئے ایک نعرہ تھا۔ چونکہ یہ نسخہ کم خرچ بالانشین معلوم ہوا اور کسی بڑی قربانی کا طالب نہ تھا، اس لئے مشتاق راضی ہوگیا ——— اور اس طرح یہ نفسیاتی علاج شروع ہوا۔

فاروقی نے تاکید کر دی تھی کہ مشتاق تا حکم ثانی شوہر بانو کی نسبت اپنا فرماں برداری کا رویہ مطلق نہ بدلے۔ نیز وقتاً فوقتاً علاج کے اثرات کے متعلق خبر کرتا رہے فاروقی نے سوچ رکھا تھا کہ دوا کو زود اثر بنانے کی غرض سے اس ورد و ذظیفہ کے علاوہ کچھ اور چیز بھی چاہیئے۔ چنانچہ آج ہی انھوں نے اپنی زندہ دل اور جان چھڑکنے والی وہی فخر النساء جس کو تمام واقعات سے باخبر رکھا گیا تھا، کہا تھا کہ "اب کی دفعہ مشتاق آئے تو ایک ڈراما اس کے سامنے پیش کرنا پڑے گا" اور فخر النساء نے ہنس کر پوچھا تھا "کونسا ڈراما؟" اور فاروقی نے کہا تھا "میاں بیوی کے جھگڑے کا ڈراما" بیچارے مشتاق کو کبھی بیوی سے جھگڑنے کی ہمت یا توفیق تو ہوئی نہیں۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ لڑائی کر کے کس طرح شوہر کو اپنی فوقیت و برتری جتانی چاہیئے اور بیوی کو مغلوب کرنا چاہیئے۔ جب تک ہم اسے سبق نہ سکھائیں۔ ایک نمونہ اس کے سامنے پیش نہ کریں میرے علاج کا فائدہ آدھا رہ جائے گا۔" اور فخر النساء نے مسکرا کر کہا تھا۔ "تو یوں کہئے مشتاق صاحب کی خاطر مجھے آپ سے جھوٹ موٹ لڑنا پڑے گا۔ اچھی بات ہے"

چنانچہ ادھر مشتاق اپنا "شو" ختم کر کے صوفہ پر بیٹھا اور ادھر فخر النساء جو پردے کے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی، ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ مشتاق اور بانو کی خیر و عافیت پوچھی۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں فاروقی نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "فخر النساء!" فخر النساء سمجھ گئی، گھنٹی بجگئی ہے۔ پردہ اٹھا چاہتا ہے۔ اداکاری کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ اس نے مساوی پُر زور انداز میں کہا "کہیئے، کیا کہنا ہے۔ فاروقی نے غصہ کی علامات چہرے پر طاری کر کے کہا "میں نے تم سے کہہ دیا تھا، آج سینما نہ جاؤ۔ مگر تم کو میری بات کی پروا نہیں۔ اور اب میں دیکھ رہا ہوں۔ تم نے سینما جانے کے لئے کپڑے بدل لئے ہیں" فخر النساء نے کہا "واہ! میں نے اپنی سہیلیوں سے وعدہ کر لیا ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو ضد کیوں ہوگئی ہے؟" فاروقی نے تیز ہو کر کہا "ضد مجھے ہوئی ہے یا تمھیں، تمھیں تو عدول حکمی میں مزا آتا ہے" فخر النساء منہ پھلا کر کہنے لگی "آپ احکام نادری صادر کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں بھلا ان کو کیوں مانوں؟ اور نہیں تو کیا؟"

مشتاق کو بے چینی ہونے لگی۔ اسے سان و گمان نہ تھا کہ اچانک اسے ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے ایسے "سین" کا شاہد عینی بننا پڑے گا۔ اسے اپنا پوزیشن بے ڈھب نظر آنے لگا۔ مگر وہ خود کو تحلیل بھی نہ کر سکتا تھا۔ البتہ وہ اپنی فطری کمزوری یعنی نرم دلی سے مجبور ہو کر فاروقی کو صلح جویانہ رویہ اختیار کرنے کی صلاح دینے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے کہنے لگا "بھئی فاروقی۔ جانے بھی دو۔ کیا حرج ہے اگر بھابی سینما چلی جائیں"۔ فاروقی پلٹ پڑا اور ایک تجربہ کار اداکار کی طرح بولا "تم چپ رہو مشتاق۔ میں تم سا بودا شوہر نہیں ہوں کہ ہر بات میں بیوی کو طرح دے جاؤں۔ تم اپنی بیوی کو سر پر بٹھالو۔ مگر میں اس کا روادار نہیں۔ جانتا ہوں کہ کب بیوی کو ٹوکا جائے" اس سرزنش پر مشتاق کا چہرہ سرخ ہو گیا

اور وہ بڑی خوبی سے بہلا کر خاموش ہو گئی ۔

فخر النساء کہہ رہی تھی " لو اور سنو ، آپ کو تو بس ہمیشہ ٹوکتے رہنا ہی آتا ہے ۔ یہی تو مردانگی ہے نا ۔ ہونھ ! عورت کمزور ہوتی ہے ۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ، بس یہ ایک ایسا گر ہے کہ ـــــ کہ ـــــ " فاروقی نے جلدی سے بات کاٹکر کہا " بیوی نافرمانی کرے تو شوہر کو غصہ آتا ہے ۔ یہ فطری بات ہے ۔ تم نے آج ایسی نامعقول روش اختیار کرکے مجھے غصہ دلادیا مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی " فخر النساء بولی " اور مجھے آپ سے توقع نہ تھی کہ اتنی ذراسی بات پر مجھے سخت سست کہنے لگیں گے ۔ جانے آج آپ کو کیا ہو گیا ہے " ؟ فاروقی نے گرج کر کہا " دیکھو فخر النساء مجھے زیادہ غصہ نہ دلاؤ ۔ صبر و تحمل کی ایک حد ہوتی ہے ۔ آج تک تمھاری ناز برداری کرتا رہا ۔ تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہی ہیں کہ میری خواہش ، میرا حکم کوئی چیز نہیں " ۔

مشتاق پہلو بدل رہا تھا ۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے ۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے ، بھاگ جائے ؟ مدافعت کی پہلی کوشش پر ایسی جھڑکی کھائی تھی کہ دوسری کوشش کی ہمت نہ پڑتی تھی ۔ ایک صلح پسند شوہر کیلئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا ۔ بہرحال اس نے زور سے کھانسنے پر اکتفا کی کہ شاید اب بھی ایک غیر شخص کی موجودگی کو محسوس کرکے فریقین التوائے جنگ پر آمادہ ہو جائیں ۔

مگر ظاہر ہے کہ گولا باری بند کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا ۔ فاروقی کہہ رہا تھا " عورتیں بس حق کا نام جانتی ہیں فرض کا انہیں احساس نہیں ۔ مرنجان مرنج شوہر مل جائیں تو اس کی شرافت و نیکی سے فائدہ اٹھانے لگتی ہیں یہ عورتیں اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہتی ہیں مگر شوہر کی رضا جوئی اور دلجوئی سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ۔ شوہر ایثار پیشہ ہوتا ہے مگر بیوی اپنی خواہشات کے مقابلہ میں اس کو خاطر میں نہیں لاتی ، اس پر بھروسہ نہیں کرتی ، اس کی وسیع النظری کو بھی تنگ نظری سمجھتی ہے ۔ شوہر کتنی ہی قربانیاں کرکے اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے ، اس کی تشفی نہیں ہوتی ۔ شوہر کی نرم دلی کو وہ اپنا ایک بڑا ہتھیار سمجھتی ہے " فاروقی اس مقرر کی طرح بولتا چلا جا رہا تھا ، جسے کامل احساس ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا بیشتر حصہ درست نہیں ۔

اب مشتاق مسحور ہو کر فاروقی کی تقریر دلپذیر سن رہا تھا ۔ اس کو فاروقی پر رشک آ رہا تھا ۔ کیا جرات و دلیری ہے ! جو بات دل میں ہے وہ اپنی بیوی کے سامنے زبان پر لا سکتا ہے ! کردار کی اسی قوت کے لئے تو وہ ترستا رہتا ہے ۔ فاروقی کی قدر و منزلت اس کی نظروں میں سو فیصدی بڑھ گئی ۔ مشتاق نے اپنی بیوی کی ہم جنس فخر النساء کو دیکھا ، وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھکر ایسی آواز نکال رہی تھی کہ دیکھنے والا سمجھے ۔ بیچاری رو رہی ہے ۔ کبھی کبھی مشتاق کے دل میں یہ خواہش بڑے زور سے پیدا ہوتی تھی کہ وہ شہر بانو پر خفا ہو ، اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ۔ مگر بانو کے دل کے آبگینہ کو ٹھیس لگانے کی اس کو

ہمت نہ ہوتی تھی۔ اب فخر النسا کو روتا دیکھکر اس پر ایک انکشاف ہوا کہ محبت کرنے والا شوہر اگر دل کا مضبوط ہو تو بعض وقت اپنی بیوی کو رُلا بھی سکتا ہے۔ اور سب سے عجیب بات تو یہ تھی، کہ ایک عورت کے آنسو دیکھکر خلافِ دستور آج مشتاق پر رقت طاری نہ ہوئی اور اس کا دل کسی قسم کے احساس ہمدردی سے عاری تھا۔

"گمان گھول کر سُن لو۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا" یہ الٹی میٹم دیکر فاروقی بڑے ڈرامائی انداز میں کمرے سے نکل گیا۔ فخر النسا آنکھیں پونچھ کر اوٹھی۔ مشتاق غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ فخر النساء نے اس کی طرف معنوم مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ مشتاق نے کچھ نہ کچھ کہنے کی خاطر محض رسماً کہنا شروع کیا "بھابی مجھے افسوس ہے کہ ——" فخر النسا بات کاٹ کر کہنے لگی" نہیں نہیں، افسوس کی کوئی بات نہیں۔ بھائی جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ آپ نہیں سمجھتے۔ محبت کے پرسکون سمندر میں ایسے طوفان کبھی کبھی آتے رہنے چاہئیں۔ ایسی ہر لڑائی کے بعد میں ان سے اور زیادہ محبت کرنے لگتی ہوں۔ عورت کا خمیر ہی کچھ طرح ——"

مگر مشتاق جا چکا تھا۔ عورت کے خمیر اور ضمیر کے متعلق اس کی معلومات میں کافی سے زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ فاروقی کی بصیرت افروز تقریر نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ فاروقی احاطہ میں ٹہلتا نظر آیا۔ مشتاق تیز تیز قدم اٹھا کر اس کے پاس گیا۔ فاروقی نے دیکھا، اس کا چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ ہاتھ ملایا تو اس کے ہاتھ پسیجے ہوئے تھے۔ فاروقی نے نتیجہ نکال لیا۔ مشتاق پر ردعمل خاطر خواہ ہوا ہے۔ وہ بڑے جوش کی حالت میں ہے۔ مشتاق نے ہاتھ دبا کر کہا "فاروقی۔ اب میں چلتا ہوں۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔ آج ہی بانو کو معلوم ہو جائے گا کہ گھر کا آقا میں ہوں۔ خدا حافظ"!

فاروقی مسکراتے ہوئے اس کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"میں بیوی سے نہیں ڈرتا" کا وِرد کرتے ہوئے گھر پہنچا اور کسی قدر درشت لہجہ میں ملازم سے پوچھا "بانو کہاں ہیں؟"

معلوم ہوا، اپنے کمرہ میں ہیں۔ باہر جانے کی تیاری میں ہیں۔ ملازم کو حکم ملا "جا کر ان سے کہہ، میں ڈرائینگ روم میں ان سے ملنا چاہتا ہوں" بانو سوچتی ہوئی آئی، "یہ انٹرویو" کے لئے کیوں بلایا جا رہا ہے؟ غیر معمولی بات ہے۔ وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، مسکراہٹ جس کے آگے مشتاق بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس نے ایک نظر اس دلکش چہرہ پر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کہاں جا رہی ہیں؟" جواب ملا "انجمن آرا کے ہاں ٹی پارٹی ہے" شوہر بولے "آپ نہ جائیں تو بہتر" بیوی کی زبان سے نکلا "مگر میں نے وعدہ کر لیا ہے" کہنے لگے مگر اس سے پہلے انھیں تھوک نگلنا پڑا، "میری خاطر سے وعدہ توڑا جا سکتا ہے" بانو نے کہا " واہ! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں!" نظریں چار کرنے سے بچ کر کہنے لگے "بات سیدھی سادی ہے" بانو حیرت زدہ ہو کر بولی "یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ گھبراہٹ کو

پاس پھٹکنے کا موقع نہ دینے کی غرض سے ٹہلنے لگے اور بولے "ہوا ہوا یا کچھ نہیں۔ تم ـــــ تم ـــــ ضد تو تمہیں ہو گئی ہے۔"
بانو کی آنکھوں میں بجلی سی چمکی۔ تم ! آج وہ پہلی بار آپ کی بجائے تم کہہ رہے تھے۔ ضبط کرکے اوس نے پوچھا۔ "آپ کا مزاج کیسا ہے؟" بولے "تمہیں آواز کو بے قابو نہ ہونے دینے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ بس میں نے ایک بار کہہ دیا تم نہیں جا سکتیں" یہ کہکر پسینہ پونچھنے لگے اور دل میں دعائیں مانگنے لگے۔ خدایا ! یہ ہمت مردانہ ایسا نہ ہو، جواب دے جائے۔ بانو نے آواز بلند کرکے کہا "مگر مجھے جانا ہی پڑے گا۔ آپ نہیں سمجھتے" کھنکار کر فرمانے لگے "میں سب سمجھتا ہوں۔ میں ـــــ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ بیوی کو ہر بات میں طرح دئے جانا ـــــ یعنی یہ کہ میں اس کا ـــــ اس کا روادار نہیں۔ اور ـــــ اور آج تک ناز برداریاں کرتا رہا تو ـــــ تو ـــــ بہرحال یہ کہ میری خواہش، میرا حکم بھی کوئی چیز ہے" بانو کے منھ سے نکلا۔ "اوہ!" سلسلۂ کلام رکنے میں خطرہ تھا۔ چنانچہ مسٹر مشتاق خود اپنے اس اچھے حافظہ پر حیرت کرتے ہوئے بولتے چلے گئے "بیوی کی نافرمانی پر شوہر ـــــ شوہر غصہ میں آتا ہے۔ فطرت یہی ہے ـــــ تم ـــــ تم ـــــ تم نے میرا کہا نہ مان کر غصہ ـــــ غصہ دلا دیا ـــــ میں ـــــ میں مرنجان مرنج نہیں ہوں ـــــ کمزوری ـــــ یعنی یعنی نیک دلی ـــــ اس سے عورتیں بہت فائدہ اٹھاتی ہیں۔ رضا و رغبت اور ـــــ اور ـــــ یعنی رضاجوئی شوہر کی کوئی چیز نہیں۔ ایثار و قربانی کا کیا ـــــ کیا یہی صلہ ہے؟ فرض سکھیں ـــــ حق ـــــ حق بھول جائیں۔"

یہ الفاظ چیخ کی شکل میں نکل رہے تھے پیچھے پیچھے مشتاق صاحب صوفہ پر بیٹھ گئے کیونکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ بانو حیرت، غصہ اور رحم کی ملی جلی نظروں سے ان کو تک رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بزرگوں اور بیوی کے سامنے دھیمی آواز سے بولنے کے عادی صاحب، آج کیا بات ہے، ایک پبلک مقرر کی طرح چیخ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی، کیا اس بات میں واقعی کوئی صداقت ہے کہ روشن خیال سے روشن خیال شوہر بھی ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی داخلی یا خارجی تحریک پر اپنی قابل تحسین معقول پسندی کو بالائے طاق رکھکر باغی بن جاتا ہے؟ کیا اب انھیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟

شوہر نامدار کہہ رہے تھے "میں تم سے نہیں ڈرتا ـــــ میں ـــــ میں ـــــ تم سے نہیں ڈرتا ـــــ میں کسی سے نہیں ڈرتا ـــــ میں ـــــ میں اب وہ نہیں رہا۔ میں نے کا ـــــ کا ـــــ کامیابی کا گر پا لیا ہے۔ میں ـــــ میں ـــــ مجھے معلوم ہو گیا؟ شوہر اپنے ہی ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں نے ـــــ میں نے ـــــ" یکدم سے رک گئے۔ "آنکھوں کا ذکر کرتے ہی وہ حیرت سے سوچنے لگے۔ میں نے تو غیظ و غضب کا شاندار مظاہرہ کیا، مگر ابھی تک بانو کی آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آئے۔ فرمانسلنے کہا تھا ـــــ

بانو صوفہ پر ان کے پاس بیٹھ گئی، اور عجیب انداز سے پوچھا "آپ کی آنکھیں کھل گئی ہیں؟" پھر کہنے لگی۔ اچھی بات ہے۔ ادھر دیکھئے۔ میری طرف دیکھئے۔" ہاتھ سے ان کا چہرہ اپنی طرف کر کے بولی "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھئے ــــ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالئے۔" مشتاق کو اچانک ایسا محسوس ہوا کہ ان کا دل کسی نے ریفریجریٹر میں رکھ دیا ہے۔ سرد جھرجھری ان کے بدن میں اوپر سے نیچے تک دوڑ گئی۔ اس نئی زندگی پر سے ان کی گرفت یک بیک ڈھیلی ہو گئی ہے۔ لامحالہ انھیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا پڑا، اور ان ہوش ربا آنکھوں میں انھیں ایک عجیب ناقابل بیان کیفیت نظر آئی۔ سودا کی طرح وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے۔ "ــــ چلا میں!" بانو آہستہ آہستہ کہنے لگی "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جایئے۔ دیکھے جایئے ــــ مشتاق صاحب دیکھے جایئے ــــ اب سو جایئے۔ سو جایئے۔ مشتاق صاحب۔ سو جایئے (اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر) سو جایئے۔ سو جایئے۔"

مشتاق پر غنودگی طاری ہونے لگی، اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونے سے قبل آخری بات جو ان کے ذہن میں اچانک آئی وہ یہ تھی کہ بانو نے دو ایک بار کہا تھا "مجھے ہپناٹزم یعنی عمل تنویم آتا ہے۔ کالج میں میں نے ایک مسمرسٹ سے سیکھا تھا کبھی موقع آیا تو میں آپ کو دکھاؤں گی۔"

اور جب تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر فاروقی تجسس کے مارے اپنے زیر علاج مریض کی خبر لینے آئے تو ڈرائنگ روم میں انھوں نے دیکھا کہ مشتاق بانو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ فاروقی کو دیکھتے ہی مشتاق اچک کر کھڑے ہو گئے اور چیخ اوٹھے:۔

"لیجئے آ گئے وہ ذات شریف۔ تمھیں شرم بھی آتی ہے میرے گھر میں قدم رکھتے ہوئے۔ دوست نما دشمن! بد باطن! مار آستین! اسی کا نام دوستی ہے کہ میرا گھر برباد کرنے پر تل گیا۔ میری دنیا اجاڑ دینے کی فکر کی۔ بیں اپنے حال میں خوش ہوں تمھارے علاج کو دُور سے سلام! بڑا آیا ماہر نفسیات کہیں کا!"

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست ــــ تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا ــــ تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

علامہ اقبال

امرائے پائیگاہ اور اُن کے اجداد پر ایک طائرانہ نظر

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

حیدرآباد میں امرائے پائیگاہ ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی جاگیریں بعض دیسی ریاستوں کے اتنی وسیع ہیں۔ ذیل میں اس خاندان کے ابتدائی افراد کے حالات مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔

وہ کون ہے جو حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ سے واقف نہیں ہے، حضرت کی شخصیت جس طرح اپنے زمانہ میں روحانیت اور تصوف و سلوک کی مرکز تھی، اسی طرح آج بھی آپ کی درگاہ معتقدین اور زائرین کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے، حضرت کی اولاد اگر ایک طرف تصوف اور سلوک کی تعلیم کو جاری رکھکر روحانی پیشوائی حیثیت سے دینی فرائض کو انجام دیتی رہی تو دوسری طرف دنیوی امور میں دخیل ہوکر اسلامی سلطنت کے اہم اور نازک خدمات بجالاتی رہی۔ بہاؤ الدین خان ایک ایسی ہی ہستی ہے، جو عالمگیر خلد مکان کے زمانہ میں صاحب منصب و جاہ تھی۔ شیخ فرید الدین گنج شکر کا سلسلہ نسب سلطان ابراہیم بلخ سے ملتا ہے، اور سلطان خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروق رضی کی اولاد میں تھا۔

شیخ بہاؤ الدین خان عالمگیر خلد آشیانی کے زمانہ میں سرکار (ضلع) اکبر آباد کی خدمت صدارت اور امانت خزانہ پر مامور تھے بہاؤ الدین خان کے فرزند ابو الخیر خان کو دربار مغلیہ سے محمد شاہی عہد میں "خانی" کا خطاب ملا تھا۔ خزانہ کے محافظی کی خدمت آپ کے تفویض تھی، اسی زمانہ میں آپ کو حضرت آصفجاہ اول سے نیاز حاصل ہوا، چونکہ آصفجاہ میں جوہر شناسی کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا، ابو الخیر خاں کو جوہر قابل پاکر اپنے سے متعلق کرلیا، اور روز بروز ترقی دینے لگے، اور جلد دو ہزار پانصدی منصب اور خطاب خانی و بہادری کے ساتھ جاگیر سے سرفراز کردیا۔

حضرت آصفجاہ جب دکن کی جانب (۱۱۳۲ھ) روانہ ہوئے تو ابو الخیر خان بہادر بھی ہمراہ رکاب تھے۔ راستہ میں دلاور علی خان، اور عالم علی خان سے مقابلہ ہوا، ان جنگوں میں ابو الخیر خان نے داد شجاعت اور مردانگی دیکر نام آوری حاصل کی۔ حضرت آصفجاہ کو فتح و فیروزی کے بعد جب نذرین پیش کی گئیں تو آپ نے ارشاد فرمایا پہلے ابو الخیر خان کی نذر قبول کیجائیگی کیونکہ ان ہی کی کوشش سے فتح حاصل ہوئی ہے، اب آپ کو منصب چار ہزاری مع لوازمہ علم و نقارہ سے سربلندی ہوگئی۔

جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو حضرت آصفجاہ دکن میں نواب ناصر جنگ کو اپنا قائم مقام کرکے دہلی روانہ ہوئے

اس وقت آصفجاہ نے ابو الخیر خان کو ناصر جنگ کے پاس متعین فرمایا تھا۔ لیکن بعض مفسدین کے بہکانے سے جب ناصر جنگ نے باپ سے سرکشی کی تو ابو الخیر خان علیحدگی اختیار کرکے گوشہ نشین ہوگئے، اس کے بعد حضرت آصفجاہ دہلی سے واپس ہوئے، اور ناصر جنگ معذرت کرکے باپ کے حضور میں چلے آئے، تو اس وقت آصفجاہ نے پھر سے ابو الخیر خان کو اپنے دربار میں طلب فرمالیا۔ سنہ ۱۱۵۵ھ میں ابو الخیر خان باپو نائک کی سرکوبی پر مامور ہوئے، اور آپ نے دشمن کو شکست فاش دے کر کامیابی حاصل کی اور سرخرو واپس ہوئے، اس کامیابی کے بعد سنہ ۱۱۵۹ھ میں آپ کو فوجداری بگلانہ اور صوبہ داری برہان پور پر سرفراز کیا گیا۔

نواب ناصر جنگ نے اپنے زمانہ میں آپ کو شمشیر بہادر کا خطاب مرحمت فرما کر اولاً صوبہ داری خجستہ بنیاد اور صوبہ داری برہان پور پر آپ کا تقرر کیا، نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں ابو الخیر خاں کو تیغ جنگ کا خطاب اور پالکی جھالر دار کے لوازمہ سے اعزاز بخشا گیا۔ اسی زمانہ میں جب مرہٹوں سے جنگ ہوئی تو آپ آصفی فوج کے مقدمہ الجیش تھے تیغ جنگ نے اس جنگ میں جس طرح داد شجاعت دی اور کوشش مردانہ فرمائی وہ تاریخ سے محو نہیں ہوسکتی اس جنگ کے بعد آپ کو صلابت جنگ نے بھی برہان پور کی صوبہ داری پر مامور فرمایا۔

اس کے بعد جب بالاجی مرہٹہ نے پچاس ہزار جرار کے ساتھ دکن پر حملہ آور ہوا تو تیغ جنگ نے باوجود مفلوج ہونے کے جنگ میں شرکت فرمائی اور نام آوری حاصل کی۔ اسی زمانہ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

آپ کی تاریخ وفات کے متعلق مورخوں کو اختلاف ہے۔ بقول مصنف تاریخ خورشید جاہی سنہ ۱۱۶۴ھ میں آپکا انتقال ہوا، لیکن گلزار آصفی کی صراحت کے بموجب سنہ ۱۱۶۵ھ آپ کی تاریخ وفات ہے۔ تاریخ رشید الدین خانی میں سنہ ۱۱۶۶ھ اور تزک آصفیہ میں سنہ ۱۱۶۷ھ درج ہے۔ چونکہ جاگیرات کے کاغذات کے بموجب سنہ ۱۱۶۵ھ صحیح تاریخ ہے اس لئے اسی کو درست خیال کرنا چاہیئے۔

نواب ابو الخیر خاں بہادر صاحب سیف و قلم تھے۔ آپکے تدبر اور قابلیت کا لوہا مانا جاتا تھا۔ آپ کا دسترخوان نہایت وسیع ہوتا، اپنے تمام رفقاء اور اپنے علاقہ کے منصب داروں کے ساتھ آپ خاصا تناول فرماتے، آپ کی داد و دہش مشہور تھی۔ اہل فن کے قدردان تھے۔ ان کو کافی صلہ دے کر ہمت افزائی فرماتے تھے[1]۔

نواب ابو الخیر خاں بہادر کو دو صاحبزادے تھے جن میں سے ایک ابو البرکات خان بہادر امام جنگ تو عین عالم جوانی

---

[1] حسب ذیل کتابوں سے معلومات حاصل کئے گئے ہیں:۔ گلزار آصفی[1] ۔ تزک آصفی[2] ۔ تاریخ رشید الدین خانی[3] ۔ تاریخ خورشید جاہی[4] ۔

میں عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ دوسرے ابو الفتح خان سے آپ کو آپکے والد کے زمانہ حیات میں "خانی و بہادری" کا خطاب دربار آصفی سے عطا ہوا تھا، بعد والد کے انتقال کے بعد نواب آصفجاہ ثانی نے ابو الخیر خان بہادر تیغ جنگ کے خطاب سے ممتاز فرماکر اپنے رزم و بزم میں شریک فرمایا۔

سنہ ۱۱۹۰ھ میں تیغ جنگ کو جمعیت پائیگاہ فراہم کرنے کا حکم دربار آصفی سے ملا۔ آپنے قلیل عرصہ میں ایک عمدہ فوج ترتیب دی جس میں دس ہزار سوار تھے، ہرایک گھوڑا ہزار روپیہ سے کم قیمت کا نہیں تھا۔ افسروں کی ماہوار پندرہ سو تنک تھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب کہ روپیہ کی گرانی تھی تو یہ تنخواہ کس قدر بیش قرار تھی۔ آپکی فوج میں چار بڑے افسر تھے، یعنی محمد امجد خان (امجد الملک) محمد حسام الدین خان گھانسی میاں (سردار الملک) غلام امام خان (امام الملک) عظیم خان (اعظم جنگ) رسالہ پائیگاہ گویا آصفجاہ کا باڈی گارڈ تھا، جو ہر وقت خلوت شاہی میں ساز و سامان سے آراستہ حاضر رہا کرتا، بادشاہ کے جان و مال کی حفاظت اس کا فرض منصبی تھا۔

سنہ ۱۱۹۱ھ میں تیغ جنگ کو شمس الدولہ ۱۱۹۵ھ میں شمس الملک اور ۱۲۰۲ھ میں شمس الامراء کا خطاب ملا آپ پہلے شمس الامرا ہیں۔ خطاب کے ساتھ مختلف لوازم سے بھی سرفرازی ہوتی رہی۔

مختلف موقعوں پر پائیگاہی فوج دشمنوں سے لڑنے کے لئے روانہ ہوتی رہی۔ چنانچہ اس کی مختصر صراحت بیان کی جاتی ہے۔

سنہ ۱۱۹۷ھ میں جب احتشام جنگ جاگیردار نرمل نے سرکشی کی اور قلعہ نرمل میں فساد مچایا تو اولاً جمعیت پائیگاہ سے حسام الدین خان دو ہزار سوار کے ساتھ روانہ کئے گئے۔ حسام الدین خان نے اولاً قلعہ بودھن پر حملہ کیا دشمن قلعہ میں محصور ہوگیا لیکن آپنے اس کو بہت جلد فتح کرلیا، احتشام جنگ نے حسام الدین خاں سے لڑنے کے لئے دلاور جنگ (فرانسیسی) اور ابو میاں مہدوی کے زیر کمان بارہ ہزار سوار اور اٹھارہ توپ روانہ کئے، ابو میاں نے شدید گولا باری کی۔ لیکن حسام الدین خان کی فوج نے باوجود تمام رات جاگنے کے دشمن کا مقابلہ دلاوری اور بہادری سے کیا۔ آخر فتح حاصل ہوئی۔ دلاور جنگ فرار ہوگیا، ابو میاں، امان اللہ خان وغیرہ سرداران احتشام جنگ مارے گئے۔ حسام الدین خان اور سواران پائیگاہ نے سرخروئی حاصل کی۔

حضرت آصفجاہ ثانی کو جب اس فتح کی اطلاع ہوئی تو حسام الدین خان کو سردار جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا اور ان کی امداد کیلئے ایک بڑی فوج شرف الدولہ، زور آور جنگ، حشمت جنگ اور امجد الدولہ کی سرکردگی میں روانہ فرمائی اور پھر خود بدولت بھی روانہ ہوئے۔

سردار جنگ (حسام الدین خان) بودھن سے روانہ ہوکر بالکنڈہ پہنچے یہاں سے قریب ہی احتشام جنگ کی فوج دلاور جنگ کی ماتحتی میں مقیم تھی۔ سردار جنگ نے اپنی کمک کی فوج آجانے پر دلاور جنگ سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے، تمام دن معرکہ کارزار گرم رہا۔ لیکن فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد خود اعلیٰحضرت آصفجاہ ثانی جو حیدرآباد سے بعد آ ہوچکے تھے اور راستہ میں قلعہ جگتیال فتح کرتے ہوئے بالکنڈہ تشریف لائے اور اب آصفی فوج ظفر موج جس میں کئی ایک ممتاز جاگیردار اور امراء شامل تھے۔ دریائے گوداوری عبور کرکے احتشام جنگ پر حملہ آور ہوئی، حضرت آصفجاہ کے ساتھ ہی شمس الامراء ہاتھی پر خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پائیگاہ کی فوج میمنہ اور میسرہ میں متعین تھی۔ بہت بڑی جنگ ہوئی، ہزاروں آدمی لقمہ اجل ہوئے، بالآخر احتشام جنگ کو شکست ہوئی، اور اس نے اپنی والدہ کی طرف سے عرضی لکھکر معافی چاہی۔ حضرت آصفجاہ نے عرضی ملاحظہ فرماکر ماٹرن کو پھولوں کا گہنا دے کر احتشام جنگ کے پاس روانہ کیا۔ اور احتشام جنگ دربار آصفی میں حاضر ہوکر قدمبوس ہوئے، ان کا قصور معاف ہوا، اور ظفر الدولہ کے خطاب کے ساتھ ایلچپور (برار) کی صوبہ داری سرفراز ہوئی، نرمل کی قلعہ داری برہان الدولہ کو مرحمت ہوئی، بہرحال اس جنگ میں پائیگاہ کی فوج نے نمایاں کارگذاری کی حق نمک ادا کیا، داد شجاعت دے کر ناموری حاصل کی۔

اس جنگ کے کچھ عرصہ بعد ٹیپو سلطان سے جنگ کا آغاز ہوا، اس جنگ میں بھی پائیگاہ کی فوج شامل رہی اور نمایاں کارگذاری انجام دی، قلعہ بادامی، قلعہ دھارواڑ، گجندر گدھ، نول کندہ وغیرہ پر قبضہ ہوگیا۔ اس اثناء میں ٹیپو سلطان نے دوسری طرف یعنی قلعہ ادھونی پر حملہ کیا۔ یہاں نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے بھتیجے مہابت جنگ قلعہ دار تھے۔ حضرت آصفجاہ نے ان کی امداد کے لئے اپنے بھائی ہمایوں جاہ نواب میر مغل علیخان کے زیر کمان فوج روانہ فرمائی۔ اس میں خود تیغ جنگ شمس الامراء بہادر بہ نفس نفیس اپنی فوج کے ساتھ شریک تھے، اور آپ نے مہابت جنگ کو مع اہل وعیال و متعلقین سلامتی کے ساتھ قلعہ ادھونی سے رائچور میں پہنچادیا۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان سے مختلف مقامات پر معرکے ہوئے بالآخر صلح ہوگئی۔ اس ٹیپو سلطان کے لڑائی میں بھی پائیگاہ کی فوج نے جانثاری کا کامل ثبوت دیا۔

شمس الامراء کو ان کی کارگذاریوں کے صلہ میں حضرت آصفجاہ نے دیوانی کے جلیل القدر عہدہ سے سرفراز کرنا چاہا مگر آپ نے اہل قلم بننے سے صاحب سیف رہنے کو ترجیح دی۔ آپ ہی کی کوشش سے نواب ارسطو جاہ کو قلمدان وزارت عطا ہوا۔

۲۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ کو شمس الامراء کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہؒ میں دفن کئے گئے۔ حضرت آصفجاہ کو آپ کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا، کئی روز تک کھانے پر رغبت نہیں رہی چہلم تک سیر و شکار موقوف رہا، حتیٰ کہ رنگین لباس

زیب تن نہیں فرمایا۔

شمس الامرا، ایک مرد صحیح اور دلاور تھے۔ شجاعت میں آپ کا کوئی مدمقابل نہیں تھا، صداقت شعار صداقت پسند تھے، علم و فن سے دلچسپی تھی، شعرا اور مصنفین کی سرپرستی فرماتے اور صلہ دے کر ان کی محنت و کاوش کا معاوضہ کرتے تھے۔

(باقی آئندہ)

غزل

جناب مسلم صاحب

بے مہرئ عالم کا ہے نقشا میرے دل میں　　یعنی نہیں جز خون تمنا میرے دل میں

کیوں برق کو دوں زحمت بربادئ ہستی　　روشن ہے اک احساس کا شعلہ میرے دل میں

اصنام بگڑتے بھی ہیں بنتے بھی ہیں لاکھوں　　ہوتا ہے یہی روز تماشا میرے دل میں

ہے پاس ادب مانع اظہار حقیقت　　ہاں چیر کے دیکھو کہ ہے کیا کیا میرے دل میں

میں گوشۂ عزلت میں بھی تنہا نہیں مسلم

آباد ہے جذبات کی دنیا میرے دل میں

لہ۔ شمس الامرا کے حالات حسب ذیل کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ (۱) گلزار آصفی (۲) تزک آصفی (۳) تاریخ رشید الدین خانی (۴) تاریخ خورشید جاہی (۵) نظام علی خان مولف سراج الدین طالب

عمرانیات کی علمی وسعت اور عملی اہمیت

جناب نثار احمد صاحب بلگرامی (عثمانیہ)

یوں تو تمام علوم عمرانی کی وسعت اور ان کے مباحث کی پیچیدگی مسلمہ ہے لیکن ان میں بھی عمرانیات کا دائرہ بحث معین کرنا بہت دشوار ہے معاشیات کی طرح عمرانیات کا شمار بھی "علوم جدیدہ" میں کیا جاتا ہے، جدید ہونے کی وجہ سے عمرانیات کے بعض مسائل اب بھی ایسے ہیں جن کی خاطر خواہ تحلیل اور مکمل تحقیق خود ماہرین عمرانیات سے نہ ہوسکی۔

دنیوی علوم و فنون کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جن کا تعلق مادہ' مو الید ثلاثہ' اور کائنات کی دیگر اشیا سے ہوتا ہے۔ مثلاً کیمیا، طبعیات، حیاتیات اور ریاضی وغیرہ، جن کو علمی اصطلاح میں "علوم متعارفہ" کہا جاتا ہے دوسرے وہ علوم جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے ان میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، نفسیات، قانون اور اسی قسم کے دیگر علوم شامل ہیں جن کو "علوم متعارفہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ عمرانیات بھی انہی علوم عمرانی میں شامل ہے جس کا موضوع بحث سماج ہے بہ الفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ :- "عمرانیات یا علم معاشرہ سے مراد وہ علم ہے جس میں سماج کی ابتدا، نشو و نما اور اس کی ساخت کی توجیہہ کیجاتی نیز انسان کی معاشرتی جد و جہد سے بحث کیجاتی ہے"

عصر جدید میں ہماری زندگی کا سماجی پہلو بہت ہی واضح، یقینی اور ضروری ہے۔ عمرانیات کا تعلق دیگر اجتماعی علوم سے بہت قریبی ہے، چونکہ ہماری زندگی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور نفسی پہلو ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے متعلقہ علوم یعنی سیاسیات، عمرانیات، مذہبیات اور نفسیات میں بھی لازمی طور پر باہمی ربط موجود ہوگا۔ تمدنی ترقی اور مالی مرفع الحالی کے لئے مادی دولت، موافق سیاسی حالات، بہتر کردار، اعلیٰ تعلیم اور عمدہ سماج ناگزیر ہیں۔

عمرانیات کا مطالعہ انسان کی اجتماعی زندگی کے ایک اہم جزو کا مطالعہ ہے "علوم متعارفہ" کا تعلق چونکہ اشیاء کائنات سے ہے ان کے مختلف تجربات کے بعد ایک قطعی رائے ایک اٹل نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ برخلاف اس کے "علوم غیر متعارفہ" میں حالات اور واقعیات کو ایک جا مجمع کرکے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور جو رائے قرار پاتی ہے وہ قطعی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ کسی ماہر عمرانیات کی رائے چند مخصوص حالات کی روشنی میں صحیح ہو لیکن جب صورت حال بدلجائے خیالات میں تغیر پیدا ہو جائے تو اسی کلیہ کو تسلیم کرلینا درست نہیں ہوسکتا بلکہ بالعموم صورت حال کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ نتائج میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

عمرانیین میں ایک عرصہ سے یہ اختلاف رائے چلا آ رہا ہے کہ عمرانیات آیا علم ہے یا فن؟ اس بحث کی وجہ سے دو مکاتیب خیال پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک دبستان اس کو علم بتاتا ہے اور دوسرے کے نزدیک اس کی حیثیت فن کی ہے۔ تضاد خیالات فطری خاصہ ہے ماہرین عمرانیات کی رائے خواہ کچھ ہی ہو۔ بہرحال یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جہاں تک اس علم کی حیثیت نوعی کا تعلق ہے دور ترقی کے ابتدائی مدارج میں اس کا آغاز فن ہی سے ہوا، ارتقاء تمدن کے ساتھ ساتھ عمرانی تصورات میں تغیر رونما ہوا۔ معاشرت میں سادگی باقی نہ رہی، تمدن پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا تو ضرورت اس امر کی محسوس ہوئی کہ "نفس اجتماعی" اور افراد کے باہمی تعلقات کا علمی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

جہاں تک اصول عمرانیات کا تعلق ہے ہم اسے علم کہہ سکتے ہیں لیکن جہاں اس کی عملیت کا سوال پیدا ہوا اس کو فن ہی شمار کیا جائے گا۔ دیگر "ہمجنس علوم" کی طرح عمرانیات کے بھی دو پہلو یعنی معیاری اور ایجابی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اسی کو اصطلاح میں "نظری عمرانیات" یا "عمرانیات مطلق" اور "منطبقہ عمرانیات" یا علم مرفہ الحالی کہا جاتا ہے۔ واقعات سے اصول اخذ کرنا فطری تحقیق ہے جو نظری تحقیق سماج سے متعلق ہوگی وہی عمرانیات مطلق ہے۔

عمرانیات مطلق میں معاشرہ کی ساخت اس کی نفسی خصوصیت اور سماجی ارتقاء کے مدارج سے متعلق اصول و قوانین سے بحث کی جاتی ہے۔ ان مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے جس کے تحت انسان سماجی سانچہ میں ڈھلتا ہے۔ عمرانی اصول بڑی حد تک عالمگیر حیثیت اور ہمہ گیر اثرات رکھتے ہیں۔ کچھ اساسی اصول و مسائل ایسے ہیں جن کا انطباق بسا اوقات بیشتر ممالک پر ہوتا ہے۔ تمثیل کے طور پر مسئلہ بے روزگاری، مسئلہ معیار زندگی اور عمرانی مرضیات وغیرہ۔ بعض وقت اصول کے انطباق میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے بظاہر اصول غلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہر ملک کے حالات چونکہ جداگانہ ہوتے ہیں لہٰذا کلیہ کے منطبق کرتے وقت ماحول کا لحاظ ضروری ہے۔ حیثیت نوعی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ سمجھ لیجئے کہ عمرانیات کے بنیادی اصول دنیا پر یکساں طور پر حاوی ہیں چونکہ کلیتاً اصول میں ہمیشہ معیاری رنگ غالب رہتا ہے۔

اب تک ہم عمرانیات کی علمی وسعت کو ظاہر کر رہے تھے اب ہم اس کے عملی پہلو پر روشنی ڈالیں گے جہاں تک معیار اور اصول کا تعلق ہے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا ہونا چاہئے؟ اور ایجابی اعتبار سے یہ بتلایا جاتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ عمرانیات کے نفس مضمون ہی میں اس کی اہمیت مضمر ہے چونکہ "فرد نہیں بلکہ جماعت، حکومت نہیں بلکہ سماج، مملکت نہیں بلکہ معاشرہ اجتماعی زندگی کی سب سے اہم قوت ہے" ہر ملک کے سیاسی آئین و ضوابط لازمی طور پر مقامی عمرانی ضوابط سے مطابقت کرتے ہیں۔ نظری عمرانیات کے معلوم کردہ اصولوں کو سماجی زندگی پر منطبق کر کے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہماری

عمرانی زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جاسکتا ہے کہ اس کی خرابیوں کی اصلاح کیونکر کیجا سکتی ہے۔ سماجی مرضیات کی تشخیص ، سماجی دباؤ سے متعلق تفصیلی معلومات کی فراہمی ، اور اس کے انسداد کے لئے کونسا طریق عمل اختیار کیا جانا چاہئیے جرائم کے سماجی وجوہ کو دریافت کرنا ، تعلیم کی معاشرتی خامیوں سے واقفیت حاصل کرنا اور سماج سدھار کی تحریکوں کو فروغ دینا۔ منطبقہ عمرانیات کا مقصد اور منہاج ہے اس ضمن میں بطور خاص ان اداروں کی تحقیق کیجاتی ہے جن کا واسطہ براہ راست مرفہ الحالی سے ہوتا ہے ۔

انسان فطرۃً مدنی الطبع واقع ہوا ہے یہ اس کی جبلت میں داخل ہے، کہ وہ دیگر انسانوں سے مل جل کر زندگی بسر کرے اور باہمی روابط کے ذریعہ زندگی کی بنیادوں کو تمدن پر استوار کرے تمدن کا ارتقاء اور معاشرت کا احیاء گویا "نفس اجتماعی" کی تقویت کا بین ثبوت ہے۔ اور اسی سماجی جد وجہد کی توجیہہ عمرانیات کی اہمیت کی آئینہ دار ہے۔ واضح رہے کہ "مملکت جدید" کا دار مدار معاشرہ پر اور معاشرہ کا انحصار نفس اجتماعی پر ہے۔

چونکہ بنی نوع انسان کی ابتدائی زندگی شان ونمود سے بالکل عاری تھی۔ لہذا عصر قدیم اور زمانہ وسطیٰ میں نہ تو عمرانیات کو علمی حیثیت دیگئی اور نہ لحاظ فن کے اس طرف کوئی توجہ کیگئی لیکن تمدنی اور سماجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس علم کو بھی ماہرین نے مرکز توجہ بنایا۔ جس کے بعد سہولت مطالعہ کی خاطر عمرانیات کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا جس کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں ۔

مرفہ الحالی کے زاویہ نگاہ سے عملی عمرانیات کو بہت اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ سے عمرانیاتی مسائل کی تفہیم میں سہولت ہوتی ہے۔ معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کیا جاسکتا ہے۔ نیز پیچیدہ سماجی مسائل اور دشوار متمدنی امور کو حل کیا جاسکتا ہے۔ عامیانہ طور پر معاشرتی ، تمدنی سماجی یا اصلاحی امور پر خیال آرائی کرنا آسان ہے لیکن ماہرین کے مقابلہ میں سنجیدہ اظہار خیال اسی وقت ممکن ہے جب کسی نے نہایت جانفشانی تحقیق اور جستجو سے علوم متعلقہ کا مطالعہ کیا ہو۔ اس قسم کے گہرے مطالعہ کے لئے علوم عمرانی سے واقفیت ، علم متعلقہ سے خاص واقفیت اور حسب ضرورت اس علم کے کسی شعبہ سے خصوصی واقفیت لازم اور ضروری ہے۔ مثال کے طور پر مملکت حیدر آباد میں "سماجی اصلاحی تحریک" اور "سماجی قانون سازی" کے لئے کوئی عملی اقدام اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ ملکی روایات ، مقامی حالات ، سماجی رجحانات ، تمدنی وجدانات ، مذہبی جذبات ، معاشرتی تصورات اور عمرانیاتی تاثرات کے متعلق حقائق کا ماہرانہ نقطہ نظر سے سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر نہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ ہمارے عادات واطوار ، تخیلات وتصورات ، افعال و افکار ، فعلیت وذہنیت پر نفس اجتماعی یعنی سماج کا گہرا اثر مترتب ہوتا ہے ۔

۱۹۴۶ئہ کی چند خاص خبریں

از ص۔ع

بسلسلۂ گذشتہ

۲۵ر ستمبر ۱۹۴۶ئہ۔ آج شام ٹریونڈرم کے مقامی صدر محبس میں قیدیوں نے فساد برپا کیا۔

۲۶ر " " ۔ ایک نوجوان گریجویٹ کو جس نے اپنی بیوی کی زندگی کا بیس ہزار کا بیمہ کراکر بعد میں اس کو سمندر میں ڈھکیل دیا تھا۔ آج سزائے موت سنائی گئی۔

۲۷ر " " ۔ کل ہند تعلیمی کانفرنس کا سترھواں اجلاس نئے سال کیلئے وزارت کا انتخاب ہونے کے بعد آج اختتام پر پہنچا۔

۲۸ر " " ۔ نظام اسٹیٹ ریلوے بورڈ متعینہ لندن کی منتقلی بمقام حیدرآباد

۲۸ر " " ۔ آج جنگ کے پندرھویں ہفتہ کا آغاز ہوا۔

۲۹ر " " ۔ بلوچستان میں آج صبح زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے گئے۔

۲۹ر " " ۔ امراوتی میں فرقہ وارانہ فساد میں آج تین اشخاص ہلاک اور (۶۹) زخمی ہوئے۔

۳۰ر " " ۔ دھن باد میں فرقہ وارانہ فساد۔

۳ر اکٹوبر ۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کی جمعداری اور اعزازات سے دست برداری کے متعلق عرضداشت بارگاہ خسروی میں

۴ر " " ۔ سر شفاعت احمد خان کا انتخاب جنوبی افریقہ کی یونین میں ہائی کمشنر فار انڈیا کی جگہ کے لئے کیا گیا۔

۵ر " " ۔ لاہور میں آج صبح شمالی ہندوستان کی ہوائی حملوں سے مدافعت کی مشق شروع ہوئی۔

۵ر " " ۔ آج شام ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوا۔ نتیجہ کے طور پر (۱۰) اشخاص ہلاک اور (۳۴) مجروح ہوئے۔

۶ر " " ۔ قومی دفاعی مجلس کا پہلا جلسہ وائسرائے لاج شملہ میں۔

۱۰ر " " ۔ آج بنگال کی مردم شماری کے اعداد کا اعلان کیا گیا۔ بنگال کی پوری آبادی ۶ کروڑ ۳ لاکھ ہے مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ تین لاکھ ہے ہندوں کی آبادی ۲ کروڑ ۴۶ لاکھ ہے۔

۱۳؍ستمبر ۱۹۴۲ء ۔ مسٹر اینے نے آج شام بذریعہ تار وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کا جائزہ حاصل کیا۔

۱۷؍ ″ ″ ۔ دفاعی خدمات کی نمائشی ٹرین کی لاہور سے سارے ہندوستان کے دورہ پر روانگی۔

۱۷؍ ″ ″ ۔ جاپان میں نئی جنگ پسند وزارت زیر قیادت ٹوجو۔

۱۸؍اکتوبر ″ ۔ روسیوں نے اوڈیسا خالی کر دیا۔

۲۰؍ ″ ″ ۔ افغانستان نے جرمنوں اور اطالویوں کے اخراج پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۲۳؍ ″ ″ ۔ آج رات کے بمبئی کے اچانک فرقہ واری ہنگامہ کے بعد سے ۱۶ ہلاک اور ۴۴ زخمی ہوئے

″ ″ ″ ۔ ڈھاکہ میں آج عید کے جلوس کے موقع پر فرقہ وارانہ تصادم کے بعد سے جملہ ۱۰ ہلاک ۱۹۰ زخمی ہوئے۔

۲۴؍اکتوبر ″ ۔ جرمنوں نے خارکوف پر قبضہ کر لیا۔

۲۶؍ ″ ″ ۔ مسٹر محمد علی جناح کی سرپرستی اور نوابزادہ لیاقت علی خان معتمد مسلم لیگ کی ادارت میں ایک مسلم ہفتہ وار رسالہ " دی ڈان " دہلی سے نکلنا شروع ہوا۔

۲۷؍ ″ ″ ۔ نلور میں فرقہ واری تصادم۔

۳۱؍ ″ ″ ۔ لاہور میں آج شام غوث محمد ہندوستان نمبر ۱ کو ایک ٹینس ٹورنمنٹ میں پریم پندی کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔

یکم نومبر ″ ۔ علی گڑھ مسلم لیگ کانفرنس۔

″ ″ ۔ جرمنوں نے کرائمیا کے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا۔

۳؍ ″ ″ ۔ ہندوؤں کو سندھ کے پنج قومی کرکٹ ٹورنمنٹ کے فائنل میں آج کامیابی حاصل ہوئی۔

۵؍ ″ ″ ۔ ایک جاپانی دخانی جہاز آج رات ڈبو یا گیا، جس میں (۳۰۰) مسافر تھے۔

۹؍ ″ ″ ۔ وفات ڈاکٹر سر گنگا ناتھ ۔ سابق وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی۔

۱۰؍ ″ ″ ۔ لفٹننٹ پی ۔ ایس بھگت اور صوبہ دار رچپال رام متوفی کی بیوہ کو آج وائسرائے نے وکٹوریہ کراس عطا کیا۔

۱۴؍نومبر ″ ۔ سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب کی آمد حیدرآباد

۱۸؍ نومبر ۱۹۴۱ء :۔ برطانیہ کی پیش قدمی لیبیا میں۔

۲۰؍ " " :۔ جرمنوں نے سارے مشرقی کریمیا پر قبضہ کرلیا جس میں کرچ کی بندرگاہ بہت اہم ہے جرمنی نے اعلان کیا کہ آج کی تاریخ سارے یورپ میں نیا نظام قایم کردیا جائے۔

۲۳؍ نومبر " :۔ سر مرزا اسمٰعیل سابق دیوان میسور جو چند دن کیلئے حیدرآباد تشریف لائے تھے آج بنگلور تشریف لیگئے۔

۲۴؍ نومبر " :۔ حضرت ظل سبحانی نے عواطف شاہانہ سے نواب بہادر یار جنگ کو سرفراز فرمایا۔

" " " :۔ آج دہلی میں دو مرتبہ ایک سکھ دیوان کے اجتماع کو منتشر کرنے کیلئے پولس نے اشک آور گیس کا استعمال کیا۔

۲۳؍ " " :۔ ماسکو پر نیا جرمن حملہ۔

۲۴؍ " " :۔ دو سال سات دن تک دستور معطل رہنے کے بعد ایک نئی وزارت کا اڑیسہ میں قیام۔

" " " :۔ بین الجامعاتی فٹ بال ٹورنمنٹ کے فائنل میں آج شام کلکتہ یونیورسٹی کی ٹیم نے پنجاب یونیورسٹی کو شکست دی۔

۲۵؍ " " :۔ فرمان خسروی متعلق "دعوت صلح و آشتی"

۲۷؍ " " :۔ ہگلی کے تاریخی امام باڑہ کے متولی سید محسن سراجی معمر (۷۵) سال کا پر اسرار قتل۔

۲۹؍ " " :۔ لکھنؤ میں پاکستان کانفرنس اور لاہور میں اکھنڈ بھارت کانفرنس۔

" " " :۔ امریکہ کا الٹی میٹم جاپان کو۔

۳۰؍ " " :۔ سر محمد عزیز الحق کو لندن میں ہندوستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔

یکم ڈسمبر " :۔ مسٹر جے۔ این نندا کا تقرر نظامس اسٹیٹ ریلوے کی جنرل منیجری پر

" " " :۔ بنگال کی کابینہ کے جملہ دس اراکین نے آج صبح گورنر کے پاس اپنے استعفی پیش کردیئے۔

۴؍ " " :۔ پنڈت جواہر لال نہرو رہا ہوگئے۔

" " " :۔ آج شام کے ۴½ بجے مولانا ابوالکلام آزاد نینی جیل سے رہا کئے گئے۔

" " " :۔ سر ناظم الدین متفقہ بنگال کی مسلم لیگی جماعت کے قائد منتخب ہوئے۔

(باقی)

سیدات

ناہید

جلد (۵) امرداد ۱۳۵۱ ف م جولائی سنہ ۱۹۴۲ء نمبر (۹)

۱۔ امۃ الحبیب ' محمدی احمد کا ایک تاریخی واقعہ ہے ' عورت کی بہادری اور جراءت کا پتہ چلتا ہے۔

۲۔ 'داستان الم' ساجدہ نے دلچسپ فسانہ لکھا ہے لیکن ذرا طویل، ایک حصہ اس نمبر میں پڑھ لیجئے۔ بقیہ کیلئے انتظار اچھا ہوگا۔

۳۔ 'چنگاری' ثریا جبین بی۔اے کی لگائی ہوئی ہے۔ کہیں آگے چل کر انگارہ نہ ہو جائے۔

۴۔ 'آدمیت کا راز' ساجدہ کا سنجیدہ مضمون ہے۔ درحقیقت یہ راز انسانیت میں موجود ہے۔ "ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں"۔

۵۔ 'سینما' افتخار جہاں کا مشاہدہ ہے اور حقیقت پر مبنی۔ مگر سینما دیکھنے والے ایسے کتنے ہیں جو سینما کو اس نظر سے دیکھتے ہوں ورنہ "صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے" ہر ایک کا مقصد ہے۔

۶۔ 'شادی کے وقت' نورانی، زبیدہ قریشی کی دو نظمیں ہیں جو پڑھی گئیں اور دونوں نہایت اچھی ہیں۔

۷۔ 'مشترکہ خاندان' ایک سماجی مسئلہ ہے۔ آپ کے لمحہ فکر کیلئے۔

۹۔ 'آپ کی رائے' کے ہم منتظر رہیں گے کہ اس کا تصفیہ ہو جائیے۔

'ب'

اُمّۃُ الحبیب

محمودی احمد

روم کی سلطنت پر بایزید بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کی فوج کا سپہ سالار ایک بہادر عجمی تھا۔ اس کی لڑکی کا نام امۃ الحبیب تھا۔ یہ لڑکی بڑی لائق اور بہادر تھی۔ ہر کام میں باپ کی مددگار اور اس کے ماتحت فوج کی سرداری بھی کرتی۔ جب وہ فوج میں شامل ہوتی تو مردانہ کپڑے پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتی۔ اس کی لیاقت و بہادری کی وجہ سے ہر شخص اس کی عزت کرتا تھا۔

روم پر بایزید زیادہ عرصہ تک حکومت نہ کرنے پایا تھا کہ تیمور لنگ نے اس کے ملک پر حملہ کر دیا۔ بایزید نے پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ امۃ الحبیب بھی اس جنگ میں بڑی بہادری سے لڑی۔ لیکن تیمور کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ اس لئے لڑائی کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوا۔ تیمور نے امۃ الحبیب کو ترکی فوج کے ایک بڑے حصہ کے ساتھ گرفتار کر لیا کیونکہ اس نے میدان جنگ سے بھاگنے کو عار سمجھا اور اپنے جاں نثاروں کی مصیبت میں آخر وقت تک ساتھ دیا۔ دوسرے روز تیمور نے قیدیوں کے قتل کا حکم دیا۔ جیسے سنتے ہی امۃ الحبیب آگ بگولہ ہو گئی اور رونے لگی۔ اس کا یہ رونا کچھ اپنی وجہ سے نہ تھا بلکہ بہادر ترکی قیدیوں کی افسوسناک حالت نے اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا تھا اس نے ارادہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا وہ قیدیوں کو موت سے بچائیگی۔ اس نے تیمور کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ پہلے تو اس کی جرأت کا مضحکہ اڑایا گیا لیکن جب تیمور کو یہ معلوم ہوا کہ وہ عورت ہے اور مردانہ کپڑے پہن کر بہادری سے لڑتی ہوئی گرفتار ہوئی ہے تو اس نے امۃ الحبیب کو آنے کی اجازت دی۔

امۃ الحبیب پابزنجیر تلواروں کے سایہ میں تیمور کے سامنے حاضر کی گئی جب اسے بولنے کی اجازت ہو گئی تو اس نے بلاخوف و خطر تیمور لنگ کو مخاطب کر کے کہا "اے سلطان تو نے بلا وجہ بایزید پر حملہ کیا۔ خدا کے ہزاروں بے گناہ بندوں کا خون بہایا۔ روم میں ہزاروں مائیں ایسی ہیں جو آج تیرے ظلم کے ہاتھوں اپنے بیٹوں کی موت پر خون کے آنسو رو رہی ہیں ہزاروں بیوائیں اپنے شوہروں کیلئے سینہ پیٹ رہی ہیں۔ بہن بھائیوں کو رو رہی ہے۔ لڑکیاں باپوں کا نوحہ کر رہی ہیں تو نے یتیموں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ کر دیا۔ تو نے ترکوں پر ہی ظلم نہیں کیا بلکہ اسلام پر بھی کاری ضرب لگائی۔

اے تاتاریوں کے سردار! کیا تو بتا سکتا ہے کہ تیرا یہ فعل انسانی اور آسمانی قانون کی کس دفعہ کے مطابق تھا کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرا یہ فعل شریعت کی رو سے کس سزا کا مستوجب ہے۔ بایزید نے صلح کی شرائط پیش کیں۔ لیکن تو نے انھیں ٹھکرا دیا۔ کیونکہ تو چاہتا ہے کہ دنیا تجھے "فاتح عالم" کے نام سے یاد کرے۔

اے شہنشاہ! میں اور میرے سپاہی اس وقت مجبور و ناچار ہیں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالدی گئی ہیں۔ اور ننگی تلواروں کا پہرہ قایم کر دیا گیا ہے۔ اب تیرے حکم سے خون کی ندیاں بہادی جائینگی۔ اور تیرے بہے کارنامو میں ایک ہولناک گناہ کا اضافہ ہوجائے گا لیکن یاد رکھ کر تجھے بھی ایک دن موت کا منہ دیکھنا ہوگا اور تو خدائے عادل کے سامنے مجبور و ناچار گناہوں کی جواب دہی کیلئے حاضر ہوگا۔ اس وقت تو کیا جواب دیگا۔ دنیا کی دولت و حشمت تجھ سے بیکار ہوگی اس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ تیرا یہ حکم کہاں تک مناسب تھا؟ کیا تو نے کبھی سنا کہ کسی بہادر سردار فوج نے دشمن کے نہتے سپاہیو پر تلوار اٹھائی۔ تو انصاف کا خون اور بہادروں کا نام بدنام کر رہا ہے"! امۃ الحبیب نے جوش میں آکر سر سے خود اتار کر پھینک دیا۔ اور کہا "اے سلطان! میری طرف دیکھ، میں ایک کمزور عورت ہوں خیال کر کہ جو قوم مجھ جیسی بہادر عورتیں پیدا کر سکتی ہیں کتنی نہ بہادر ہوں گی۔ وہ تیرے ظلم کی داستانیں سن کر کیونکر چپ بیٹھ سکتی ہے۔ جبتک خون کا بدلہ خون سے نہ لیا جائے گا ترکی قوم کی تلواریں نیام میں نہ جائیں گی۔ حکم دے کہ ہمارے سر قلم کر دئے جائیں اور پھر اپنے سر کی فکر کر"۔

جس وقت یہ بہادر عورت تیمور کو مخاطب کر کے اسے شرم دلا رہی تھی سارے دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص مبہت بنا بیٹھا تھا جب اس نے اپنا خود اتار کر پھینکا اور سیاہ لمبے بال شانوں پر لہرانے لگے تو تیمور اور امراء دربار کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ انھیں ابھی تک یقین نہ تھا کہ یہ بہادر سپاہی دراصل عورت ہے۔ تیمور خود بڑا بہادر تھا۔ امۃ الحبیب کی باتیں اس کے دل میں تیر کی طرح لگیں اور اس کا دل رحم و انصاف سے بھر گیا اور خوف خدا سے تھر تھر کانپنے لگا اور اپنے حکم پر شرمندہ ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ امۃ الحبیب کی صورت اس کی لیاقت اور اس کی دلیری نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ اس نے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا۔ ترکی سپاہی رہا کر دئے گئے۔ پھر اس نے امۃ الحبیب سے شادی کی درخواست کی امۃ الحبیب نے بھی اس رشتہ کو پسند کیا اور اپنی منظوری دیدی۔ اس طرح وہ ایک بہادر شہنشاہ کی ملکہ بنگئی:

داستان الم

ساحرہ

"تمہیں دو فرحی" میں نے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا پڑی۔ ایک غمگین مسکراہٹ "تو فرحی تم نے عہد کر لیا ہے۔ شاید ہمیشہ مغموم رہنے کا اور کسی کو اپنا شریک غم نہ بنانے کا"؟ وہ پھر مسکرا دی۔ یعنی لباس میں ایک حسین و غمگین روح!

[illegible] مجھے ایک لفافہ دیتے کہا تھا کہ ... یہ لو۔ اس نے نہایت دلکش لہجے میں دریافت کیا:

"ہاں دیکھو میرے فرشتہ بیلو!" خادمہ نے ایک مسکراہٹ پیش کیا، اور میں ملاقات کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے لوٹی تو فرخی غائب۔ معلوم ہوا ابھی کچھ کام تھا اسلئے تو خادمہ سے کہکر چلی گئی۔

(۲)

دوسری صبح میں برآمدے میں ابھی ٹہل اور شہد کھا رہی تھی کہ فرخی کا ملازم پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو مسودے تھے۔ میں نے سوچا: میرے افسانوں کا مسودہ بھیجا ہوگا۔

"کیوں! فرخی کیسی ہیں۔ کل وہ مجھ سے بغیر ملے چلی گئیں۔ بڑا افسوس ہوا، کیونکہ دوپہر کا کھانا نہیں کھایں" میں نے مسودہ کیلئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ مگر اس نے نہایت مغموم لہجہ میں جواب دیا: "جناب افسوس کہ خاتون فرخی صبح سویرے کی ٹرین سے کہیں چلی گئیں۔ کچھ نہیں پتہ کہ ان کا قصد کہاں کا تھا۔ جاتے وقت وہ یہ مسودے آپکے دینے کیلئے کہہ گئی ہیں" ملازم سلام کرکے چلا گیا۔

"میں اس اچانک خبر سے مبہوت رہ گئی۔" فرخی بغیر مجھ سے کہے چلی گئی۔ وہ مجھے کس قدر چاہتی ہے۔ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ، اور کتنی معصوم لڑکی ہے۔ بالکل ایک کمسن بچے کی طرح معصوم! مگر آہ اس کی المناک زندگی جانے اس پر کیا افتاد پڑی جو اس قدر غمگین رہا کرتی ہے" ــــــ سورج کی کرنیں مجھ پر پڑنے لگیں۔ میں اوٹھکر اپنے خاص کمرے میں چلی گئی اور مسودہ کھولا ــــ ایک تو میرا ہی افسانہ تھا مگر ایک کچھ نئی ہی داستان تھی۔

"پیاری خاتون شہلا آپ ہمیشہ مصر رہیں کہ میں اپنی داستان حیات آپ کو سناتی لیکن میں ہر بار ٹال گئی۔ اور اب جبکہ میں یہاں سے ہمیشہ کیلئے جارہی ہوں آپ کو سنا دینا چاہتی ہوں کیونکہ آپ ہی وہ ہستی ہیں جسے اس وقت میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں" کاؤنٹس صباح فاخرہ میری اکلوتی اور چہیتی خالہ ایک وسیع جائداد اور شاندار و مشہور قصر نوشاد کی مالکہ تھیں۔ سنا کہ ایک اور عظیم الشان محل شاہی تھا جو مع امی بابا اور خالہ صباح فاخرہ کی اکلوتی و حسین لڑکی تماعمہ کے جل کر ختم ہوگیا۔ اس کے کھنڈر سے اس کی وسعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کاؤنٹس صباح فاخرہ مجھے بیحد چاہتی تھیں۔ وہ عموماً سب سے کہا کرتیں "دنیا میں میرے لئے ہے ہی کیا سوائے اپنی صاحی کے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں دنیا کبھی کی ترک کر چکتی۔ مگر میری صاحی میرے لئے سب کچھ ہے میں اس کیلئے اور وہ میرے لئے ہے" اور واقعی میں بھی خالہ کو بے انتہا چاہتی تھی۔ ان کے سوا تھا ہی کون میری چاہت کیلئے۔ میری ساری محبت ان کیلئے ہی تھی۔ خالہ کاؤنٹس صباح فاخرہ نازک اندام سرخ و سفید خاتون تھیں ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی مگر پچیس سال سے زیادہ کی ہرگز نہ معلوم ہوتی تھیں۔ وہ میرے لئے ایک بارعب بزرگ بھی تھیں اور عزیز رفیقہ بھی

خالہ صباح اکثر اپنی بچھڑی ہوئی محبوب ترین سہیلی مادام زارینہ کا تذکرہ کرتیں جو عرصے سے لاپتہ تھیں جس وقت خالہ

مادام زارینہ کا ذکر کرتیں ان کا بشرہ ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا کہ وہ انھیں کس قدر عزیز رکھتی تھیں۔

"ایک صبح ناشتہ کے بعد میں اندرونی عالیشان ورانڈے میں صوفے پر نیم دراز تھی ایک ایرانی خادمہ میرے بالوں میں پھول چن رہی تھی۔ خالہ صباح بوڑھے شیلاچی کو دوپہر کے کھانے کے متعلق ہدایات دے رہی تھیں کہ اتنے میں ایک حبشی خادمہ نے آکر با ادب عرض کیا "محترمہ ایک کمسن خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"اچھا تم انھیں ملاقاتی کمرہ میں بٹھاؤ میں ابھی آتی" انھوں نے جلد جلد کاسنی رنگ کا ایک باریک لبادہ پہنا اور مجھے بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کرکے ملاقاتی کمرہ کی جانب ہولیں۔ جب ہم پہونچیں تو کنیز دریچوں کے پردے سرکا رہی تھی، اور سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک خاتون کھڑی تھیں۔ خالہ نے قریب پہنچ کر غور سے اس خاتون کی طرف دیکھا چیخ مار کر لپٹ گئیں "زارینہ" چند منٹ کی خاموشی کے بعد ایک مترنم آواز نے بھرائے ہوئے لہجہ میں کہا "آہ پیاری کاؤنٹس اب آپ کی زارینہ کہاں۔ تین سال ہوئے انھوں نے صقلیہ کے اجنبی جزیرہ میں مجھے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دیدیا۔ میں اس دنیا کی مصیبتیں سہنے کیلئے تنہا رہ گئی۔ میں ان کی اکلوتی لڑکی ہوں۔" خالہ صباح نے پھر ایک بار فرزالہ کو اپنی گرفت میں لیلیا۔ وہ بھی بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔ میں دریچے کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی کہ "اف ان سہیلیوں میں کس قدر محبت تھی" میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

فرزالہ سے مادام زارینہ کی موت کی خبر سن کر خالہ صباح بیحد غمگین اور خاموش رہنے لگیں۔ اور جلد ہی کافی بوڑھی بھی لگنے لگیں۔ چہرہ زرد پڑگیا اور آنکھیں ماند ہوگئیں۔ میں اکثر انھیں لپٹ جاتی "آہ پیاری خالہ آپ کی کیا حالت ہوگئی" وہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ میری پیشانی چوم کر کہتیں "میری بچی تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ میں تو خاصی اچھی ہوں۔"

فرزالہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھی اور خالہ کے خیال میں وہ مادام زارینہ کی ہو بہو تصویر تھی۔ خالہ تو خیر اس کی وارفتہ تھیں ہی لیکن میں بھی اس کی مفتون تھی۔ اور فرزالہ بھی، ہم دونوں کی انتہائی شیدا تھی۔ ایک دوسرے کی تکلیف پر ہم دونوں لڑکیاں تڑپ جاتیں۔ خالہ صباح کو خصوصاً ہماری دوستی و محبت کو دیکھکر مسرت ہوتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتیں۔ "دوستی و محبت زندگی کا بہترین مقصد ہے۔ دوستی و محبت کی خاطر ہر قربانی بخوشی کرنی چاہئے۔" ان کے اس خیال کو سن کر ہم دونوں نہایت عقیدت سے سر جھکالیتیں۔

ایک حسین شام میں ایک مرمریں بنچ پر بیٹھی مصوری کر رہی تھی اور فرزالہ بربط میں کوئی ایک سریلا عربی راگ نکال رہی تھی۔ خالہ خاموش بیٹھی ہوئی تھیں اور چاروں طرف کنیزیں با ادب کھڑی تھیں۔ یکایک خالہ نے عالیشان قصر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "مجھے اس قصر سے بہت انس ہے میری لاڈکیو! میرے بعد تم لوگ اس قصر کو ویران نہ چھوڑنا۔ بلکہ دونوں

ہنسی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ اس محل میں بسر کرنا۔" ہم دونوں چونک کر خالہ کو دیکھ رہی تھیں۔ فضا میں بالکل خاموشی
چھائی ہوئی تھی۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر خالہ کو لپٹ گئی۔ "پیاری خالہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپکے بعد ہماری ہنسی
اور خوشی کیسی؟ خدا آپکو ہمارے سروں پر ہمیشہ قایم رکھے۔"

خالہ صباح ایک دلکش انداز میں مسکرائیں "کیسی طفلانہ باتیں کرتی ہیں یہ صباحی! میں کوئی دنیا میں ہمیشہ
رہنے کا ٹھیکہ تو لے کر نہیں آئی۔ پھر کسی ایک کے کم ہو جانے سے دنیا کی خوشیاں نہیں ختم ہو جاتیں۔ سمجھا صباحی؟
ہاں تو سنو۔ تم دونوں اسی محل میں رہنا۔ جائداد کو نیک کاموں میں صرف کرنا۔ اور سارا انتظام جمیل بیگ کے ہی ذمہ رکھنا
وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ ان نمک خوار کنیزوں سے بھی اچھا سلوک کرنا۔ اور دیکھو قلعیہ میں زارینہ کا مقبرہ نہایت عالیشان
بنوا دینا۔" ہم سب مبہوت خالہ صباح کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ میری اور غزالہ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے!

اس دن سے ہم سب بے حد غمگین رہتے۔ کبھی کبھی ہنس بول لیتے۔ ورنہ ہر دم خاموشی طاری رہتی۔ غزالہ کچھ دنوں سے
بے چین سی رہنے لگی تھی۔

جاڑوں کی رات تھی۔ ہم سب آتش دان کے پاس بیٹھے تھے۔ خالہ صباح ریشمی رضائی لپیٹے ایک موٹی سی عربی کتاب کا
مطالعہ کر رہی تھیں۔ غزالہ بے چینی سے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھیں۔ یکایک اس کی نظریں ایک لٹکی ہوئی تلوار پر
جم کر رہ گئیں۔ پھر وہ متوحش ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "غزالہ میں دیکھ رہی ہوں تم کچھ بے چین معلوم
ہو رہی ہو۔" وہ ایکدم ہنس پڑی "کیا تم خواب دیکھ رہی ہو صباحی؟" غزالہ کی ہنسی پر خالہ صباح نے چونک کر ہمیں دیکھا
پھر گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں "بہت رات گذری آؤ میری بچیو، خدا حافظ کہہ لیں۔" انھوں نے ہماری پیشانی چومی
اور ہم نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ پھر اپنی اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔

گیارہ کا گھنٹہ بجا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ سخت بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دریچے کے پردے
سرکائے اور پھر لیٹنے جا رہی تھی کہ اچانک خوبصورت غزالہ اپنے خوبصورت نارنجی لباس میں خون آلودہ تلوار لئے داخل
ہوئی۔ اور مجھے کھڑی دیکھ کر چونک گئی۔ میں لرزتی ہوئی آواز میں چیخ پڑی "غزالہ" —— اور وہ جھٹ تلوار پھینک کر
بھاگی۔ تھوڑی دیر تو میں مبہوت کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ خالہ کے کمرہ میں گئی۔ مگر آہ خدا! یہ دنیا کس قدر بھیانک جگہ
ہے۔ یہاں کیسے کیسے روح فرسا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ خالہ کے کمرہ میں پہنچ کر میں نے وہ منظر دیکھا جسے یاد کر کے میرے
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خالہ صباح کا جسم مسہری پر تڑپ رہا تھا۔ کٹے ہوئے گلے سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔
میں ان پر جھک گئی "خالہ پیاری یہ کیا ہوا؟" انھوں نے بمشکل اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر گر پڑیں اور خون کے چھینٹے میرے

شب خوابی کے لباس میں آگرے۔ میں نے پھر دردناک آواز میں کہا۔

"صاحی میری بچی ——— آہ ——— میں اس دنیا میں ——— تیرے لئے ——— تھی ——— اچھا خدا حافظ میری بچی ——— صاحی ——— تم سے ——— التجا ہے ——— فرزانہ کو بچا لینا ——— صاحی ——— خیال رکھ ———"

نہ معلوم اور کیا کہتیں، مگر ان کی آنکھیں بند ہو گئیں ——— ہمیشہ کیلئے ——— آہ وہ حسین آنکھیں جو محبت کا سرچشمہ تھیں۔ میں تھوڑی دیر انہیں اسی طرح دیکھتی رہی پھر ایکدم چیخ مار کر گر پڑی ——— پیشانی پر نرم نرم لمس محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھولیں۔ فرزانہ کی خوبصورت نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ پیشانی سہلا رہی تھی۔ بیشمار خادمائیں اور فرزانہ مغموم کھڑی تھیں باہر سے آہ و فغاں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چار بجے تھے۔ میری عقل حیران تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں! آنکھیں خشک اور دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے پوچھا "فرزانہ کون رو رہا ہے۔ یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں" ——— وہ سر جھکائے خاموش رہی۔ میرے خیالات پرواز کرنے لگے "آہ میری خالہ" میں نے دردناک لہجہ میں کہا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر غشی طاری ہو گئی، دوبارہ جب ہوش میں آئی تو سورج کی پہلی کرنیں دریچے کے پردوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں میرے پاس صرف بوڑھی خادمہ فرزانہ موجود تھی۔ "یہ کیا ہوا فرزانہ؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور رونے لگی۔ پھر سہارا دے کر کمرے کے باہر نکلی۔ عظیم الشان قصر بالکل بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ بیشمار لوگ جمع تھے۔ نواب، امراء، غریب، فقیر سبھی تھے۔ کارکنان پولس بھی تفتیش کیلئے موجود تھے۔ تمام کنیزوں نے جو رونے دھانے میں مصروف تھیں متعدد سوالات کئے جا رہے تھے۔ فرزانہ خاموش اور بجیں کھڑی تھی کیسی قسم کے جذبات اس کے چہرے سے عیاں نہ تھے۔ میں مجمع میں پہنچتے ہی ایک صوفہ پر نیم دراز ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔ خالہ صباح کا بیجان جسم سفید چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ صرف سفید سا چہرہ نظر آ رہا تھا جس پر نارنجی بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف عود و عنبر جل رہا تھا۔ قرآنی آیات سنائی دے رہی تھیں۔ خالہ کا چہرہ دیکھتے ہی میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ یکایک خالہ کے سکریٹری جمیل بیگ نے آ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "کارکنان پولس اس وقت تفتیش ملتوی کر دیں تو بہتر ہوگا، میں مشکور ہوں گا۔ کیونکہ پریشان متعلقین اس وقت اور زیادہ پریشان ہو رہے ہیں" ———

دوپہر تک میں کمرے میں مغموم لیٹی تھی۔ میرے اطراف افسردہ کنیزوں کا ہجوم تھا۔ یکایک چند کارکنان پولس داخل ہوئے۔ انسپکٹر نے بڑھ کر کہا "محترمہ شہزادی معاف کیجئے ہم آپ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں" مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ کیا یہ لوگ عزیز خالہ صباح کے قتل کی سازش میں مجھے شریک سمجھتے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ چند لمحہ کیلئے ساکت رہ گئی۔ پھر انھیں تلاش لینے کا ارادہ کر کے خود باہر نکل آئی۔ (باقی)

چنگاری

ثریا جبین۔ بی۔ اے

> پڑھ کے تیرا خط عجب دل کی میرے حالت ہوئی ۔۔ اضطراب شوق نے ایک حشر برپا کر دیا

غزالہ!

عجیب ستم ظریف ہو۔ ذرا اچھلا نہیں بیٹھا جاتا تم سے۔ عجب آفت ہے، بولوں تو گنہگار نہ بولوں تو قصوروار، اللہ اللہ رے شان بے نیازی! منظر عام پر تصویر کھینچ دی اور مجھ سے امید ہے کہ تمہارے اس رنگین آرٹ پر میری نظر نہ پڑے جو تمہاری نرم و نازک سیمین انگلیوں سے مرقع بھرا ہوا ہے جو ہمیشہ میری نظروں میں مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ ہمیشہ تم سے کہتی ہوں ان ہنگامہ آرائیوں سے دور رہو، لیکن تم کو تو سوتی بھڑوں کے چھتے چھیڑنے میں لطف آتا ہے۔

دوست! یہ تو موہوم سی چیز ہے غزالہ میرے فلسفۂ حیات میں۔ سب غرض کے بندے، آفت کی پڑیاں۔ قیامت کے صورت ۔۔۔ اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔ دنیا کے زبردست قائدین نے اس شاہراہ پر سخت ٹھوکریں کھائیں اور تلخ تجارب دکھائے۔ پھر بھی دوستوں پر جان دینا کون سی عقلمندی ہے۔ کتابوں سے بہتر پُرخلوص اور صادق حبیب بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ اللہ برکت دے اس مبارک ساعت پر۔ جب ان دوستوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تم سے کیا بتاؤں کہ ان کی صحبتوں میں میں نے کیا کیا لطف اٹھائے۔ اور سے ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا۔

میری زندگی کے جس دور سے میں گذر رہی تھی وہ تمہارے ہی لطیف صحبت کا اثر تھا نا۔ تم ہی نے مجھے ٹیچر بنا سکھایا اور پھر خود ہی خنجر سے ان کے مضامین چھلنی کرنا بھی! میرا نقش تو نقش ثانی ہے اور تم جانتی ہو،

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

تم میری عیب جوئی نہ کرو، کیونکہ اپنی خصوصیات کا معتد بہ حصہ مجھ میں پاؤ گی۔ یا پھر اس بلبل جنت نشان وطوطی ازین مکان کی برخورداری کامگاری کا۔

انسان اپنے فرائض کو انجام دینے میں تاروں کی طرح گم صم، بیقرار، دھنک رہے تو اس کا نام دنیا نے کھو جانا رکھا ہے۔ تعجب ہے تمہارا بھی ایمان اس پر ہے۔ حالانکہ میں خود تمہیں دریائے فکر میں غوطہ زن پایا کرتی ہوں۔

تم نے مجھے کیا کچھ نہ سکھایا؟ میری ٹوٹی پھوٹی عقل کا معتد بہ حصہ جس کو عام لوگ، انہماک، وابستگی اور گم گشتگی پر محمول کرتے ہیں، تمہارا ہی تو عطیہ ہے۔

اب رہا شاگردوں کا معاملہ . . . . . رہنے بھی دو بفرالہ ہر غالب کیلئے میر فہدی مجروح پیدا نہیں ہو سکتا۔ میں نے ان کی فطرت کا خوب مطالعہ کیا ہے ۔ یہ علم کی دنیا تھوڑی ہے نمبر تو نشانات کی دنیا ہے جو انہیں مرضی موافق نشانات دے ، ان کا محبوب استاد ہے ورنہ ان کی چہ میگوئیوں کا کیا پوچھنا ۔ اور یہ میرے بس کی بات نہیں ۔ میں نے تم سے معیار قابلیت جانچنا سیکھا تھا۔

من قماش فروش دل صد پارہ خویشتم

کا سبق یاد نہیں کیا تھا اور نہ اس کی ڈگری لی ۔ انسان اگر اپنی درستی کی کوشش کرتا رہے تو اس کی نظر میں کوئی بُرا نہیں رہتا ۔ کسی نے خوب کہا ہے نا ۔

غیروں پہ نام رکھتے گذری تھی عمر ساری ۔ دامن تھا اپنا تر جب گردن جھکا کے دیکھا

مورکھ کہیں کی ۔ ادن کی ہستی کیا ہے ۔ مجھے بنانے کی ۔ صانع ازل نے مجھے اپنے دست خاص سے بنایا ہے یہ آب و گل کی ناتوان ہستیاں کیا اس کی ترمیم کر سکتی ہیں ؟

ہاں یہ سمجھو ان کی بعض نادرا باتوں پر "جواب جاہلان باشد خموشی" ایک طلسم کار ہے جس کو وہ اپنی کامیابی پر محمول کر کے اجنبی لوگوں کے آگے شخصیت جتاتی ہوں گی ۔ وقار تو وہ تو ضمیر میں باقی رہنا چاہیئے اسے خودغرض نہ سمجھ اور خود ستا جراثیم کے آگے ڈاکٹر کا وقار نہیں کھو سکتا ۔

مجھے اہل غرض کی ہر دلعزیزی یا بیزاری کی کوئی پروا نہیں

نہ شادی دار سامانے نہ رنج آور دنقصانے ۔ بہ پیش ہمت ما ہر چہ آمد بود مہمانے

جو شخصیت خود اپنی کمزوریوں کی اصلاح میں وقت صرف کرنے اسے کسی دوست کے سمجھانے کی ضرورت نہیں البتہ تمہاری پھلجھڑیوں کے چرچے کافی ہیں ۔ فرض شناسی اور راستی کی شاہراہ کا نام تم نے وضع بدلنا رکھا ہے ۔ اس پر غور کرو ۔ میں تمھیں غلطیوں کی بھول بھلیوں سے کہیں پرے جانتی ہوں ۔ شاید لغزش قلم ہو تم سے بہت کچھ کہنا ہے ۔ اپنی ہمسائیگی کا واسطہ اپنے گلعذار سے میرے مشام جان کو معطر کرو تو دیکھو گی کہ مستانہ وار تمام حقائق کا انکشاف کرتی ہوں ۔

تمہاری اپنی "فرزانہ"

آدمیت کا راز

آنسہ ساجدہ احمد محی الدین

طلسم بود عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن ـــــ لیکن ـــــ

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں ــ وجود حضرت انسان نہ روح ہے نہ بدن

آؤ میرے فرمانبردارو آؤ! اس خلیفۂ ارضی کو سجدۂ تعظیم بجا لاؤ ـــــ یہ پہلا ارشاد خداوندی تھا جسے فرشتوں نے بہ گوش ہوش سُنا اور سارے عالم نے حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھا۔ فرمان خداوندی کی پُرجلال آواز نے سب کو کپکپا دیا۔ ؎

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا؟ ــ عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا؟

(گہری خاموشی کے بعد) ..... جنت و دوزخ بیک وقت استقبال کو بڑھتے ہیں، دونوں میں تکرار ہو جاتی ہے۔ فرمان خسروی جاری ہوتا ہے۔ ہٹ جاؤ۔ اس کا فیصلہ خود آدم پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ جسے چاہے استقبال کا شرف بخشے۔ فضا میں تحمید و تقدیس کے نغمے بلند ہوتے ہیں سب کے سب سر اطاعت خم کرتے ہیں۔ سجدہ کا راز کیا ہے۔

آج ساری قوتیں آدم کے تابع کر دی گئیں۔ مگر دیکھو فرشتوں کی صف میں سب سے آگے کھڑا ہوا فرشتہ اپنے غرور سرداری میں انکار کی آواز بلند کرتا ہے۔ حکومت و سرداری کا غرور رحمت و بخشش کی بجائے کلفت و لعنت کا باعث ہوتا ہے۔ انکار پر ارشاد ہوتا ہے کہ اس جاہل و مغرور کو ہماری بارگاہ سے نکال دو۔ آج سرداری چھین لی گئی۔ اور آن کی آن میں سرداری کی خلعت کی بجائے ذلت و لعنت نصیب ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے ہر بلندی کے نصیبوں میں پستی ہے ....

یہ نافرمانی کی پہلی سزا تھی ـــــ جب فرشتے سر اٹھاتے ہیں تو آدم کے سر پر تاج خلافت دیکھ کر تعجب سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ اس مشت خاک پر تنقید و تبصرہ کریں۔ فرشتے نہایت عجز و انکسار سے عرض کرتے ہیں۔ "اے وہ کہ تیری بادشاہی لازوال ہے اور تیری قدرت بے مثال ہے۔ ہمیں عرض کرنے کی اجازت عطا فرما کہ ہم اس بھید سے آشنا ہوں۔ بارالہا! یہ مٹی کا پتلا اور اس پر یہ تاج۔ یہ فسادی بے شکرا "باشر" بشر ہے اس پر یہ خلافت کا

بار امانت۔ ہم دن رات تیری تسبیح کرتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ الطاف وعنایت کی نظر آدم پر پڑی۔ یہ عرش۔ یہ فلک۔ یہ تیرا نظام، اس میں اس فسادی کی ہستی کی ضرورت کے کیا معنی؟ ہم کیا تیرے لئے کافی نہ تھے۔ تیری قدرت کے خزانے میں اس وقت بھی کونسی چیز کی کمی ہے۔ ہمیں اس راز سے آگاہ فرما ——————

صدائے ربانی آتی ہے۔ یہ ایک راز ہے۔ راز۔ جس کو ہمارے سوا کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ آدم کا جوہر اور اسی کا مقام یہ سب تمہاری عقل وادراک سے پرے ہے۔ تم دن رات ہماری قدرت کی تقدیس کرتے ہو۔ لیکن ہماری پوری معرفت کے بغیر —— رحمت کی تعریف کرتے ہو لیکن بغیر رحمت کی حقیقت سے آگاہ ہوئے۔ شکر گزاری کی مالا جپتے ہو مگر شکر گذاری سے ناواقف ہو کر —— لیکن آدم کو تو ایک چیز عطا کی گئی ہے —— وہ کونسی شئی ہے۔ اے ہمارے عاجز نواز آقا۔" فرشتوں نے بیقراری سے پوچھا۔

وہ "عقل وعلم" ہے یہی وہ چیز ہے جس سے آدم کو تاج خلافت عطا ہوا۔ تمہاری تعریف کی حد علم کی سرحد سے پہلے ختم ہو جاتی ہے اس کی تعریف کا مقام علم کی سرحد سے شروع ہوتا ہے۔ ہماری قدرت نے ایک ہی تسبیح میں "علم وعقل" کے دو دانے آدم کے لئے پروئے ہیں۔ فرشتے مطمئن ہو کر کہتے ہیں۔" علم وعقل" خدایا یہ دونوں تیری قدرت کاملہ کی دو زبردست نشانیاں ہیں۔ دنیا ایک سمندر ہے اور آدم کو عقل وعلم کی کشتی میں چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کو ہمارا حکم ہے کہ سمندر کی ضلالت وگمراہی کے طوفان سے اسی کشتی کے ذریعہ پار اترے ....

آدم کے سر پر خلافت کا تاج اور دین کی امانت کا بار رکھا گیا ہے۔ وہ تاج دراصل عقل وعلم کا ہے۔ پھر آدم سے ارشاد ہوتا ہے۔ اے آدم ایک فرشتہ نے تجھ سے دشمنی کی اور ہماری بارگاہ سے نکال دیا گیا۔ تیری خاطر ہم نے اس کو اپنی بارگاہ سے نکالا۔ اگر تونے اسے اپنے دل میں جگہ دی تو یاد رکھ تو بھی ہماری بارگاہ سے نکال دیا جائے گا۔ "عقل وعلم" میری دو عظیم ترین بخششیں ہیں تاکہ تو دین کی امانت کی حفاظت ان دو بخششوں سے کرے اور آزمائش وعمل کے میدان میں کامیاب ہو۔

—— اب اے فرشتو! بتاؤ کہ کیا تم اس بار کو اٹھا سکتے تھے۔؟؟

سارے فرشتوں نے گردنیں جھکا لیں ——————

گرچہ تو زندانی اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اے مسلماں ہر گھڑی پیش نظر — آیۂ لایخلف المیعاد رکھ

یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے — "ان وعد اللہ حق" یاد رکھ

اقبال

سینما کا اثر سوسائٹی پر

افتخار جہاں

دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو سینما کے نام سے واقف نہ ہو۔ ہر آدمی اس کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی خانگی وجوہات کی بناء پر سینما نہ جا سکیں وہ بھی دل سے اس کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ہر گلی کوچہ میں بچے اس کے گانے گایا کرتے ہیں۔ چند دن تک " زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے " زبان زد رہتا ہے تو چار روز کے بعد " چل چل رے نوجوان " کی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ آج کل تو " ساون کے نظارے ہیں " زور پر ہے۔ بہر حال ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اسی طرح یہ لامتناہی سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔

بعض مزدور پیشہ آدمی بھی روزآنہ سینما دیکھا کرتے ہیں، سارا دن مزدوری کی شام کو سینما۔ دوسرے دن کھانے کے لئے ایک دانہ نہیں۔ مگر رات کو تھیٹر میں موجود۔ سینما دیکھنا نہ امیر پر منحصر ہے نہ غریب پر۔ امیر آدمیوں کو تو خیر پیسوں کی کمی نہیں۔ پھر انہیں پاس بھی ملجایا کرتے ہیں یا کبھی خود اپنے پیسوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ اب رہے متوسط لوگ۔ اکثر کوئی اچھا فلم آیا۔ دل تڑپ گیا۔ ہاتھ میں پیسہ نہیں۔ کپڑے رہن رکھائے جاتے ہیں۔ قرض لیا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا فرض۔ فقیر گھر پر آکر گڑگڑاتا ہے، عاجزی کرتا ہے، دعائیں دیتا ہے۔ مگر ہاتھ سے ایک پیسہ دیا نہیں جاتا۔ اور نہ ہی راستی سے بات کی جاتی ہے۔ نوکر کے ذریعہ اس کو نکال دیتے ہیں۔ سینما دیکھنے کا شوق یہاں تک کہ رمضان کا مہینہ جو کہ خداوند عالم نے عبادت کا مہینہ قرار دیا ہے۔ اس میں بھی سینما نہیں چھوٹتا۔ قرآن شریف ایک گھنٹہ بیٹھکر پڑھنا ہاتھ نہیں ہوتا۔ مگر روزآنہ سکنڈ شو دیکھنے ڈیڑھ بجے تک جاگتے ہیں۔ خیر، رات گذری، دن میں قرآن شریف پڑھنے کے بجائے فلم کو دھرایا جاتا ہے شاید وہ اسی میں ثواب سمجھتے ہیں، یہ تو دیکھنے والوں کا وارفتہ پن ہے۔

جب وہ عوام میں اتنی مقبولیت حاصل کر چکا ہے تو غور کرنا چاہیئے کہ وہ سوسائٹی پر کیا اثر ڈال رہا ہے۔

سینما میں ہر وقت دو چیزیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک اچھا اور ایک بُرا۔ ہر ذی فہم اس سے سبق سیکھ سکتا ہے انسان فطرتاً کسی خبر کے پڑھنے سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ اس کو عملی جامہ پہنا کر سامنے پیش کرنے سے متاثر ہوتا ہے سینما میں عشق و محبت کی داستانیں بتائی جاتی ہیں تو ساتھ ہی اس کا نتیجہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کا نتیجہ وہ ہوا۔ ان باتوں کے سمجھنے کے لئے تعلیم یافتہ ہی رہنا ضروری نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو تھوڑی بہت عقل رکھتا ہے ان باتوں کو

سمجھ سکتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھنے سے ہر ایک کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔

سعدی سے لوگوں نے پوچھا "ادب از کہ آموختی" گفت "از بے ادبان" ہر وہ حرکت جو ان کی ناگوار گذرتی اس سے پرہیز کرتے۔ بشریت کا تقاضا ہے۔"

سینما بھی حقیقت میں اچھی چیز ہے مگر اس کے دیکھنے والے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ چمگادڑ کو دن میں دکھائی نہیں دیتا۔ سورج دنیا کو اپنی منور کرنوں سے روشن کرتا ہے اگر چمگادڑ اس سے فائدہ نہ اٹھائے تو وہ ان کا قصور ہے نہ کہ سورج کا۔ اسی طرح سینما سے لوگ فائدہ نہ اٹھائیں اور سبق نہ سیکھیں تو دیکھنے والوں کا قصور ہے نہ کہ سینما کا۔

بہت سے لوگ تو سینما کو بطور تفریح دیکھتے ہیں، ان کا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا۔ بہت سے نوجوان تو محض ایکٹریس کے دیکھنے کیلئے جاتے ہیں۔ کوئی نسیم کا دلدادہ ہے تو کوئی سائگل کے گانوں کا دیوانہ۔ کوئی سردار اختر کا پروانہ۔ لڑکوں ہی پر منحصر نہیں، لڑکیاں بھی ان کے دوش بدوش قدم بڑھا رہی ہیں جس سے ان کی متانت وقار اور نسوانی شرافت کو ٹھیس لگتی ہے۔

سینما جانے سے پیشتر پوچھا جاتا ہے کہ کیا سائگل گا رہا ہے؟ کیا نسیم کوئی پاٹ ادا کر رہی ہے؟ جب سنا لیا کہ وہ گا رہا ہے اور وہ پاٹ ادا کر رہی ہے تو اوچھل پڑے۔ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ واپس آئے گانے کی نقل شروع ہوئی، کچھ دلچسپ گفتگو جو ہیرو ہیروئن کے درمیان ہوئی دھرائی جانے لگی۔ حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کیا قصہ تھا۔ اس کا مطلب کیا تھا۔ اس سے کیا سبق سیکھا جا سکتا ہے وہ صرف سطحی چیزوں کو دیکھا کرتے ہیں وہ لوگ جن کی عقلیں پختہ نہیں خود بھی ویسی ہی حرکتیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی کی نقل بھی کریں تو دیکھ سمجھ کر کہ آیا یہ ہمارے لئے موزوں ہے یا نہیں۔

خیر عورتیں تو ناقص العقل کہلاتی ہیں۔ مرد آدمی جو اپنی عقل و شعور پر نازاں ہیں سینما دیکھتے ہیں اور اپنے میں بھی نزاکتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ باہر جانے کے ایک گھنٹہ پیشتر بناؤ کیا جاتا ہے۔ بالوں کو آئینہ دیکھ دیکھ کر سنوارا جاتا ہے۔ پھر کپڑے پہنے۔ آئینہ میں سراپا دیکھا۔

نگاہ ان کی نخوت کے زینہ پہ تھی   جو شانے سے اتری تو سینہ پہ تھی

لباس کی بناوٹوں کے ساتھ بات میں بھی بناوٹیں اور نزاکت پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے ایک واعظ نے اپنے وعظ میں کیا خوب فرمایا ہے۔ ؎

ناز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں
آج کل لڑکے نظر آتے ہیں مجھ کو لڑکیاں

بڑے لوگ سینما دیکھتے ہیں۔ مگر ظاہری طور پر کچھ متاثر ہوتے نظر نہیں آتے۔ سینما دیکھے وہیں قصہ ختم۔ پھر نہ اس کا ذکر نہ اوس کے کسی اچھے پہلو پر غور کرنے میں شائد ہی سو میں ایک آدمی ہوگا جو اس کی خوبیوں کو دیکھتے۔ مگر ہماری نظر میں تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔

اگر سینما دیکھنے والے اپنا مطمح نظر بدل دیں اور صرف نصیحتیں اور سبق سیکھنے کے خیال سے دیکھیں تو ضرور سینما بینی سوسائٹی پر اپنا اچھا اثر ڈالے گی۔ شرط یہ ہے کہ فلم کو چشم بصیرت سے دیکھیں اور سطحی چیزوں کو نظر انداز کر دیں۔ مگر فی زمانہ تو اس کا کوئی اچھا اثر ہمیں نظر نہیں آتا۔

مشترکہ خاندان

رحیم النساء سبحانی

ہندوستانی گھرانوں میں یہ بات ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور باوجود تعلیم کے ابتک اس مرض کا علاج نہ ہوسکا ایک کمائے اور دس کھائیں۔ مثلاً ایک گھر کا نقشہ آپکے سامنے پیش کرتی ہوں۔ جہاں دیور، دیورانی، جیٹھ، جٹھانی، بہنیں، بھائی، ساس، سسر، اور اگر بڑے لڑکے کی شادی ہوگئی تو ایک بیوی الگ۔ پھر درجن بھر بچے۔ سب کے الگ۔ اب آپ ہی غور کریں کہ اس گھر کا انتظام کس طرح ہوسکیگا۔ نہ آپ اپنی اولاد کی تعلیم دلواسکتے ہیں اور نہ اوس کی پرورش اچھی طرح کرسکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ صحت کا دارومدار غذا پر ہوتا ہے۔ اگر آپ اتنے قافلہ کا اسی طرح خیال کریں تو دوسرے دن قرض کی نوبت آجائے۔

جب تک کہ لڑکا نوکر نہ ہوجائے ماں باپ کو ہرگز ہرگز شادی نہیں کرنی چاہئیے ہر انسان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔ اپنی آمدنی کے لحاظ سے گھر کا نظام اوقات تیار کریں اور اپنی چادر دیکھکر پاؤں پھیلائیں۔ ہر انسان کی طبیعت مختلف ہوتی ہے اور پھر ایک جگہ کا قیام تو اور بھی تکلیف دہ ہے۔

شادی کے بعد والدین کو بہ خوشی اپنے لڑکے کو الگ کردینا چاہئے۔ ایک جائی صحت کے لئے بھی مضر ہے، اور ایک گھر میں اتنے قافلہ کی زندگی اصول صحت کے بالکل منافی ہے۔

جتنے واقعات ہم سنتے اور دیکھتے آئے ہیں ایک ذرا سی غلطی پر اپنی اولاد کی زندگی پر بھینٹ چڑھاتے ہیں کاش کہ

ہمارے بزرگ غور کریں۔

اگر کسی نے ایسے خاندان سے بغاوت کی تو وہ باتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور الگ ہونا ان کے نزدیک بہت عیب سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہکر الزام دیا جاتا ہے کہ اسے اپنے لوگوں کی پرواہ نہیں۔ مگر والدین کو اگر ایسا خیال ہے تو وہ اپنی اولاد کی ہرگز ہرگز شادی نہ کریں۔ کیونکہ لڑکے میں اپنے پاؤں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں۔

میاں بیوی کی نااتفاقی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ جو آپس کے تعلقات خراب کر دیتی ہے۔ مثلاً میاں چاہتے ہیں کہ ہر کام وقت سے ہو۔ اور گھر صاف ستھرا رہے اور اپنی مرضی سے ہر کام کرانا چاہتے ہیں۔ مگر غور کیجئے کہ اتنے لوگوں میں نہ تو صفائی رہ سکتی ہے اور نہ ہر کام اصول اور وقت سے انجام پا سکتا ہے۔

میاں صاحب اگر عقل والے ٹھیرے تو وہ بیوی کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں، ورنہ بیوی ان کی نظر میں پھوہڑ اور بدسلیقہ ٹھیرائی جاتی ہے۔

غرض کہ یکجائی ہر باتوں کی جڑ بن کر زندگی عذاب بنا دیتی ہے۔

آپ کی رائے درکار ہے؟

شہاب ناہید کے مقبولیت کی یہ کھلی دلیل ہے کہ جس کثرت سے ملک کی تعلیم یافتہ خواتین اپنے افکارات بھیج رہی ہیں اور ہم کو ندامت ہوتی ہے کہ تنگی دامن کی وجہ بیشتر مضامین وقت پر شائع نہیں ہوتے اور ہر نگارندۂ مضمون کی یہ فطرتی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مضمون جلد نکل جائے لیکن جوبات اپنے بس کی نہ ہو اوس کیلئے ہم درماندہ اور عاجز ہیں۔ ابتک تو خیال یہ تھا کہ کاغذ ارزاں ہو جائے گا، اگرچیکہ اپنا ملکی کاغذ بازار میں آچکا ہے اور آپ ناہید کو جس کاغذ پر چھپا ہوا دیکھ رہے ہیں وہ 'سرپور' کا ہی مگر جنگ کے باعث ملکی کاغذ بھی جس دام پر فروخت ہو رہا ہے وہ جنگ سے پہلے کے دام سے چہار چند زیادہ ہے پھر فرمائیے کہ کوئی مرتب پرچہ اپنی مشکلات پر کیونکر قابو پا سکیگا۔ بیشتر خواتین کا اصرار ضخامت اور قیمت کے اضافہ پر ہی مگر ہم انکے موئد نہیں اگرچیکہ 'گراں بہ حکمت' کا فلسفہ نمایاں ہے لیکن 'ارزاں بحکمت' میں کشش جو ہے وہ کسی اور میں دکھائی نہیں دیتی اسلئے سوچتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کیوں شہاب ناہید کو ہفتہ وار پرچہ بنا دیا جائے جس میں ہفتہ وار خبروں کے سوا دلچسپ مضامین اور دنیائے نسواں کے حالات رہینگے۔ ایک ہفتہ وار پرچہ کیلئے علحدہ چندہ لازمی ہوگا، اور شہاب ماہوار حسب سابق جاری ہوتا رہے گا البتہ آپکے دلچسپی پر منحصر ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو پسند فرمائیں اس طرح شہاب بالکل حضرات کیلئے وقف رہیگا اور شہاب ناہید خواتین کیلئے مختص ہو جائے گا۔ اور آپ پہلے سے زیادہ داد نگارش دے سکیں گی۔ بہرحال آپ اپنے ارادہ سے اطلاع دیں تو اسکا تصفیہ ہو سکیگا اسکے لئے فی الحال سالانہ چندہ چھ روپیہ درکار ہونگے اگر دو سو خریدار پذیرائی کیلئے آمادہ ہوں تو کوشش کی جائے گی۔

ایک عزیزہ کے شادی کے وقت

جہانِ شوق میں اک انقلاب آیا ہے
ہر ایک پھول پہ رنگ شباب آیا ہے

دلوں سے دور ہوا اضطرابِ تنہائی!
حریم ناز میں ہے شوق کی پذیرائی

خلوص و چاہ کے ارمان بے نقاب ہوئے
زہے نصیب مجسم لطیف خواب ہوئے

چھڑے ہوئے ہیں فضاؤں میں دلنشین نغمے
نشاط و کیف میں ڈوبے ہوئے حسین نغمے

سرور و کیف کی دنیا بسائی جاتی ہے
کھلے ہیں پھول۔ فضا مسکرائی جاتی ہے

یہ آرزو، یہ خوشی، یہ بہار کیا کہنا
ہر ایک ذرہ ہے خورشید وار کیا کہنا

پیام زندگی خوشگوار ہے شادی
محبتوں کی مکمل بہار ہے شادی

یہی ہے اصل میں آغاز زندگانی کا
یہی ہے راز حقیقت میں کامرانی کا

سنا رہی ہے زبیدہ خوشی کا افسانہ
سجا رہی ہے وفا آرزو کا کاشانہ

مسرتوں کا خزینہ یہ عشرت شیادی
مبارک آپ کو خورشید خانہ آبادی

خدا کرے کہ یہ روز سعید راس آئے
خدا کرے کہ یہ دورِ جدید راس آئے

نشاط و عیش و طرب کا جہاں مبارک ہو
محبتوں کا تمہیں آسمان مبارک ہو

نگاہِ شوق میں یک کیف نگاہ بن کے رہو
حریف جلوۂ صد مہر و ماہ بن کے رہو

رگ حیات میں ہنگامۂ محبت ہو
ہر ایک سانس تمہارا پیام راحت ہو

سدا چمن میں سراپا بہار بن کے رہو
جہانِ عشق کے پروردگار بن کے رہو

زبیدہ بیگم قریشی

جمالِ ناز ہے گوہر فشاں مبارک ہو
بہار عیش ہے رسد فشاں مبارک ہو

فضا میں تیرتے پھرتے ہیں نغمہائے لطیف
ہر ایک شوق ہوا کامراں مبارک ہو

ضیائے جلوۂ خورشید و نور ماہ منیر
یہ رنگ خاص ہے بزم جہاں مبارک ہو

خلوص و چاہ کا عنوان مل گیا جس کو
سرور و کیف کی وہ داستاں مبارک ہو

ادھر ترانۂ عشرت چھڑا ہے پھولوں میں
سنا رہی ہے ادھر کہکشاں مبارک ہو

محبتوں کی حسین لطیف باتوں کے
یہ نجوم ہوئے راز داں مبارک ہو

ہر ایک سانس گلستاں بدوش آئی ہے
ہر ایک امید ہے آرام جاں مبارک ہو

یہ شادی طرب انگیز تم کو راس آئے
نیاز و ناز کا یہ امتحاں مبارک ہو

فضائے دہر منور ہے کتنی نورانی
نئی زمین ہے نیا آسماں مبارک ہو

یہ عیش تم کو سدا سازگار بن جائے
ہر ایک سانس نسیم بہار بن جائے

نورانی قریشی

محمودیہ پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر
شہاب
بیرون دبیر پورہ حیدر آباد دکن
سے
شائع ہوا۔

شہاب

جلد (۱۰) شہریور ۱۳۵۱ ف م جولائی ۱۹۴۲ء نمبر (۱۰)

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (عنا)

غزل

جناب مسلم صاحب حیدرآبادی

تیری کائنات حسیں بھی ہو تو میں کائنات کو کیا کروں
تیری ذات سے مجھے کام ہے میں تیری صفات کو کیا کروں

جو نقی کے پردہ سے ہو عیاں جو عدم کے پردہ میں ہو نہاں
یہ حیات کاہے کو شعبدہ ہے میں اس حیات کو کیا کروں

تیری یاد میں تو تمام دن مجھے آہ و زاری سے کام ہے
نہ پھروں جو تیری تلاش میں تو بتا میں رات کو کیا کروں

نہ اسیرِ قیدِ مکاں ہوں میں نہ تو پائے بند زماں ہوں میں
مجھے شش جہات سے کام کیا میں تعینات کو کیا کروں

تیری سرد مہری کا غم نہیں تیری بے رخی کا الم نہیں
مئے بیخودی مجھے چاہیئے تیری التفات کو کیا کروں

کہا میں نے مسلمِ زار کب مجھے راہ راست پہ لائیے
جو رہینِ منتِ خضر ہو تو رہ نجات کو کیا کروں

نظیر اکبر آبادی

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے

ان کا نام شیخ ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ دہلی میں ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے کہ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اس کی لپیٹ میں ان کا خاندان بھی آگیا۔ اس کے بعد ہی ان کے والد محمد فاروق نوکری کی تلاش میں پٹنہ گئے اور وہیں ختم ہو گئے۔ اور اس طرح نظیر، ان کی ماں اور نانی دہلی میں بے یار و مددگار رہ گئے۔ ابھی اس مصیبت سے یہ لوگ نہیں سنبھلے تھے کہ دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے۔ اس نے ان کے اور بھی رہے سہے ہوش بھی کھو دئے اور نظیر اپنی نانی اور ماں کے ہمراہ ۱۱۷۰ء میں دہلی سے نکل کر آگرہ پہنچے اور تاج گنج کے پاس ایک مکان لیکر رہے اور بچوں کو پڑھانے لگے ستر روپیہ مہینہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور اسی پر اس خاندان کی گذر اوقات تھی لیکن باوجود اس تنگدستی کے قناعت کا یہ عالم تھا کہ واجد علی شاہ نے لکھنؤ بلایا یہ نہیں گئے۔ راجہ بھرت پور نے بلایا نہیں گئے۔ آگرہ کے چھوٹے سے مکان میں، ستر روپیہ تنخواہ پر ساری عمر گذار دی۔ صحن میں دو بیری کے درخت تھے وہی ان کے ڈرائنگ روم اور آفس روم تھے۔ اس کے نیچے بچوں کو پڑھایا۔ شاگردوں کو اصلاح دی، وہیں اپنا کلام مرتب کیا۔ وہیں ۱۲۴۶ھ میں مرے اور وہیں ان درختوں کے نیچے دفن ہوئے۔

شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس کے متعلق نہ صرف نقادان فن بلکہ عام لوگوں کی اس قدر متضاد رائیں ہوں جتنی نظیر کے متعلق ہیں۔ اگر ایک طرف اس کو اتنا بڑھایا جاتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا جاتا ہے تو دوسرے طرف اتنا گرایا جاتا ہے کہ شاعروں کی فہرست ہی سے نکال دیا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اردو کے شاعر جس ڈگر پر چلتے رہتے ہیں اور چل رہے ہیں اس کو نظیر نے چھوڑ کر اپنا ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔ اور ایسی معمولی معمولی چیزوں پر اس نے نظمیں کہی ہیں جن کی طرف ایک ایسے شاعر کے سوا جس نے فطرت کا مطالعہ پورے غور سے کیا ہو۔ دوسرے کسی شخص کی نظر کا جانا دشوار ہے۔

آج کل شاعر کا رتبہ دو باتوں سے قایم کیا جاتا ہے۔ ایک تنوع مضامین سے۔ دوسرے ان الفاظ کی تعداد سے جو اس نے موقع اور محل سے استعمال کئے ہیں۔ اگر پہلے معیار سے دیکھا جائے تو واقعی دنیا کا کوئی شاعر نظیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر دوسری میزان میں تولا جائے تو کم سے کم اردو کا تو کوئی شاعر اس کے مقابل نہیں آسکتا۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظیر آٹھ زبانیں (عربی۔ فارسی۔ اردو۔ پنجابی۔ برج۔ بھاشا۔ مارواڑی۔ پوربی۔ ہندی)

جانتا تھا اور ایسی جانتا تھا کہ ان میں شعر کہہ سکتا تھا۔ اس کو نظیر کے قلم کا زور کہنا چاہیئے کہ اکثر نئے الفاظ محض اس کی نظموں کی وجہ سے زبان اُردو میں آگئے ہیں۔

وہ نظم کی طرح نثر لکھنے میں بھی استاد تھا۔ چنانچہ اس کی آٹھ کتابیں نثر میں ہیں ان میں سے اکثر میں اس نے ہندوستان کے میلوں کی کیفیت۔ یہاں رسوم کی حالت اور بچوں کو پڑھانے کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں اور جا بجا اشعار دے کر اپنی نثر میں بہت کچھ دلکشی پیدا کر دی ہے۔ نظم میں اس کا ایک کلیات اردو تقریباً (۶۰۰) صفحے کا ہے جس کو اورنگ آباد کالج کے پروفیسر شہباز نے ترتیب دیا ہے۔ دو اردو کے دیوان تقریباً (۴۰۰) صفحے کے ہیں اور ایک فارسی کا دیوان ہے۔ اس کے علاوہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا کتنا کلام ضائع ہو گیا۔ کیونکہ نہ تو اس کو اپنے کلام کے جمع کرنے کا شوق تھا اور نہ موقع۔ وجہ یہ تھی کہ کوئی بچہ آیا اپنے مطلب کی نظم لکھوا کر لیگیا۔ کوئی فقیر آیا صدا لکھوا کر لیگیا۔ غرض ہر طرح کے لوگ آتے اور اس سے کچھ نہ کچھ لکھوا کر لیجاتے۔ بھلا ایسے آدمی کا کلام جمع کس طرح ہو سکتا ہے۔

شاعر اس وقت بڑا ہو سکتا ہے جب اس کے خیالات میں وسعت ہو اور تعصب نے اس کی نظر کو تنگ نہ کر دیا ہو۔ نظیر گو اعتقاداً شیعہ تھا مگر اس کے دل میں ہر مذہب کے بزرگوں کیلئے گنجائش موجود تھی۔ چنانچہ ہندوستان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ جس کے بزرگوں کی اس نے تعریف نہ کی ہو اور دل سے تعریف نہ کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عادات اخلاق کے دوست دشمن سب معترف تھے وہ ایک آزاد شخص تھا۔ اسلئے دنیا سے بے نیاز تھا۔ تمام عمر نہ اس نے کسی کی مدح کی اور نہ ہجو۔ اس کو دوستی کا بڑا پاس تھا۔ اور اس کی صحبت میں بڑے چھوٹے کا فرق مٹ جاتا تھا۔

یہ مضمون میرے اس اردو مضمون کا ایک مختصر خلاصہ ہے جو میں نظیر اور اس کی شاعری پر لکھ رہا ہوں، چونکہ گنجائش کم ہے اسلئے یہاں نظیر کے کلام پر تفصیل سے نظر ڈالنے یا اس کے مختلف رنگوں کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کا موقع نہیں ہے اس لئے میں اختصار کے ساتھ اس کے کلام کو بھی پیش کرتا ہوں جس طرح اس کے زندگی کے حالات کو اجمال کے ساتھ اوپر بیان کیا آیا ہوں تاکہ جس طرح ایک مختصر سا نقشہ اس کے حالات کے متعلق آپکے سامنے آگیا ہے۔ اسی طرح اس کی شاعری کی ایک نامکمل تصویر بھی آپکے سامنے آجائے اور آپ کچھ تو سمجھ سکیں کہ نظیر کیا تھا۔ اور اس کی شاعری کیسی تھی۔

اس کی شاعری کیا ہے۔ زندگی انسانی کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کیا ہے اور کیسی ناپائیدار ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ پیدا ہونے سے مرنے تک انسان اپنی زندگی کیسے گذارتا ہے اور اس کو کس طرح گذارنی چاہیئے۔ وہ خوش مذاقی کا ماہر ہے اسلئے مذاق ہی مذاق میں انسانی کمزوریوں کا خاکہ اڑاتا ہے۔ کبھی ہنساتا ہے۔ کبھی رُلاتا ہے۔ اور اس طرح اصلاح حال انسانی کا جوش وہ لے کر آیا تھا اس کو پورا کر جاتا ہے۔ تو لیجئے پہلے اس کے "آدمی نامہ" ہی کو لیجئے۔ لکھتا ہے:

دنیا میں بادشاہ ہے سو وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو وہ بھی آدمی

اس طرح آدمیوں کی قسمیں گنوا تا چلا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھاتا گیا ہے کہ بڑے ہو کر اپنے سے چھوٹوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو اور غریب ہو کر امیروں کے سامنے ہاتھ نہ جوڑو کیونکہ وہ بھی آدمی ہے اور تم بھی آدمی ہو اسی سلسلہ میں مذاق پر اتر آتا ہے اور لکھتا ہے :-

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یہاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قرآن یہاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو وہ بھی ہے آدمی

وہ کہتا ہے کہ گو تم اشرف المخلوقات ہو۔ مگر اس پر ناز نہ کرو۔ کیونکہ تم مٹی سے بنے ہو اور ایک دن تم کو مٹی میں ملجانا ہے۔ یہ رنگ ملاحظہ ہو۔

کیا ہندو۔ کیا مسلماں۔ کیا زند و گبر کافر
نقاش کیا مصور۔ کیا خوشنویس شاعر
جتنے نظر ہیں یہاں ایک دم کے ہیں مسافر
رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطر یہاں گھر ہوا تو پھر کیا

اور اس مضمون کو خوش مذاقی میں یوں ادا کرتا ہے :-

گیسو بڑھا کے کوئی مشائخ ہوا میاں
یا بہنوا ہو کوئی ہوا خر منڈا یہاں
جب مرشد اجل کا قدم آیا درمیاں
کوئی تو لمبی ڈاڑھی لئے ہو گیا رواں
موچھیں بھوین تلک کوئی منڈوا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر ایک آکے مر گیا

دنیا کی اس بے ثباتی کو اس نے اپنی دو نظموں میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان میں ایک تو بنجارہ نامہ ہے اور دوسری ہنس نامہ۔ ایک میں انسان کو ایک بنجارہ سے اور دوسری میں ہنس سے تشبیہ دیکر بتایا ہے کہ کس طرح انسان اس دنیا میں آکر روپیہ جمع کرنے اور عیش سے زندگی بسر کرنے کے جتن کرتا ہے۔ اور کس طرح وہ چلا جاتا ہے اور یہ مال و منال یہیں پڑا رہ جاتا ہے۔ بنجارہ نامہ میں لکھتا ہے :-

ٹک حرص وہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا

ہنس نامہ میں روح کو ایک ہنس سے تشبیہ دے کر بیان کیا ہے کہ کس طرح یہ روح جسم انسانی (یعنی درخت پر) میں آ لکھتا ہے :۔

آیا تھا کسی شہر سے ایک ہنس بچارا ایک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اس کا گذارا
رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر اُس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

کس طرح اس درخت کے پرندوں (یعنی اعضا و جوارح نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور مل جل کر رہنے لگے۔ اس درخت سینکڑوں جانوروں کے نام جس طرح اس نے بیان کئے ہیں وہ بس نظیر کا ہی حق ہے۔ لکھتا ہے :۔

کچھ سبزک و بڑنکے و کچھ ٹنٹنی و بزے پنڈخی سے لگا یو بڑ و قمری و ہریوے
غوغائی۔ پکھیری و لٹورے و پپیہے کچھ لال چڑے۔ پوذنے۔ پدے ہی نہ خوش تھے

پڈری بھی سمجھتی تھی اسے آنکھ کا تارا

کس طرح اس کے جانے کا زمانہ آیا۔

اس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے ایک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا
لو یاروں ہم اب جائینگے کل اپنے وطن کو اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

یہ سنتے ہی سب پرندوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔

اس میں جو شب کوچ کی ہوئی صبح نمودا پر اپنا ہوا پر وہیں اس ہنس نے مارا

دوسروں نے بھی ساتھ دیا۔ مگر تھک کر رہ گئے اور روح جہاں سے آئی تھی وہاں پہنچ گئی

سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیرآہ آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

ایک تو زندگی ناپائیدار اور اس پر غضب یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور ٹھکانے لگانے کی فکر میں ہے۔

چڑیا نے دیکھ غافل کیڑا ادھر گھسیٹا کوّے نے وقت پاکر چڑیا کا پر گھسیٹا
چیلوں نے مار پنجے کوّے کا سر گھسیٹا جو جس کے ہاتھ آیا وہ اس نے دھر گھسیٹا

ہشیار رہا ئے یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

جب یہ حالت ہے تو یہاں اپنی زندگی کیونکر گذارنی چاہئیے - اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہئیے - اور آبرو اور تندرستی کو سب پر مقدم سمجھنا چاہئیے

گر اس نے اڑھایا تو لیا اوڑھ دوشالہ | کمل جو دیا تو وہی کاندھے پہ سنبھالا
چادر جو اٹھائی تو وہی ہو گئی بالا | بند ہوائی لنگوٹی تو وہیں ہنس کے کہا لا
پوشاک میں دستار میں رومال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

عاجز ہو یا فقیر ہو پر تندرست ہو | بے زر ہو یا امیر ہو پر تندرست ہو
قیدی ہو یا اسیر ہو پر تندرست ہو | مفلس ہو یا فقیر ہو پر تندرست ہو
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہیں سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اور ہر ایک کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا چاہئیے - کیونکہ جو کسی کو نقصان پہنچائیگا وہ خود نقصان اٹھائیگا -

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے | نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میو کھلا میو ملے پھل پھول دے پھل پات لے | آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ - یہاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

یہ تو ہوئی زندگی کی داستان اور اس کو گذارنے کا طریقہ - اب اس کے بعد زندگی کے تینوں زمانوں بچپن - جوانی اور بڑھاپے کو لیجئے - کہتا ہے -

کیا دن تھے یارو وہ بھی تھے جبکہ بھولے بھالے | نکلا تھی دائی لیکر پھرتی کبھی دوا لے
چوٹی کوئی رکھالے بدّھی کوئی پہنا لے | ہنسلی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھا لے
موٹے ہوں یا کہ دبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اس کے بعد آئی جوانی یہ رنگ ہی دوسرا ہے۔ اور اس رنگ پر نظیر نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ باغ میں کرسی بچھا کر تنہائی میں پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں اسلئے پڑھنے سے ڈرتا ہوں کہ جوانی کی یاد کہیں اس عمر میں مجھ جیسے کی طبیعت نہ بگاڑ دے۔

اللہ نے جوانی کا وہ عالم ہے بنایا ۔۔۔ جو کہیں عاشق کہیں رسوا کہیں شیدا
پھندے میں کہیں جی ہے کہیں دل ہے تڑپتا ۔۔۔ مرتے ہیں سسکتے ہیں بلکتے ہیں آ ہا ہا
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

اس زمانہ میں جو جو شوق ہوتے ہیں ان کو نظیر نے بہت تفصیل کیساتھ بیان کیا۔ کہیں پتنگ اڑ رہے ہیں، کہیں کبوتر بازی ہو رہی ہے۔ کہیں تیراکی کا زور ہے۔ غرض جوانی کا کوئی شوق نہیں جس کے متعلق نظیر نے نہ لکھا ہو اور بہت کچھ نہ لکھا ہو نمونے کے طور پر میں تیراکی کا صرف ایک بند دیتا ہوں۔ دیکھئے اس نے ایک بند میں تیراکی کی کتنی قسمیں بیان کر دی ہیں:۔

برسات میں جو آ کر چڑھتا ہے خوب دریا ۔۔۔ ہر جا کھڑی و چادر بند اور ناند چکوا
مینڈا۔ بھنور۔ اچھالن۔ چکر سمینٹ مالا ۔۔۔ میدا گھمیر۔ تختہ۔ کشتی پچھاڑ گرا
واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار تیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا۔ اے یار تیرتے ہیں

جوانی میں آیا شادی کا زمانہ۔ اس بارے میں نظیر نے مہادیو جی کا بیاہ لکھا ہے۔ ذرا برسات کا رنگ ملاحظہ ہو۔ بھلا مہادیو جی کے براتی ایسے نہ ہوں گے تو کیسے ہوں گے۔

پھر اور ہزاروں ساتھ چلے جو بھوت پریت اور راکھس تھے ۔۔۔ ڈیل اور پنچے اُنکے برج سمن اور بس بھی ان کے گھسن تھے
ہر پگڑ ان کا سو من کا اور موٹے رسوں کے پٹکے ۔۔۔ اور پگڑوں پر طروں کی طرح تھے سانکھو بر کے بر رکھے
کوئی ننگے سر وہ بال اس کے جو نانس پڑے دس دس گز کے ۔۔۔ کوئی منڈ کوئی رنڈ اور کوئی من پاؤں نلچے اچھلے کودے
کوئی ہاتھی رکھے کاندھے پر کوئی اونٹ بغل میں دبکائے ۔۔۔ کوئی ارنہ بھینسہ گود لئے کوئی گینڈا سر پر بھٹلائے
کوئی سانپ گلے میں لپٹائے پھن اسکے دم پر دم چوسے ۔۔۔ کوئی لمبے سونٹے لوہے کے کچھ ہاتھ لئے بھاری لکڑے
کوئی گا دے پہاڑ گلا اپنا کوئی نرت کرے چک پھیری لے ۔۔۔ کوئی شور کرے خوشحالی سے یوں جیسے ہاتھی چنگھاڑے
کوئی ہاتھ نچا دے رہ رہ کر کوئی نین خوشی سے مٹکائے ۔۔۔ کوئی لمبے لمبے ڈگ رکھے کوئی دس دس گز کی جست کرے

کچھ رنگ عجب کچھ ڈھنگ نئے سب بن ٹھن دھج دکھلاتے تھے
تھے دھوم مچاتے رستہ میں ہر آن اچھلتے جاتے تھے

نظیر نے ہندوؤں کے رسوم اور اون کے اوتاروں کے متعلق بہت نظمیں لکھی ہیں لیکن ان سب میں یہ التزام رکھا ہے کہ وہ ایسی زبان میں لکھی جائیں کہ ان میں ہندی کے الفاظ زیادہ اور دوسری زبانوں کے الفاظ کم سے کم آئیں چنانچہ آپنے دیکھ لیا کہ اوپر والے بند میں بمشکل چار پانچ لفظ فارسی کے آئے ہیں۔

اس کے بعد رہ ہی کیا جاتا۔ پس وہ زمانہ جو آکر نہیں جاتا۔ بڑھاپے پر نظیر کی بیسیوں نظمیں ہیں اور ہر ایک میں خوش مذاقی کا رنگ ہے۔

گر حرص سے ڈاڑھی کو خضاب اپنی لگاویں	جہری جو پڑی منھ پہ اسے کیونکر مٹاویں
گو مکر سے ہنسیے کے تئیں دانت بدھاویں	گردن جو پڑی ہلتی ہے کیا خاک چھپاویں

ہر چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا

نقلیں کوئی ان پوپلے ہونٹوں کی بناوے	چل کر کوئی کبڑے کیطرح قد کو جھکاوے
ڈاڑھی کے کنے انگلی کو لالاکے نچاوے	یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھاوے

ہر چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا

یہ تو ہوئی بچپن۔ جوانی اور بڑھاپے کی تفصیل۔ اس کے علاوہ نظیر کا جو کلام ہے اس میں اس نے ایسے نقشے دکھائے ہیں جن کا لطف بچے۔ جوان اور بوڑھے سب ہی اٹھاتے ہیں۔ پہلے موسموں کو لیجئے۔ نمونہ کے طور پر ہر موسم کے متعلق ایک ایک بند دیتا ہوں تاکہ نظیر کا یہ رنگ بھی معلوم ہو جائے۔ پہلے جاڑے کو لیجئے۔

جب باد کا جھکڑ چلتا ہو۔ اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا	اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا	ہو ہاتھ میں پیالا شربت کا ہو سامنے ایک فراش کھڑا

فراش بھی پنکھا جھلتا ہو پھر دیکھ بہاریں جاڑے کی

یہ بند خوش مذاقی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اگر گرہ میں یہ کہتا کہ "پھر دیکھ بہاریں گرمی کی" تو ایک معمولی بات ہو جاتی۔ صرف گرمی کی بجائے "جاڑے" کا لفظ لاکر ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس کے بعد آئی گرمی۔ اس میں آندھی کا رنگ دیکھئے کسی نے بھاگ کر جلدی سے جا گھر کا لیا انگن

گرا کوئی گڑھے میں اور کوئی بھاگا کہیں دشمن	کسی کے چھن گئے کپڑے اچکوں کی گئی وہاں بن

کسی کی اڑگئی پگڑی کسی کا پھٹ گیا دامن		گئی ڈھال اور کسی کی گر پڑی شمشیر آندھی میں

گرمی سے ہر ایک نڈھال ہے کوئی پیاس بجھانے کو ککڑیاں کھا رہا ہے، کوئی تربوز منگوا رہا ہے، جو غریب ہیں وہ کورے برتن کا ٹھنڈا پانی پی رہے ہیں۔ بہت سے لوگ بھنگ سے اس گرمی کا علاج کر رہے ہیں۔ ان مضمونوں میں سے ہر ایک پر نظیر نے بہت کچھ لکھا ہے۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ موسم بھی گذرا اور برسات آئی۔

کوچہ میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا		کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا

رستہ کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا		اس سب جگہ کے گرنے سے جو بچ کے آ گیا

وہ اپنے گھر کے صحن کے اندر پھسل پڑا

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آکے جھڑ لگا		سنئے جدھر۔ ادھر سے دھڑاکے کی ہے صدا

کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا		کوئی کہے ہے ہائے کروں میں تباؤ کیا

تم در کو جھینکتے ہو میرا گھر پھسل پڑا

انہی موسموں میں ہندو مسلمانوں کے میلے بھی آئے۔ دیوالی کا زمانہ ہے۔ گھر گھر چراغ جل رہے ہیں، جوئے کا زور ہے۔

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری		جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری

کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری		کسی نے اپنی پڑوسن کی گٹھڑی لا ہاری

یہ ہار جیت کا چرچہ پڑا دیوالی میں

اس کے بعد آئی ہولی۔ گرمی جاڑے گلے مل رہے ہیں۔ لوگوں میں جوش بھرا ہے۔ ہولی پر نظیر کی بہت نظمیں ہیں اور ہر نظم جوش میں بھری ہوئی ہے۔ ان نظموں میں الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں کہ ہولی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

اب اس مہینے میں پہنچا ہے یہاں تک تو حال		فلک بھی جامہ پہن سرخی شفق سے لال

بنا کے چاند کے سورج کے آسمان پر تھال		فرشتے کھیلے ہیں ہولی بنا عبیر و گلال

تو آدمی کا بھلا کیا شمار ہولی میں

جا بجا ناچ ہو رہے ہیں۔ ذرا غور سے آنکھیں بند کر کے سنئے۔ معلوم ہوگا کہ واقعی سامنے ناچ ہو رہا ہے۔ لفظوں سے ساز کا کام لیا ہے۔

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی		کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی

کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی اور منہ چنگ بجی　　کچھ گھنگرو کھٹکے چھم چھم چھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی

ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

اب دیکھئے ناچ کا نقشہ کس طرح لفظوں میں کھینچا ہے۔

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویوں کے لڑکے　　ہر آن کھڑے گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے

کچھ ناز جتا بائیں لڑ لڑکے۔ کچھ ہولی گا بیٹں اڑ اڑکے　　کچھ لچکے شوخ کمر پتلی کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھڑکے

کچھ کافرنین مٹکتے ہوں جب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس کے بعد مسلمانوں کے تہواروں کو لیجئے۔ روزے ختم ہوئے۔ عید کا چاند دکھائی دیا۔ اب کیا ہے۔

کوئی تو مست پھرتا ہے جام شراب سے　　کوئی پکارتا ہے کہ چھوٹے عذاب سے

کلہ کسی کا پھولا ہے لڈو کی چاب سے　　چٹخارے جیب بھرتی ہے نان و کباب سے

ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی

جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

خیر عید تو عید ہی ہے۔ شب برات کا زور بھی کچھ کم نہیں ہے۔ آتشبازی چھوٹ رہی ہے۔

چہرہ کسی کا جل گیا آنکھیں جھلس گئیں　　چھاتی کسی کی جل گئی باہیں جھلس گئیں

ٹانگیں بچیں کسی کی تو رانیں جھلس گئیں　　موچھیں کسی کی پھنک گئیں پلکیں جھلس گئیں

رکھی کسی کی ڈاڑھی پہ چنگاری شب برات

مگر صاحب بات یہ ہے کہ زندگی کا لطف اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب پیٹ بھرا ہو اور ہاتھ میں پیسہ ہے۔ اس پہلو پر بھی نظیر نے بہت کچھ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ہر شخص پیٹ کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

نٹ کھٹ۔ اچکے۔ چور۔ دغاباز۔ راہ مار　　عیار جیب کترے۔ نظر باز۔ ہوشیار

سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار　　کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار

بلی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لئے

اور سنئے :۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے

وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ایک اور رنگ دیکھئے :-

گالی و مار کھاتے ہیں کوڑی کیواسطے ، شرم و حیا اٹھاتے ہیں کوڑی کیواسطے

سو ملک چہاں آتے ہیں کوڑی کیواسطے ، مسجد میں دم کو ڈھاتے ہیں کوڑی کیواسطے

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں

کوڑی نہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

اگر کسی کے پاس کوڑی نہیں ہے تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل ، کوئی گدھا کہے اسے۔ ٹھہراوے کوئی بیل

کپڑے پھٹے تمام۔ بڑھے بال پھیل پھیل ، منہ خشک۔ دانت زرد۔ بدن پر جما ہے میل

یوں قیدیوں کی شکل بناتی ہے مفلسی

جس دن چلے کے اوپر دن مفلسی کے آئے ، پھر دور بھاگے اس سے سب اپنے اور پرائے

آخر کو مفلسی نے یہ دکھ اسے دکھائے ، کھانا جہاں تھا بٹتا وہاں جا کے دھکے کھائے

کمبخت کو جو کھانا اکثر ملا تو ایسا

مفلسی دور کرنے کا علاج نظیر یہ بتاتا ہے کہ خوشامد کرو۔ اور ہر ایک کی خوشامد کرو۔

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جا کے سلام ، وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام

بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام ، خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

نظیر نے آخر تمام اس پر توڑی ہے کہ دنیا ایک تماشا ہے اور اس کا سمجھنا مشکل ہے۔

زباں ہے جس کی اشارے سے وہ پکارے ہے ، جو گونگا ہے وہ کھڑا فارسی بگھارے ہے

کلاہ ہنس کی کوا کھڑا اتارے ہے ، اچھل کے مینڈکی ہاتھی کو لات مارے ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی ایک تماشا ہے

غرض دنیا ایک گورکھ دھندا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ انسان اگر ان کو سمجھ سکے تو پھر انسان ہی کیوں رہے۔

بڑے جھکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے

جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

اس کے علاوہ نظیر کا جو کلام ہے وہ یا تو تصوف میں ہے یا ہر مذہب و ملت کے بزرگان دین کے متعلق۔ لیکن عجیب بات یہ ہے مسلمانوں کے بزرگان دین کی بہ نسبت ہندو اوتاروں اور خاص کر کرشن جی پر اس کی نظمیں زیادہ اور بہت زیادہ ہیں۔ اس کا یہ کلام تقریباً ڈیڑھ سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ نمونہ کے طور پر بلدیو جی کے میلے کا ایک بند سن لیجئے۔

خلق آتی ہے سب جڑی جٹڑی — چیز رکھتے ہیں باندھ کر جکڑی

کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی — دوڑ یو چور لے چلا گٹھری

جیب کتری کہیں گئی پکڑی — کہیں لوٹی دوکان اور ہٹڑی

چور نے تاک لی کہیں پگڑی — سو تماشے ہنسی خوشی پھکڑی

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

آج بلدیو جی کا میلا ہے

نظیر کا کلام امیر اور غریب سب ہی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنی نظموں میں امیر اور غریب دونو کا پورا پورا رنگ دکھایا ہے۔ چنانچہ اپنی اکثر نظموں میں اس نے اگر ایک طرف امیروں کی شوکت و شان دکھائی ہے تو دوسری طرف غریبوں کی زدہ حالی۔

"برسات کی بہاروں" میں لکھا ہے۔

جو اس ہوا میں یار و دولت میں کچھ بڑے ہیں — ہے ان کے سر پہ چھتری۔ ہاتھی اوپر چڑھے ہیں

ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں — ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یاروں برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیا پکا پکایا کھانا — ان کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اٹھانا

ہے جن کو اپنے گھر کا کچھ نون تیل لانا — ہے سر پہ ان کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا

کیا کیا مچی ہیں یاروں۔ برسات کی بہاریں

شب برات کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔

دنیا کی دولتوں میں جو زردار ہیں بڑے — قندوں کے حلوے روغنی نانین کئی گھڑے

پھیلاتے خوان پھرتے ہیں نوکر کئی پڑے زندے بھی راہ تکتے ہیں مردے بھی ہیں کھڑے

ان خوبیوں کی رکھتی ہے تیاری شب برات

اور مفلسوں کی ہے یہ تمنا کہ خاتمہ درپا یہ جاکے دیتے ہیں بابا کی فاتحہ

بھٹیارے کے تنور پہ نانا کی فاتحہ حلوائی کی دوکان پہ دادا کی فاتحہ

یاں تک تو ان پہ لاتی ہے لاچاری شب برات

اسی رنگ کو نظیر اپنی "مفلسی" اور "دنیا بھی کیا تماشہ ہے" والی نظموں میں بہت گہرا کیا ہے۔

ابتک میں نے بعض نظموں کے جو نمونے دئے ہیں وہ بڑی لمبی لمبی ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ نظیر کے متعلق پرانے تذکرہ نویسوں نے لوگوں کے خیالات ایسے خراب کر دئے ہیں کہ کوئی اس بیچارے کی طرف نظر اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا ورنہ دیکھا جائے تو نظیر اپنے رنگ کا فرد فرید اور یگانۂ روزگار ہے۔

نظیر نے ہزل میں بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں مگر افسوس ہے کہ وہ اس کے کلیات سے نکال دیگئیں۔ قانون نے ادب پر یہ ایک بڑا ظلم کیا ہے۔

ممکن تھا کہ میں نظیر کی غزلوں پر بھی کچھ لکھتا اور یہ بھی بتاتا کہ اس نے اپنی تحریروں میں شاعری کی کتنی صنعتوں کا استعمال کیا ہے اور کتنی ایسی صنعتیں اردو شاعری میں داخل کی ہیں جو پہلے سے موجود نہ تھیں۔ مگر مضمون بہت بڑھ گیا ہے۔ اسلئے ختم کرتا ہوں۔

میرا مقصد اس مضمون کے لکھنے سے نظیر کا تعارف کرانا اور یہ دکھانا ہے کہ اس بیچارہ کے ساتھ ہم نے کتنی بڑی بے انصافی برتی ہے اور ایک ایسے شخص کو جو نہ صرف شعرا ہندوستان بلکہ دنیا کے شعرا کی اولین صف میں جگہ پانے کے قابل تھا کس طرح نظر انداز کرنا تو درکنار شاعری کی دنیا ہی سے بارہ پتھر باہر کر دیا ہے ؛ (نشر شدہ)

سال نو کی آمد آمد ہے شہاب اپنے قلمی معاونین سے توقع رکھتا ہے کہ وہ نئے سال کیلئے دلچسپ افسانے، علمی، ادبی مضامین پُر لطف نظمیں، دلکش غزلیں ارسال فرمائیں گے۔

واضح رہے کہ مضامین وغیرہ آبان کی ۶ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائیں۔ کیونکہ اس کے بعد کتابت شروع ہوجاتی ہے اس لئے آپ کو شکوہ نہ رہ جائے۔

دولت کے پرستار

جناب سید نور الحسن صاحب بی۔اے

دونوں وقت مل رہے تھے آفتاب کی چکا چوند کر دینے والی کرنیں ماند پڑ گئی تھیں۔ ان میں اگلی سی تیزی اور گرمی باقی نہیں رہی تھی۔ اپنے حسن اور جمال کے انحطاط پر آفتاب خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ اس کا چہرہ غم کی وجہ سے تمتما کر سرخ ہو گیا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دھکتا ہوا بڑا سا انگارہ ہے جو کسی نے افق کو گلنار کرنے کے لئے رکھ دیا ہے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرف دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مغرب میں ایک خون کا دریا موجیں لے رہا ہے۔ اندھیرے نے اجالے کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ سارا عالم ایک ساعت کے لئے خاموش ہو جاتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شئی ساکت ہو گئی۔ پھر دیکھتے دیکھتے اندھیرا اجالے پر حاوی آنے لگتا ہے۔ کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی۔ دھندلی دھندلی، مٹی مٹی سی چیزیں۔ غور سے دیکھو تو چند لمحہ پہلے جو اپنا خود کا وجود رکھتی تھیں پرچھائیں معلوم ہوتی ہیں پرچھائیاں بھیانک اور ڈراؤنی جن کو دیکھکر سینہ میں دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ زرد زرد خاک چوپایوں آدمیوں اور بیل گاڑیوں کے آنے جانے کی وجہ سے اڑ اڑ کر آسمان پر جاتی ہے اور فضاء آسمانی کو گرد آلود بناتی ہے۔ راہرو کو سامنے کی چیز ٹھیک دکھائی نہیں دیتی اور گرد کے ذرّے سانس لینا دشوار کر دیتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دم اب گھٹا تب گھٹا۔ جیسی جیسی رات بھیگتی جاتی ہے گرد چھٹتی جاتی ہے۔ آسمان پر تارے جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں۔ ان کی طرف دیکھو تو شریر بچوں کی طرح وہ آپ کو آنکھ مار کر آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں۔ کبھی غائب ہو جاتے ہیں اور کبھی پھر نمودار ہو جاتے ہیں۔ شرمیلے ننھے ننھے تارے چاہتے ہیں کہ آپ ان کو دیکھتے ہی رہیں لیکن ان میں سے چند ایسے بھی جہان دیدہ ہیں کہ ایک ساعت بھی آپ کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتے اور بڑے آب و تاب سے اپنا جلوہ دکھاتے ہیں با وجود اس تماشے کے وحشت۔ سناٹا۔ عالم پر طاری ہو جاتا ہے۔ چاند جذبات میں ایک ہیجان پیدا کرنیوالی کشش کے ساتھ آپکے دل کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپکے ولولوں کو گدگداتا ہے۔ شوقین اور دنیا پرست اس کی رندانہ دعوت کو قبول کر کے گھر سے باہر نکل بھی کھڑے ہوتے ہیں اور رات گئے عارضی مسرتوں سے لطف اندوز ہو کر چند اپنے گھروں کو واپس بھی ہو جاتے ہیں۔ گناہ کا احساس ان کو رات بھر سونے نہیں دیتا۔ بچپن کی تعلیم رنگ لاتی ہے اور دوزخ کی آگ کے شعلے ان کو نگل جانے کے لئے لپکتے معلوم ہوتے ہیں وہ اپنی "کرنی" سے توبہ کرتے ہیں۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ توبہ ٹوٹے بغیر رہ نہیں سکتی۔

ایسی ہی ایک رات تھی جب اچھے اچھے زاہدوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ قدم ڈگمگانے کی تو خیر کوئی بات بھی نہیں

کیونکہ زاہد بھی آخر آدمی ہی ہوتے ہیں۔ فرشتے تو ہیں ہی نہیں کہ معصوم پیدا ہوتے ہوں اور معصوم مریں۔ جن کو گناہ کرنے کی قدرت نے طاقت نہ دی ہو وہ کیا گناہ کریگا۔ گناہ وہی کرتا ہے جو سراپا گناہ ہو جس کے خمیر میں گناہ یعنی کثافت کا کافی جزو شامل کردیا گیا ہے۔ بہر صورت چاندنی رات تھی۔ تاروں بھرا آسمان تھا جنگل کی بھینی بھینی خوشبو تھی۔ ایک پگڈنڈی پیچ وتاب کھاتی ہوئی ایک مار کھائے ہوئے سانپ کی طرح بل کھاتی یا ایک غصہ میں بھری ہوئی معشوقہ کی زلف پیچاں کی طرح لہراتی ہوئی وادیوں اور گھاٹیوں سے گذرتی چلی جاتی تھی۔ پگ ڈنڈی کے چاروں طرف درخت تھے۔ نئے اور پرانے پتوں سے لدے ہوئے اور بغیر پتوں کے۔ پتوں سے چاندنی چھن چھن کر زمین پر عجیب عجیب قسم کے گل بوٹے بنا رہی تھی قدرت کی مصوری کے ڈزائن وہی دیکھکر لطف اٹھا سکتا تھا جس کو خود قدرت نے چشم بینا دی ہو اور جو آرٹسٹ اتفاقاً طبیعت کا ہو۔

پگ ڈنڈی کے ایک موڑ پر پہاڑی سلسلہ کے وسط میں گھنی جھاڑیوں کے بیچا بیچ ایک فقیر نے ٹھوکر کھائی۔ ایسی چاندنی میں جب انسان سوئی میں تاگا پرو سکتا تھا۔ ٹھوکر کھانا اس بات کا قطعی ثبوت تھا کہ فقیر کا دماغ اور خیال اس دنیا میں نہیں بلکہ کسی دوسری دنیا میں تھا۔ ٹھوکر لگتے ہی فقیر چونک پڑا۔ نیچے دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک غار ہے تلاش اور جستجو نے اس کو اکسایا پتھر اٹھاکر غار میں داخل ہوا، ابھی بہت دور نہیں گیا تھا کہ زمین پر روپیوں، اشرفیوں، قیمتی زیوروں، کپڑوں، اور جواہروں کے ڈھیر دکھائی دئے۔ فقیر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ لاحول پڑھتا ہوا غار کے باہر آیا اور سر پر پاؤں رکھکر جنگل میں سرپٹ بھاگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یا تو وہ پاگل ہوگیا ہے یا زبردست خوف کا اثر اس کے دماغ پر ہے۔ وہ زور زور سے چیختا جاتا ہے، موت کو میں نے دیکھا۔ موت کو میں نے دیکھا۔

گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چند ڈاکو چھپے بیٹھے تھے۔ ایمانداری سے روٹی نہ ملنے کی وجہ سے اونھوں نے بے ایمانی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنا شروع کردیا تھا لیکن بے ایمانی اس وقت تک شاید جائز کہی جاسکے جبتک اس میں ظلم وستم شامل نہ ہو۔ کسی کا دل ہلانا ہر صورت میں گناہ ہے خواہ وہ اہم سے اہم فرض کی ادائی کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ یہ ڈاکو گھات میں تو بیٹھے ہی ہوئے تھے فقیر کو اکیلا دیکھکر فوراً اس پر پل پڑے اور اُس کو رسیوں سے باندھ دیا۔ فقیر ڈاکوؤں سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ اسی طرح چیختا رہا اور میں نے موت کو دیکھا، میں نے موت کو دیکھا۔ ڈاکو اُس کو پاگل سمجھ کر خوب ہنسے اور کہنے لگے "بیوقوف موت کہیں دکھائی دیتی ہے" فقیر نے کہا "چلو میں تم کو دکھا دیتا ہوں مگر میری صلاح مانو تو تمھارے لئے یہی بہتر ہے کہ اس بلائے بے درماں سے دور رہو، ڈاکو نہیں مانے اور فقیر کو مجبور کیا کہ ان کو لیجاکر موت دکھادیں فقیر ان کو لے کر غار کے اندر گیا۔ ڈاکو اس وقت دولت دیکھکر خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ انھوں نے فقیر کو مارکر غار کے باہر نکال دیا اور وہ چیختا ہوا جنگل میں ایک طرف بھاگا۔ "میں نے موت کو دیکھا۔ میں نے موت کو دیکھا۔"

ڈاکوؤں کے قہقہہ کی آواز سے فضا کا سینہ پھٹ گیا۔ تینوں ڈاکو سر جوڑ کر بیٹھے اور سوچنے لگے کہ اس دولت کو کیونکر وہاں سے اٹھا کر لیجائیں لیکن وہ بہت تھکے ہوئے اور بھوکے تھے لہٰذا آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ ان میں سے ایک ڈاکو کچھ روپیہ لیکر شہر جائے اور کھانے پینے کی چیزیں لائے تاکہ پیٹ بھرنے کے بعد دماغ کو جلا ہو اور دُور کی سوجھے۔

سب سے تیز آدمی کا انتخاب شہر جانے کے لئے کیا گیا۔ ڈاکو بازار گیا۔ خوب کھایا۔ خوب اڑایا۔ جب چلنے لگا تو دل میں سوچا کہ اتنی دولت اگر تین میں تقسیم ہوئی تو ہر ایک کو ⅓ ملے گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ہلاہل ملا دیا جائے اور ان دونوں کو اس ترکیب سے مار ڈالا جائے تاکہ پوری ملکیت کا جائز مالک میں ہی بن جاؤں اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں کیونکہ اچھی چیز کو ہر شخص اپنے لئے چاہتا ہے۔ چمکتی، دمکتی، تھرکتی ہوئی چیز پر بچہ بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ آج دنیا میں کون ہے جو اپنے فائدے کے سامنے دوسروں کے نقصان کا خیال کرتا ہے۔ اخلاقی معیار سے یہ بات گری ہوئی ہے لیکن اخلاقی معیاروں سے انسان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ بدن نہیں ڈھکتا، بیماریاں دُور نہیں ہو جاتیں اخلاقی معیار کا پرچار کرنے والے خود کس قدر ان معیاروں پر چلتے ہیں۔ سب کہنے کی باتیں ہیں بہلانے کی، بیوقوف بنانے کی۔ عملی زندگی دوسری چیز ہے اور ہم تو ہمیشہ سے عالم باعمل رہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ استاد نے کہا ہے کہ لوہا جب گرم ہو اس پر فوراً ہتھوڑا دہنک دو۔ ان خیالات کا دماغ میں آنا تھا کہ زہر خریدا خوب کھانے پانی میں ملایا۔ ایسا تیز زہر کہ ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے جائے تو دل وجگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

کامیابی اور کامرانی کی مسرت چہرے سے آشکارا تھی۔ جاتے ہی دونوں رفیقوں کے لئے دسترخوان بچھایا۔ دوست تو شیخ چلی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ہوش کس کو تھا اور اس پر طرہ یہ کہ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے فوراً کھانے پر ایسے گرے جیسے سڑی لاش پر گدھ گرتے ہیں۔ ابھی کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ دونوں کے پیٹ میں شدت کا درد اٹھا اور آناً فاناً اُن کی حالت غیر ہونے لگی۔ انھوں نے ایک بہانہ سے اپنے دوست کو پاس بلایا اور دونوں نے مل کر اس کے پیٹ اور سینے میں زہر آلود خنجر بھونک دئے۔ دولت کے متلاشی، لالچی ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں چمکدار جواہرات تھے وہ درد سے تڑپتے تھے لیکن جواہرات نہ چھوڑتے تھے۔ اسی طرح تڑپ تڑپ کر وہ مر گئے۔ جب آخری سانس نکلی تو ہاتھ کی مٹھیاں خود بخود کھل گئیں اور جس طرح خالی ہاتھ وہ دنیا میں آئے تھے خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ گئے۔

صبح کی سہانی فضا میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ ایک فقیر کی آواز کو جنگل سے شہروں کی طرف لیجا رہے تھے میں نے دولت کی شکل میں موت کو دیکھا۔ فقیر کی یہ آواز اب بھی کبھی کبھی رات کے سناٹے میں سنائی دیتی ہے بشرطیکہ گوش نصیحت نیوش سے سُنی جائے۔

بھوئی

۹

دکن کی پیداوار ہے اگرچہ اور جگہ بھی سہی لیکن ضلع نظام آباد اور تعلقہ بھونگیر میں ان کی کاشت زیادہ مردم خیز ثابت ہوئی ہے۔ آبائی پیشہ ماہی گیری ہے مگر زمانہ کے ہاتھوں آجکل اپنے ہاتھ پیر بیچ دیئے ہیں اسلئے ہندو مسلم گھرانوں کا اہم عنصر بن گیا ہے۔

جاروب کشی سے لیکر فرش عروسی تک بچھانے میں عذر نہیں۔ سخت محنت پسند۔ اور جفاکش واقع ہوا ہے چکی یہ پیسے۔ کھانا یہ پکائے۔ پانی یہ لائے۔ برتن یہ مانجھے۔ پتھر یہ اوٹھائے اور بیشتر اوقات ننھے بچوں کے لئے آیا، کا کام دئے جائے۔

چونکہ میانہ وغیرہ کا رواج آجکل متروک ہو گیا ہے۔ ورنہ تونچہ۔ پالکی۔ ہوادار پر اس کا قبضہ اور دلچسپ مشغلہ تھا صبح سے لیکر شام تک کولھو کے بیل کی طرح کام میں جتا ہوا۔ اس قدر نڈر اور بہادر کہ چھینکنے پر ڈر جائے۔ ٹپاخے کی آواز پر موری میں چھپ جائے کہ یقیناً آج آسمان ٹوٹ پڑا۔

وقت کو اس قدر عزیز رکھے کہ ایک لمحہ بھی رائیگان نہ جائے۔ بدنصیبی سے اگر کبھی فرصت ملجائے تو برگد کے پتہ کا ہنڈمیڈ سگار بنا کر فضا میں دھویں اڑاتا بھونڈے سروں میں نغمے الاپتا۔ جالا بنتا ہوا۔ دن رات گھر کی چوکیداری کے فرائض انجام دیتا ہوا نظر آئے گا۔

ہندو مسلم شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہو جہاں اس سے پردہ کیا جاتا ہو، احیاناً کسی نے ٹوکا کہ کیا بھوئی سے پردہ نہیں تو خاتون خانہ کا بیساختہ یہی جواب ہوگا ماٹی ملا بھوئی تو ہے، گویا وہ انسانوں سے دور کسی دوپایہ جانوروں کی جنس ہے جس کی عقل اور تمیز سلب ہو چکی ہے۔

حریص نہیں ہوتا ماہانہ دس بارہ روپیہ پر خوشی سے اپنے آپ کو وقف خدمت گذاری کر دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے پڑی پائی چیز کو اپنا جائز حق سمجھ کر تھیا جاتا ہے۔ بازار سے سودا لانے میں پیسہ دو پیسہ اپنی کمیشن کے علیٰحدہ کر لینے میں وہ کبھی نہیں چوکتا۔ اگر آپ نے ان خوبیوں پر نگرانی نہ رکھی تو اس کی دست درازی جیب صاف کرنے تک بڑھ جاتی ہے یہ انسان نما جانور کفایت شعار اس قدر ہے کہ دن رات میں ایک مرتبہ کھائے اور ایک لنگوٹی پر عمر گنوائے اور ماہانہ آمدنی اپنی ذاتی بنک میں جمع ہوتی جائے۔ البتہ سال میں ایک دفعہ مہینہ ایک روز کیلئے وطن مالوف کا ارادہ کرتا ہے

دراوس دن کی خوشی قابل دید ہوتی ہے کہ مالک کے حملہ کار ہیں دئے ہوئے کپڑوں سے کوئی بھڑکیلا اور شوخ رنگ جوڑا
پہن کر اپنے آپ مسکراتا اور اتراتا رہتا ہے۔ شاید یہ تخیل پیش نظر رہتا ہوگا کہ وطن کے معاصرین اس کو اس رنگ میں دیکھکر
مرعوب ہوجائیں اور جھک جھک کر آداب اور تسلیمات بجالائیں۔

خوش نصیب کو اپنی ملازمت کے بکھیڑوں سے اتنی فرصت کہاں کہ تعلیم کی جانب توجہ کرے اسلئے یہ عموماً ناخواندہ
ہی رہتا ہے البتہ ہم نے اپنے دوست کے یہاں ایک بھوئی کو "گلستان" پڑھتے دیکھا تھا شاید وہ بھوئی کی کوئی اور قسم ہوگی ورنہ
بھوئی کو گلستان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چونکہ تعلیم سے بالکل عاری ہوتا ہے اسلئے تہذیب اور شائستگی ہمیشہ اس سے دور بھاگتی
رہتی ہے۔ اگرچیکہ مادری زبان "تلگو" ہوتی ہے مگر مسلمان گھرانوں کے میل جول کے صدقہ میں اردو گفتگو بھی کرلیتا ہے یہ اردو
ایک خاص معیاری ہوتی ہے جو ہماری اور آپ کی سمجھ سے کسی قدر بالا ہے۔ تذکیر تانیث سے چونکہ اس ماہر زبان کو کبھی سابقہ
نہیں پڑا اسلئے عموماً "ضمیر مونث" ہی کو قابل ترجیح سمجھتا ہے۔ جاتا۔ کھاتا۔ پیتا۔ آتا۔ کو ہمیشہ جاتی۔ کھاتی۔ پیتی۔ آتی استعمال
کریگا۔ زنان خانہ کا پیام دیوان خانہ میں نہایت صفائی کے ساتھ پہنچائیگا "میاں بیگم صاحب بولتی تو ابتک کا نائیم نیں
کا ئی"۔ چنانچہ اس کے اعلیٰ کردار کے طفیل اردو میں ایک جدید محاورہ کا اضافہ ہوا ہے۔ جب آپ کسی کو بیوقوف کہنا چاہیں تو
بلا تکلف کہدیں گے۔ "ارے میاں تم تو نرے بھوئی کے بھوئی رہے"۔ دارالترجمہ اور وضع اصطلاحات کو اس محاورے کی جانب
توجہ دینی چاہیئے کہ اردو کا سرمایہ آئندہ تہی مایہ نہ رہ جائے۔

بھوئیوں کے واقعات نہایت دلچسپ ہیں البتہ ہم اپنے ایک عزیز کے خدمت گزار بھوئی کے حالات پر اکتفا کریں گے۔
یہ بھوئی ان کا اس قدر ہمدرد اور مشیر خاص تھا کہ شاید بی بی بھی اتنی نہ ہوگی۔ سال میں ایک مرتبہ اپنی گاڑھی کمائی کا اندوختہ
لے کر وطن جایا کرتا تھا۔ یہ جب چہل قدمی کو نکلیں تو آپ دیکھیں گے بھوئی سایہ کی طرح پیچھے کمر بستہ بغل میں چھتری دبائے ہاتھ
میں جالا بننے کی لکڑی اوٹھائے رواں دواں ہے۔

پہلی مرتبہ یہ جب چہل قدمی کو نکلے ہیں تو سر پر سرخ ترکی ٹوپی اور پیر میں سیاہ پیٹنٹ لیدر کا چمکدار پمپ تھا واپسی پر
بھوئی نے پیر سے پمپ اور جرابیں اتار دیں اور سر سے ٹوپی لیلی۔ صابن تولیہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے رکھدیا۔ یہ منھ پونچھتے
ہوئے جب ڈرینگ روم میں جاتے ہیں تو یہ تماشا دیکھا کہ پمپ تو رکھا ہوا ہے۔ میز کے اوپر اور ٹوپی دھری ہے۔ میز کے نیچے۔ جز
بز ہوتے بھوئی کو آواز دے کر ڈانٹا کہ یہ کیا حماقت ہے تو نہایت متانت سے پمپ کی جانب اشارہ کرکے عرض کرنے لگا "
سرکار یہ چمکتی ہے" یہ جواب سُن کر وہ مسکرائے اور سمجھا دیا کہ جوتا میز پر نہیں رکھا جاتا۔

ایک دفعہ یہ بھوئی کی معیت میں چہلقدمی کو نکلے راستہ میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی اور دوران گفتگو میں آپ نے

سگار سے تواضع کی۔ اسی طرح دوسری مرتبہ انہیں دوست سے مڈبھیڑ ہوئی اور انھوں نے سگار کی تعریف کی آپنے ایک اور پیش کر دیا۔ تیسری مرتبہ پھر دور سے وہی دوست آتے دکھائی دئے قبل اس کے کہ وہ قریب آئیں بھوئی نے سرکار کی مسلسل پیٹھ ٹھونکی پر بہت چراغ پا ہوئے کہ عجیب کمبخت سے سابقہ پڑا ہے ڈانٹ کر پوچھا کہ کیا ہے نہایت اطمینان سے انگلی اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہنے لگا، میاں چٹا چپا تیری دوست آتی ہے مانگے گی، یہ مسکرا کر خاموش ہوگئے۔

چنانچہ ایک مرتبہ چند احباب کے ساتھ مشاعرہ میں جانے کا اتفاق ہوا بزم مشاعرہ بقعہ نور ہے۔ بھوئی کو سبھوں نے اپنی جوتیاں دیکر ایک جانب بٹھلا دیا۔ واہ۔ واہ کے شور افزا صداؤں سے کان گنگ ہیں۔ شاعر قدر شناسی میں جھک جھک کر آداب تسلیمات بجا لا رہے ہیں۔ اس ہنگامہ محشر میں سبھوں نے دیکھا کہ ایک بھوئی افتاں خیزاں مجمع کو چیرتا پھاڑتا چلا آرہا ہے اور پیچھے سے ایک صاحب کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہے۔ پہلے تو اونھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ جب مسلسل یہی ہوتا رہا تو پلٹ دیکھا کہ ان کا عزیز اور ہمدرد بھوئی ہاتھ پکڑ کھینچ رہا ہے اور مصرعہ "اب تو گرچل یاں لوگاں بوم مارتی ہے"۔

مگر افسوس یہ ہے کہ اس بھوئی کی عمر نے وفا نہیں کی اور یہ عزیز بھوئی کے قبل از وقت رحلت پر ایک عرصہ تک سوگوار رہے۔

البتہ ذیل کا واقعہ سنا ہوا ہے اپنا دیکھا بھالا نہیں۔ ایک صاحب پاس میانہ برداری کیلئے چھ بھوئی ملازم تھے اور گھر کے کاروبار بھی انجام دیا کرتے تھے۔ شاید موجودہ تعلیم کے اثرات یا آئے دن کی ہڑتالوں کی خبریں سن کر ایک دن ان بھوئیوں نے بھی ہڑتال کی ٹھان لی کہ کیوں گھر کے کام کریں جبکہ ہم میانہ برداری کے ملازم ہیں۔ چنانچہ جب صاحب خانہ اپنے کسی غرض کیلئے باہر چلے گئے تو بیگم خانہ نے پخت و پز کیلئے بھوئیوں کو سودا لانے کے لئے حکم دیا مگر بھوئیوں نے صاف جواب دید یا کہ 'ام میانہ کا بوئی ہے'، بیگم نے لاکھ سمجھایا مگر یہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئے۔ مجبوراً ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ رہیں۔ دو پہر صاحب خانہ بھوک کے پیاسے گھر لوٹے، کھانا مانگا تو بی بی نے ٹکا سا جواب دیدیا اور بھوئیوں کے ہٹ کی داستان سنا دی۔ میاں تھے سمجھدا۔ بی بی سے کہنے لگے۔ واقعی بھوئیوں نے جو کچھ کہا بالکل سچ کہا۔ تمہیں جو کچھ منگوانا ہے ہم سے کہو ابھی منگوا دیں۔ بتاؤ تو اس وقت کس چیز کی ضرورت ہے۔ بی بی نے کہا کہ صبح سے ابتک برتن نہیں دھلے۔ پانی کی بوند تک نہیں ہے اس کے بعد دوسرے مراحل ہیں۔ میاں نے کہا۔ اچھا پانی ابھی آجائے گا۔ چنانچہ باہر جاکر بھوئیوں کو آواز دی کہ میانے آؤ۔ بھوئی نہایت شاداں و فرحاں۔ میانہ لے آئے کہ چلو ہماری ہڑتال کارگر ثابت ہوئی اور ہم روزانہ کی مصیبت سے چھوٹے۔ میاں نے حکم دیا کہ گھڑا میانہ میں رکھ لو اور نل پر لے چلو۔ پانی بھروایا اور گھر لوٹے بی بی سے پوچھا کہ اب کونسی چیز درکار ہے کہا۔ گوشت، آپ باہر تشریف لے گئے اور آواز دی کہ میانہ لے آنا۔ بیٹھ گئے اور حکم دیا کہ قصاب کی دوکان چلیں۔ لیجئے گوشت بھی آگیا۔ اسی طرح ہر شئی کے لئے

بازار میانہ میں جاتے اور سودا لے آتے۔ اب بھوئیوں نے سوچا کہ پہلے تو ایک ہی بھوئی ان کاموں کو انجام دیتا تھا اب چھوٹوں بھوئی پر دوگونہ مصیبت نازل ہوگئی ہے۔ چنانچہ سبھوں نے صلاح و مشورہ کے بعد میاں کے خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔

"سرکار ام میانہ کا بوئی بی اور گرکا بی"

چلئے کاروبار بدستور چلنے لگے۔

غزل

جناب زاہد حیدری صاحب

فسانہ محبت کا کس کو سنائیں
نہ کیوں چپکے چپکے ہی آنسو بہائیں

ہے ہنگام رحلت مرا اب تو آئیں
کر دل جان میں نذر تم مسکرائیں

اٹھادیں حجابوں کو بجلی گرائیں!
قدم وہ نہیں ہیں یہ جو ڈگمگائیں

امید ان سے کب ہے کہ پردا اٹھائیں
نگاہوں میں کتنی کشش ہے بتائیں

بھلا تو ہی اے دل اب انصاف کرنا
ہم آنکھیں بچھائیں وہ نظریں چرائیں

نقاب اپنے رخ سے الٹی تھی کس دن
کفن سے نہ کیوں منھ کو ہم اب چھپائیں

ہوں تم اور ہم دل کو حاصل سکوں ہو
چلو چل کے اک ایسی دنیا بسائیں

یہ مانا کہ موسیٰ کا رتبہ بڑا ہے
ہماری نگاہوں کو بھی آزمائیں

بھلا اس کی رحمت کے آگے یہ کیا ہیں
ہماری خطائیں بھی ہیں کچھ خطائیں

ختم

چندہ کی اطلاع ایک مہینہ پہلے سرخ چٹھی سے آپ کو دیجاتی ہے آئندہ خریداری منظور نہ ہو تو ذریعہ کارڈ مطلع کیجئے۔ مگر یہ عجیب ستم ہے کہ خاموشی اختیار کیجاتی ہے اور وی۔ پی جانے پر بلا تکلف واپس کرکے دفتر کو نقصان پہنچایا جاتا ہے براہ کرم ایسا تو نہ کیجئے کہ کاغذ بے انتہا گراں ہے۔

عہدِ ماضی کی افسانہ نویس خواتین

جناب غلام جیلانی صاحب بی۔اے

(مضمون نگار سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

اُردو زبان میں مختصر قصے یا افسانے لکھنے کا رواج حال حال ہی میں ہوا ہے لیکن ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ خواتین ناموافق حالات کے باوجود اس میدان میں مردوں سے تعداد میں تو کم ہیں لیکن شہرت اور فن کاری میں کسی طرح کم نہیں افسانہ نویس خواتین کی فہرست میں چار کے نام خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں اور طاہرہ دیوی یہ چاروں افسانہ نویس خواتین کافی شہرت کی مالک ہیں۔ آئیے ذرا ان کی افسانہ نویسی کا جائزہ لیں اور ان کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے محاسن و معائب پر نظر ڈالیں۔

حجاب امتیاز علی اوّل اوّل حجاب اسمٰعیل کے نام سے آسمان ادب پر چمکیں۔ ان کا جلوہ اولین اس قدر تابناک تھا کہ ناقدانِ ادب کی آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر عورت فطری طور پر قصہ گوئی میں ماہر ہوتی ہے لیکن ناموافق حالات کی وجہ سے اس کو وہ ادبیت حاصل نہیں ہوتی جو افسانہ نویسی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن حجاب کا بچپن کچھ ایسے ماحول میں گذرا کہ وہ بیک جنبش قلم حالات کو سازگار بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس میں کچھ تو ماحول کا حصہ تھا اور کچھ ان کے والدہ مرحومہ کی شخصیت۔ اور ذوق ادب کا۔

حجاب ابتداء ہی سے مغربی ادب سے نہ صرف آشنا تھیں بلکہ وہ اس میں ہمہ تن جذب ہو چکی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانہ نویسی پر مغربی اثر پوری طرح مسلط ہے اور اسلئے ان کا افسانوی پس منظر بالکلیہ مصنوعی اور غیر مانوس نظر آتا ہے اگر فرانسیسی دریچے۔ سایہ دار صنوبر کے درخت، ترکی خواتین، مصر کے امیر اور حبشی غلام چھین لئے جائیں تو وہ کوری کی کوری رہجاتی ہیں۔ ابتدا میں تو ان چیزوں کا وجود کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ تھا۔ مگر اعتراض کی گنجائش زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ کیونکہ وہ مقامی رنگ سے ابتک بھی ناآشنا ہیں جس کی وجہ سے مصنوعی اور غیر مانوس منظر اکتاہٹ و بیزارگی کا باعث بن گیا ہے۔ افتاد سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حجاب میں ترقی کرنے کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دیگئی ہے اور یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ تھوڑے ہی دن میں ایک پختہ کار افسانہ نویس بن جائیگی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ابتک کامیاب نہ ہو سکیں۔ شہرت انسان کی ایک بہت ہی بڑی کمزوری ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہی کمزوری یعنی شہرت نے ہی حجاب کو ہمیشہ کے لئے ایک نوآموز رکھ چھوڑا۔ ان کو ناقدان ادب نے اس قدر اچھالا کہ وہ اپنے فن سے زیادہ اپنی شہرت کی قدر کرنے پر مجبور ہو گئیں اور شہرت کی حفاظت میں کسی نئی راہ پر قدم اٹھانے سے پرہیز کرتی رہیں۔

اس ایک خامی سے ہٹ کر حجاب کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ فن افسانہ نویسی پر پورے پورے اترتے ہیں۔ قصوں کی موزوں اٹھان۔ اشخاص قصہ کے کردار کی فطری نشو ونما۔ انداز بیان کی لطافت اور چبھتے ہوئے شوخ مکالموں کی چٹکیاں غرض ایسی تمام خوبیاں ان افسانوں میں جلوہ گر ہیں جو سخت سے سخت ناقد کو بھی مصنف کے کمال کی داد دینے پر مجبور کرتی ہیں۔

حجاب کے افسانوں کی ایک اور انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں خود حجاب روحی کے روپ میں روح افسانہ بنکر آتی ہیں اور اس کی وجہ سے افسانوں میں ایک قسم کی حقیقت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ "حقیقت افسانہ" سے زیادہ دلچسپ چیز ہوتی ہے۔ حجاب کے افسانوں میں رومانوی عنصر اس قدر حاوی ہے کہ ہر افسانہ ایک حسین تصویر نظر آتا ہے۔ اور غالباً یہی چیز ان کی غیر معمولی مقبولیت کی ذمہ دار ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانوی رنگ اور ہی ہے ان کے افسانوں کا پس منظر خالص ہندوستانی ہوتا ہے نہ صرف ہندوستانی بلکہ ایک خاص مقام سے متعلق ہوتا ہے اسی طرح ان میں اشخاص قصہ بھی بالکلیہ ہندوستانی اور وہ بھی ایک خاص طبقے کے افراد ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں بھی فنی خوبیوں کی کمی نہیں اور اس پر زبان کی چاشنی کچھ اس طرح کا مزہ دئے جاتی ہے کہ انہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان افسانوں میں رومانوی جذبات کی ترجمانی کو ثانوی حیثیت اور واقعات نگاری کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ عصمت چغتائی کا مرغوب مشغلہ واقعات کو طنزیہ انداز میں بیان کرنا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ طنز کرنا ہر فرد کے بس کی بات نہیں اور کامیاب طنز نگاری میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ اگر طنز ہدف پر ٹھیک نہ بیٹھا تو خود طنز نگار ہی اُس کا شکار بن جاتا ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر مرتبہ وہ طنز نگاری میں ناکام رہی ہیں اور اس ناکامی سے خود افسانہ نویس نہ صرف واقف بلکہ خائف بھی ہے بہ ایں وجہ عصمت چغتائی عریانی کی آڑ میں پناہ لیتی ہیں۔ عریانی یوں بھی ادب کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ لیکن جب عریانی کسی عورت کے قلم سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اور بھی معیوب نظر آتی ہے۔ لوگ اس عریانی سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اس کو قابل تحسین نہیں سمجھتے۔ اور اس وجہ سے عصمت چغتائی کو جو شہرت ملنی چاہئے تھی وہ ابتک نہ مل سکی۔

ڈاکٹر رشید جہاں افسانہ نویس خواتین میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور اس لئے سب سے زیادہ بے باک بھی ہیں مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب نے انہیں اصلاح قوم کی طرف راغب کردیا ہے۔ اور وہ فطرتاً اشتراکیت کی طرف ڈھلی ہوئی ہیں ان وجوہات کی بنا پر وہ طعن و طنز، اشارے و کنایہ کے قائل نہیں۔ وہ ہر چیز کو دو اور دو چار کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ اسلئے ان کے افسانوں میں جہاں عریانی زیادہ پائی جاتی ہے وہیں واقعیت کا عنصر بھی زیادہ ہے۔ رشید جہاں عریانی کی

آڑ میں طنز نہیں کرتیں بلکہ عریاں کو عریاں تر بنا کر ہر چیز کے حقیقی خد و خال کو زیادہ واضح کر دینا چاہتی ہیں۔ تاکہ لوگ ان سماجی اور معاشرتی مصائب کو دور کرنے کی کوشش پر آمادہ ہو جائیں۔

فنی نکتۂ نظر سے رشید جہاں کے افسانے زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ انھوں نے میدان کے انتخاب میں غلطی کی۔ انہیں افسانہ نویس نہیں مقالہ نویس بننا چاہئے تھا ان افسانوں کا پڑھنے والا یہ بھی محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ عارضی جوش کے ماتحت جذبات کی رو میں بہہ گئی ہیں اور افسانہ نگاری کے مفہوم کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکیں۔ افسانہ محض اصلاحی، انقلابی، یا سماجی کیفیات کا آئینہ دار ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل فن ہے او ، بھی فن لطیف۔ اس کے اصول و ضوابط بھی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی پیروی نہ کیگئی تو وہ انقلابی اصلاحی یا سماجی ادب تو ہو سکتا ہے لیکن افسانہ نہیں ہو سکتا۔

طاہرہ دیوی نے افسانوی دنیا میں اس شان سے قدم رکھا کہ ناظرین میں ہلچل مچ گئی۔ ان کے اولین افسانے میں بھی وہ رنگینی تھی کہ دوسرے تمام افسانے بے رنگ ہو کر رہ گئے۔ ان میں جذبات نگاری ایسے سحر آفرین انداز میں کی گئی تھی کہ ناقد و شوقین دونوں تعریف و تحسین کے راگ الاپنے پر مجبور ہو گئے۔ ہر ایک افسانہ مشرقی رنگ میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ ہر پڑھنے والے کو عہد رنگین کی یاد تڑپانے لگتی ہے۔ انداز بیان میں وہ پختگی پائی جاتی ہے کہ کہنہ مشق حضرات کے قلم بھی پانی بھرنے لگتے ہیں۔ زبان پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ ان افسانوں کو انشا پردازی کے بہترین نمونوں کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ قصے کی اٹھان اور تسلسل بیان دونوں میں غیر معمولی طور پر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اشخاص قصہ جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہوتے ہیں نہ کہ ایسی بے جان لاشیں جو افسانہ نویس کی ہر جنبش قلم کی تابع ہوتی ہیں۔ غرض ہر طرح سے طاہرہ دیوی کے افسانے فن افسانہ نگاری کے تمام اصولوں اور ضوابط پر پورے اترتے ہیں۔

طاہرہ دیوی سے متعلق سب سے عجیب ترین بات یہ ہے کہ وہ جس طرح آسمان ادب پر یکایک چمکیں۔ اسی طرح یکایک غائب بھی ہوگئیں۔ گویا کہ وہ ایک ٹوٹا ہوا تارہ تھیں جو پوری آب و تاب کے ساتھ نظر بھی آتا ہے، نگاہوں کو خیرہ بھی کرتا ہے اور پھر غائب بھی ہو جاتا ہے۔ اہل نظر نے اس ٹوٹی ہوئی شئے کو اپنا دل سمجھکر تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی کے روکے سے نہ رک سکی۔ اور دوبارہ روپوش ہو گئیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ طاہرہ دیوی ایک فرضی نام ہے۔ اور اس ٹٹی کی آڑ میں کوئی گرگ باراں دیدہ شکار کھیل رہا تھا۔ وہ چند دن اس خود ساختہ کھلونے سے دل بہلاتا رہا اور پھر بیزار ہو کر اس حسین شیشے کو مسمار کر دیا۔ اس خیال کے ثبوت میں اس پختگی کو پیش کرتے ہیں جو طاہرہ دیوی کے افسانوں میں پائی جاتی ہے لیکن اس خیال کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ طاہرہ دیوی اس وقت تک اپنے آپ کو ظاہر کرنے پر

آمادہ نہ ہوئی ہوں جب تک کہ انہیں اپنے آپ پر کامل اعتماد نہ پیدا ہو گیا ہو۔ اور دنیا جس افسانے کو طاہرہ دیوی کا پہلا افسانہ سمجھتی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ افسانہ بیسیوں ناکام یا غیر مکمل کوششوں کے بعد لکھا گیا ہو۔ طاہرہ دیوی کو ایک فرضی شخصیت ثابت کرنے کیلئے ایک اور حجت پیش کیجاتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ یکایک دنیائے افسانہ سے غائب نہ ہو جاتیں خصوصاً اس صورت میں جب کہ انہیں کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ لیکن اس حجت میں کچھ زیادہ وزن نہیں پایا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کسی اور میدان میں نام پیدا کرنے کی ٹھان لی ہو، اور اسی جستجو میں گم ہو گئیں ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی ایسا انقلاب آیا ہو جو انہیں قلم اور کاغذ کی دنیا سے دور ہی رہنے پر مجبور کر دیا ہو، اور ایسا ہونا ہندوستان میں بعید از قیاس نہیں بہر حال طاہرہ دیوی کا نام تاریخ ادب اردو میں ایک افسانہ نویس خاتون کی حیثیت سے ایک مستقل اور ممتاز مقام پائیگا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

غزل

جناب سید سلطان محی الدین صاحب سیف بی۔ اے (عثمانیہ)

بے نشاں کا نشاں نہیں معلوم
پہنچے کب کارواں نہیں معلوم

سجدے کرتا ہوں ہر جگہ لیکن!
آپ کا آستاں نہیں معلوم

ڈھونڈھتی ہیں اِدھر اُدھر آنکھیں
وہ چھپا ہے کہاں نہیں معلوم

تیرے دل میں جو تھی ہوئی مشہور
کون تھا راز داں نہیں معلوم

جل رہا ہے وہ دیکھ اے صیاد
کس کا ہے آشیاں نہیں معلوم

کشتیٔ دل کا اب خدا حافظ
ہے کنارہ کہاں نہیں معلوم

وہ تو چپ ہیں مگر میں حیراں ہوں
رُک گئی کیوں زباں نہیں معلوم

کس کی آنکھوں کا ہوگا یہ سرمہ
سوزِ دل کا دھواں نہیں معلوم

لائے کیا رنگ اس زمین میں سیفؔ
میری طبع رواں نہیں معلوم

امیر کبیر شمس الامراء اور آن کے اجداد پر ایک طائرانہ نظر

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

(۲)

گذشتہ مضمون میں ہم نے امیر کبیر شمس الامراء کے آباء و اجداد کا حال قلمبند کر دیا ہے۔ اب ہم امیر کبیر کے مختصر حالات کی صراحت کرتے ہیں۔

امیر کبیر کا نام محمد فخر الدین خان تھا اور آپ شمس الامراء ابو الفتح خاں کے اکلوتے فرزند تھے۔ ۱۱۹۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ۱۱۹۹ھ میں پیشگاہ خسروی سے خورشید الدولہ خورشید الملک امام جنگ کے خطاب اور جاگیر ذات سے سربلندی ہوئی۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں بڑی دھوم دھام سے آپ کی تسمیہ خوانی ہوئی جس میں حضور آصفجاہ ثانی نے بھی شرکت فرمائی۔ ڈیڑھ ماہ تک جلسے ہوتے رہے اور کئی لاکھ روپیے خرچ کئے گئے۔

جیساکہ گذشتہ مضمون میں تذکرہ ہو چکا ہے کہ ۱۲۰۵ھ میں شمس الامراء اول کا انتقال ہوا۔ اس زمانہ میں نواب محمد فخر الدین ہنوز کمسن تھے، والدہ کی زیر نگرانی آپ کی تعلیم اور تربیت ہوئی، بلکہ دربار شاہی اور قصر و ایوان بادشاہی میں مرشد زادگان بلند اقبال کے ساتھ ساتھ آپ پروان چڑھے۔ اعلیحضرت کی خاص شفقت اور مہربانی آپکے حال پر مبذول تھی، باپ کے مرنے کے بعد آبائی خطاب شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء اور جاگیرات پائیگاہ وغیرہ آپ کو مرحمت ہو گئے۔

جنگ کھرکہ (۱۲۰۹ھ) کی واپسی کے بعد آپ کی شادی ایک قریبی رشتہ دار کی لڑکی سے ہوئی، لیکن چند سال کے بعد اعلیحضرت حضور آصفجاہ نے اپنی دامادی کا شرف بخشا، صاحبزادی بشیر النسا بیگم سے آپ کا عقد ہوا۔ اس طرح پہلے پہلی خاندان آصفی کی دامادی کا آپ کو اعزاز ملا، آپکے بعد یہ اعزاز ہمیشہ آپکے خاندان کو حاصل ہوتا رہا کہ آصفی شہزادیاں پائیگاہی امیروں سے بیاہی جانے لگیں۔ چنانچہ آج تک اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

نواب شمس الامراء کی شادی جس دھوم دھام، کر و فر، تزک و احتشام سے ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ مصنف گلزار آصفی نے اس کے متعلق جو صراحت کی ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"اگر مفصل حال اور اخراجات طرفین رسم سانچق کی تکلف و شان و شوکت، رسم حنابندی کا تزک و احتشام و طمطراق اور سواری شب گشت وغیرہ کو قلمبند کیا جائے تو علیحدہ ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہوگی، اگر ایک جملہ میں اس کو لکھا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی آنکھ اس تزک و احتشام کو دیکھی نہ تھی اور

کوئی کان اس طمطراق کو سُنا نہیں تھا" صث ۲۸

بہرحال حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی زندگی تک (۱۲۱۸ھ) آپ کو نہایت عزیز رکھا تھا۔ اسی طرح آصفجاہ ثالث اور آصفجاہ رابع کے زمانوں میں آپ کے رتبہ اور اعزاز میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ آبائی خطاب تو پہلے ہی مل چکے تھے ان میں "امیر کبیر" کا ایک جدید خطاب کا اضافہ ہوا، اس طرح آپ پہلے "امیر کبیر" ہیں۔ لاکھوں کی جاگیر ذات اور جاگیرات پائیگاہ کی سرفرازی ہوئی جس طرح نوازشات خسروی آپ پر مبذول رہے اسی طرح آپ نے بھی مالک کی خیرخواہی اور جانثاری میں سرمو فرق نہ آنے دیا، اپنی زندگی تک مالک کی وفاداری اور جانثاری کرتے رہے۔

امیر کبیر کے زمانہ میں جس قدر لڑائیاں دولت آصفیہ کو لڑنی پڑیں ان میں پائیگاہی فوج برابر شریک اور حق نمک ادا کرتی رہی، چنانچہ آپ کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) جنگ کہرکہ جو آصفجاہ اور مرہٹوں میں ہوئی اور بعض نمک حراموں کی نمک حرامی سے آصفی فوج کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی۔ (۱۲۰۹ھ)

(۲) صاحبزادہ عالیجاہ بہادر نے بعض ناعاقبت اندیشوں کے اغوا پر خروج کیا اور ایک معقول فوج کے ساتھ بیدر کی جانب روانہ ہوئے اور قلعہ بیدر پر قبضہ کر لیا، ان کی تادیب کے لئے حسب مشورہ میر عالم بہادر انگریزی فوج جو برطرف ہو چکی تھی، دوبارہ مامور ہو کر روانہ ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ہی موسیو ریمو کی فرانسیسی فوج اور پائیگاہی فوج سردار الملک گھانسی میاں کے ماتحت بیدر کو روانہ کیگئی، سخت لڑائی ہوئی۔ پائیگاہ کی فوج نے بھی اچھی طرح مقابلہ کیا۔ بالآخر عالی جاہ بہادر بیدر سے اورنگ آباد روانہ ہو گئے، اور پھر وہاں سے پونہ کی راہ لی، لیکن مرہٹوں نے کوئی امداد نہیں دی۔ اسلئے اونھوں نے اپنے آپ کو آصفی فوج کے حوالے کر دیا، راستہ میں بہ تقاضائے غیرت و شرم اور ندامت اونھوں نے زہر کھا لیا جس کی وجہ سے ہلاکت ہو گئی۔

(۳) جنگ میسور، ۱۲۱۳ھ میں میسور کی تیسری جنگ ہوئی، آصفی فوج حسب وعدہ انگریزوں کی امداد کے لئے روانہ کیگئی، صاحبزادہ سکندر جاہ بہادر خود بنفس نفیس اس جنگ میں تشریف لیگئے۔ اس موقع پر بھی پائیگاہ کی فوج دشمن سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئی اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائی۔

اس جنگ کے بعد آصفی حکمرانوں کو پھر کسی معرکہ آرائی کا موقع نہیں ملا۔ لیکن امیر کبیر کی فوج یا دوسرے الفاظ میں پائیگاہی لشکر ہمیشہ ساز و سامان سے آراستہ رہا کرتا اور امیر کبیر کے فرزندوں میں سے کوئی ایک روزانہ جلوخانہ شاہی میں اپنی فوج کے ساتھ حاضر رہا کرتے۔ اس زمانہ میں جمعیت پائیگاہ سواروں، توپ خانہ، شتر سواروں پر مشتمل تھی، اور

اپنے عمدہ سازوسامان اور بیش قیمت ہتھیاروں کے باعث اپنی آپ نظیر تھی۔ دوسری خصوصیت پائیگاہ کی فوج کو یہ حاصل تھی کہ ان کی ماہوار برابر ہر مہینہ ملا کرتی، برخلاف دیوانی کی فوج جن کی تنخواہیں کئی کئی ماہ تک نہیں ملتی تھیں۔

بہرحال پائیگاہ کی جاگیر جس غرض سے شمس الامراء کے خاندان میں مرحمت ہوئی تھی، اس کی وہ غرض بہ ہر وقت بہ احسن پوری ہوتی رہی، دوسرے جاگیرداروں سے پائیگاہ کو اسی وجہ سے تفوق حاصل ہے۔

خدا نے آپ کو کئی فرزند عطا کئے جن میں سے چار نے نام آوری حاصل کی اور باپ کے بعد زندہ رہے، یعنی محمد رفیع الدین خان عمدۃ الملک بہادر، دوسرے محمد سلطان الدین خان بشیر الملک، تیسرے محمد بدر الدین خان معظم الملک اور چوتھے محمد رشید الدین خان اقتدار الملک، ایک اور فرزند محمد فرید الدین خان کے نام سے موسوم تھے اور نوجوانی میں باپ کے سامنے سب کو داغ مفارقت دیگئے۔

امیر کبیر نے طویل عمر پائی۔ چوراسی سال کی عمر میں ۱۲۷۹ھ میں انتقال ہوا۔ درگاہ حضرت برہنہ شاہؒ میں دفن کئے گئے۔

امیر کبیر کے اخلاق و عادات، آپ کی علمی قابلیت اور لیاقت، آپ کی قدردانی اور قدرشناسی، اہل علم و فن کی سرپرستی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، آپ اپنے وقت کے صاحب تدبیر اور بہت بڑے مدبر تھے، آپ نے اپنے جاگیرات کا انتظام نہایت عمدہ رکھا تھا، جاگیر کی رعایا ہر وقت خوش و خرم اور خوشحال و فارغ البال رہی، پائیگاہ کی فوج باقاعدہ، سازوسامان سے آراستہ رہا کرتی، ملازمین پائیگاہ کی ماہوار خواہ اہل قلم ہوں یا اہل سیف باوجود بیش قرار ہونے کے برابر ملا کرتی، آپ کے حسن اخلاق اور حسن انتظام کے باعث کسی ملازم کو خواہ وہ کسی طبقہ کا ہو کوئی شکایت کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

امیر کبیر اپنے وقت کے بڑے صاحب علم و فضل تھے، آپ کی کئی تصانیف ہیں، خصوصاً علم ریاضی، ہیئت اور علم سائنس (کیمیا، طبیعات) سے بڑی دلچسپی تھی، اسی دلچسپی کے باعث انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے علم سائنس کی کئی ایک کتابیں ترجمہ کرا کے شائع فرمائیں، اور ان کو مفت تقسیم فرمایا۔ ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ مدرسے قائم کئے۔ طلبہ کو وظائف عطا کئے، کتب خانے قائم کئے، اہل علم و فن کی سرپرستی فرمائی، شعراء اور مصنفین کو صلہ دے کر ان کی ہمت افزائی فرمائی، آپ ایک صاحب علم، علم دوست، فیاض، جوہر شناس امیر تھے۔

امیر کبیر کو نہ صرف علم و فن سے دلچسپی تھی بلکہ فن تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا، آپ فن تعمیر و جر ثقیل سے بخوبی واقف تھے، ایک عمدہ انجنیر اور ایک ماہر فن آرکیٹکٹ کی حیثیت سے بھی آپ کا تعارف کرایا جا سکتا ہے، اب تک کئی عالی نشان اور رفیع الشوکت عمارات آپ کی یادگار ہیں، جہاں نما، سرور نگر، آصف نگر، لالہ گوڑہ وغیرہ میں آپ کے تعمیر کردہ

قصر و ایوان ابتک موجود ہیں۔ فردوس منظر باغات، عظیم الشان باز ارات اور گنج آپکے بنائے ہوئے پائے جاتے ہیں، ان عمارتوں وغیرہ کے دیکھنے سے آپکے ماہر فن انجنیرنگ۔ اور آرکی ٹک کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آپ بڑے سخی داتا تھے، صاحب مروت وکرم تھے، آپ کی سخاوت اور داد و دہش کا عام طور پر شہرہ تھا۔

امیر کبیر مذہب کے پابند تھے۔ حنفی مذہب تھا، بیسیوں مسجدیں تعمیر کرائیں، اور ان میں پیش امام اور موذن کا تقرر کیا۔ مسجدوں کے اخراجات کے لئے ماہوارین جاری فرمائیں، ماہ رمضان میں روزہ داروں کے افطاری کا انتظام ہوتا۔ آپ کی جاگیرات کے دیولوں اور دھرم سالوں وغیرہ کو بھی آپ کی سرکار سے امداد مقرر تھی۔

دکن کے مورخوں نے آپ کا تذکرہ نہایت عمدہ الفاظ میں کیا ہے۔ چنانچہ مصنف گلزار آصفی کی صراحت کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"شمس الامرا جو سرخیل امرائے نامدار ہیں، اپنی شان و شوکت، جاہ و حشمت کے ساتھ قدر دان اہل کمال، رفیق پرور، ستودہ خصال، شرفا نواز ہیں، صاحب تصنیف ہیں۔ آپکے قایم کردہ مدرسے، اپنے قابل اساتذہ اور طلبہ وظیفہ یاب کے ساتھ مشہور ہیں: طلبہ کو علوم دنیوی کے ساتھ مذہبی تعلیم سے بیگانہ نہیں رکھا جاتا، مسائل فقہی اور عقائد سے بھی باخبر کیا جاتا ہے، بہرحال آپ اپنے افعال حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے باعث یگانۂ روزگار ہیں"

مضمون کی طوالت کے خوف سے دوسرے مورخوں کے اقتباسات نظر انداز کئے جاتے ہیں۔

اس موقع پر امیر کبیر شمس الامرا کی علمی خدمات کا تذکرہ بھی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کے لئے علیحدہ فرصت درکار ہے۔ شمس الامرا امیر کبیر کے علمی خدمات کے ضمن میں آپکے تصانیف، آپکے قایم کردہ مدرسے اور کتنے شعرا اور مصنفین کی سرپرستی کی صراحت کیجاسکتی ہے، اور آپکے اردو خدمات مثلاً مغربی علوم کے تراجم، اردو میں علم سائنس کی تعلیم کا انتظام کرنا۔ آپ کی سرپرستی میں اردو تصانیف وغیرہ کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے اور پھر آپ کے جانشینوں کے علمی کارنامے بھی قابل ذکر ہیں۔

بہرحال حیدرآباد کی تاریخ میں شمس الامرا ثانی امیر کبیر بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ نہ صرف ایک مدبر اور عقلمند، صاحب فہم و فراست کی حیثیت سے بلکہ علم دوستی، اور علم پروری کے لحاظ سے بھی آپ اپنی نظیر تھے، دکن کی کوئی تاریخ آپ کے تذکرہ سے خالی نہیں ہوسکتی، آپ دیگر صفات اور کارگذاریوں کے قطع نظر آپ کا صرف ایک کارنامہ جو مغربی علوم سے ترجمہ کی ابتدا، اور ان علوم کے تعلیم کا انتظام کرنے کا ہے ایسا کارنامہ ہے جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا ہے

اور نہ حوادثات محو کر سکتے ہیں۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی آپ کا نام تاریخ اردو میں تاباں اور درخشاں رہے گا اور اردو کے مربی اور محسن کی حیثیت سے آپ کا تذکرہ لازمی ہوگا۔

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

مری بیتابیٔ دل میرے چہرے سے نمایاں ہے
بدلنا رنگ کا ہر دم طلسم راز پنہاں ہے

الٰہی کون دے اب داد بیداد محبت کی
مزاج حسن برہم آرزو سر در گریباں ہے

نہیں رکتیں نہیں رکتیں جنوں افزائیاں دل کی
کبھی صحرا نوردی ہے کبھی سیر گلستاں ہے

نہ چھیڑے اب کوئی مجھ کو نہ پوچھے اب کوئی مجھ کو
تغافل ہی مرے حق میں علاج درد ہجراں ہے

عزیز اللہ رے بہجت نرالے ہے الطافِ شاہانہ
دکن کی سرزمیں کا ذرہ ذرہ گل بداماں ہے

موسیقی

جناب محمد احمد علی صاحب

اگر اس قول کو تسلیم کیا جائے تو حسن اور موسیقی جاذبیت میں بین بین ہیں "دیپک راگ" کی شعلہ فشانی "میگھ ملہا" کی پانی برسانیوالی روایات کو صحیح نہ بھی تسلیم کیا جائے تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موسیقی کی کشش بے اثر ہوتی ہے۔

ماہران موسیقی کا خیال ہے کہ دنیا کا ہر ذی روح موسیقی سے محظوظ ہوسکتا ہے۔ معمولی مثال بین پر افعی کا جھومنا ہے جس کو ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ موسیقی کا رواج چین میں تین ہزار سال قبل مسیح سے پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۲۷ ق م میں جب کہ ہوانگ ٹی بادشاہ تھا ایک ماہر فن لنگ سن کو حکم دیا کہ وہ موسیقی کے اصولوں کو قلمبند کرے۔

قدیم مصریوں میں لکھی ہوئی موسیقی کے روبرو بیٹھکر ڈھول، بانسری، بگل وغیرہ بجانے کا رواج پایا جاتا ہے۔ یہودیوں کے وہاں بھی کئی آدمی مل کر گایا کرتے تھے۔ یونانیوں نے چہ جائیکہ موسیقی کو کوئی علمی درجہ نہیں دیا لیکن عملاً وہ بھی موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بانسری اون کے یہاں بھی بہت مقبول تھی۔ چنانچہ افلاطون بھی موسیقی کی اہمیت کا قائل تھا۔ اہل یورپ کی ابتدائی موسیقی کا حال بہت کم معلوم ہوسکا ہے۔ بربط جس کو سب سے پہلے یونانی روایات کے مطابق اپالو نامی نے کچھوے کی ہڈی پر تاروں کو لگا کر تیار کیا تھا۔ سب سے پہلے آئرلینڈ میں رواج پایا۔ عربوں کے طریق موسیقی کو بڑی حد تک اہل برطانیہ نے قبول کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی یورپی موسیقی میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں یورپ نے اس فن میں بہت ترقی کی۔ چنانچہ ایک ایک وائلن پر ہزاروں پونڈ صرف کئے گئے۔ دنیا کا قدیم ترین بربط بمقام اُر سنہ ۱۹۲۴ء میں دستیاب ہوا۔ ہندوستان اس فن میں بہت پیش پیش ہے۔ قدیم سے یہاں کے بسنے والے اس فن سے واقف تھے۔ منھ سے بجانے، تاروں، اور ڈھول کی قسم کے ساز یہاں قدیم سے رائج تھے۔ برٹش عجائب خانہ میں قدیم بابل کی موسیقی کا ایک نمونہ مٹی کی تختی پر کندہ کیا ہوا محفوظ ہے۔ یہ بہت کچھ اس چینی موسیقی سے ملتا جلتا ہے جو دو انگلیوں سے آٹھ تاروں کے رباب پر بجائی جاتی تھی۔

ہندوستان میں قدیم سے مذہبی رسوم وغیرہ گا کر ادا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ بھجن وغیرہ اس بات کی کافی دلیل ہیں۔ مندروں میں پجاریوں کے بھجن اور "مرلیوں" کے رقص، دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور عبادت کے طور پر گائے جاتے ہیں۔

موسیقی کی جاذبیت ہی کی وجہ سے کلام، مذہبی تبلیغ کی کوشش کیگئی ہے۔

موسیقی کی ترکیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اجزاء کی آواز جس کو "لے" کہتے ہیں اور سروں کے پھیر بدل سے ان گنت راگ بجائے جا سکتے ہیں جو انسانی دماغی کاوشوں کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور جس کی وجہ سے فن کار ایک بہترین سماں باندھ سکتے ہیں۔ ہر شخص کیف حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ بہ نسبت جاہل کے صاحب فہم کافی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی کے کمال کا باعث وہ تاثر ہے جس کا وجود ہندوستان کے مشہور فلسفے میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی بعض طرزیں ایسی بھی ہیں جو انسان کو تڑپا دیں یا بحر استغراق میں اس قدر غرق کر دیتی ہیں کہ انسان کو مافیہا کی تک خبر نہیں ہوتی۔ اسی لئے اکابر ملت اشتغال موسیقی کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اور کوئی موسیقی ہندوستانی موسیقی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ موجودہ دور میں دیکھا یہ جا رہا ہے کہ موسیقی میں جہاں ترقی چاہئے تھی وہاں انحطاط واقع ہو رہا ہے۔ اس پر ایک کاری ضرب "فلمی" دھنیں جو لگا رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی بعض فلمی کمپنیاں موسیقی کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی موسیقی میں "تال" کو بڑا دخل ہے۔ "تال" سے ہٹ کر کوئی راگ اپنی اصلی حالت پر نہیں رہ سکتا۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ راگوں کیلئے اوقات مقرر ہیں۔ مطلب یہ کہ بے وقت کا "راگ" رونا ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقی طور پر کہاں تک ممکن ہے نہیں معلوم البتہ یہ خیال ہے کہ بعض راگ سکوت میں اچھے معلوم دیتے ہیں چاہے وہ دن ہی میں ہو یا بوقت نیم شب، حقیقت میں موسیقی کا لطف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ عالم پر سکوت چھایا ہوا ہو، اور دھیمے سروں میں کوئی جانفزا راگ چھڑا ہوا ہو۔ دوسرے کیف ونشاط کی محفلیں موسیقی کیلئے اتنی موزوں نہیں جتنا کہ ایک پُردرد دل!

کہتے ہیں کہ تانسین دیپک راگ کی تاثیر اکبر کو دکھلایا تھا جس سے بجھی ہوئی شمع روشن ہو گئی تھی۔ اور وہ خود بھی اس راگ کی حدت سے تڑپنے لگا تھا۔ ایک ہندوستانی فن کارہ اس کو "میگھ ملہار" سنا کر اس گرمی سے نجات دلائی تھی۔ اگر اس کا کچھ بھی اثر موسیقی میں ہے تو پریشان دلوں کو اس سے بچنا چاہئے۔ کیونکہ اس فن سے دلچسپی رکھنے والے جن کے دلوں میں ہزاروں آرزوئیں پنہاں ہوتی ہیں۔ موسیقی ان پر تیل کا کام کرتی ہے ؛

ناہید

جلد ۵ شہریور ۱۳۵۱ف مطابق جولائی ۱۹۴۲ء نمبر ۱۰

۱۔ پھلوں والا مضمون، پڑھئے مگر فرمایئے کتنے ایسے ہیں جو اس پر عمل کریں گے۔ کتنے ایسے ہیں جنھیں وقت پر کافی غذا میسر ہوتی ہوگی۔

۲۔ داستان الم، کا بقیہ حصہ پڑھئے۔ ہماری درخواست ہے ساحرہ آئندہ اشاعت کیلئے اور بھی دلچسپ فسانہ بھجوائیں۔

۳۔ مکتوبات جمیل، طرز تحریر نہایت شگفتہ ہے اور اس کے ساتھ ہی بہت کچھ مسائل حل کئے گئے ہیں جو ہمارے سوچنے اور عمل کرنے کے خواہاں ہیں۔

۴۔ ڈاکیہ، کا شاید آپ کو بھی اسی طرح انتظار رہتا ہوگا کیونکہ یہ قاصد خوش خرام ہوتا ہے۔

۵۔ انتظار، سے آپ بھی کبھی نہ کبھی دوچار ہوئے ہونگے۔

۶۔ اچھو۔ نجم شاہ نے بہت دنوں لکھا ہے مسلسل لکھنے کا وعدہ شرمندہ ایفا نہیں ہوا۔ ۷۔ آنسو۔ مختلف جذبات کا اظہار کرتے ہیں مگر وہ آنسو جو کسی یتیم کی بیکسی پر ٹپکے قابل صد احترام ہوتا ہے۔ ۸۔ عزرائیل کی ڈائری کا یہ ایک مختصر سا نوٹ ہے۔ اگر تفصیل سے کام لیا جائے تو شاید ناہید کے اوراق بھی کافی نہ ہونگے۔ ۹۔ دربار اکبری کا رتن فیضی سے آپ بھی واقف ہیں۔ نگارندہ مضمون نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے میں خدا جانے کونسی خوبی دیکھی ہے۔ (ب)

پھل اور خوبصورتی

جمیلہ بیگم کلکتہ

صنف نازک کی حسن کی افزائش کے متعلق بلبشار نسخے ایجاد ہو چکے ہیں لیکن جس غذا کے ذریعہ ہم جسمانی صحت کیساتھ خوبصورتی میں اضافہ کرسکتے ہیں وہ پھل ہے۔ بکثرت تازہ پھلوں کا استعمال معدے کو درست رکھتا ہے جسم کی موزونیت بڑھاتا۔ اور حسن و رنگت کو نکھارتا ہے۔

خصوصیت سے اگر گرمیوں کے موسم میں ہر قسم کے مرغن اور ایسے مصالحہ دار کھانوں کو جن سے حرارت زیادہ پیدا ہوتی ہے کم کردیا جائے اور صبح کے ناشتہ اور دوپہر اور رات کے کھانوں پر پھلوں سے انتہا کی جائے تو گرمیوں میں ضعف معدہ خرابی جگر اور گرانی کبھی نہ ہونے پائے۔ نفخ کا پتہ بھی نہ رہے اور طبیعت ہلکی رہنے کی وجہ سے بشاش اور چست رہے صبح کے ناشتے سے پیشتر نارنگی، سنترے یا بیدانہ کے عرق کی ایک پیالی چا کی ایک پیالی سے زیادہ فرحت بخشتی ہے۔ صرف عادت ڈالنے کی دیر ہے۔ کم از کم ایک ماہ اگر یہ عمل جاری رکھا جائے تو پھر اس کا فائدہ بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے صبح کو نارنگی کے عرق کے ساتھ ایک تازہ سیب بھی کھانا چاہیئے۔ اس سے بھی زیادہ مفید نتائج رونما ہوں گے۔ پرانا مقولہ ہے AN APPLE A DAY. دن کے کھانے پر گریپ فروٹ کھانا چاہیئے یہ خوبصورتی بڑھانے میں بے نظیر ہے اس کا عرق خون سے فاسد مادوں کو علیحدہ کرکے شفاف بنانے میں ید طولی رکھتا ہے۔ ہزاروں مصفی خون دوائیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔ آنکھوں کی چمک بڑھانے اور رنگت کی صفائی میں بھی یہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ دوپہر کو روزآنہ ایک نارنگی استعمال کرنے سے پیاس کی شکایت نہیں ہوتی گرمیوں میں اس سے جو تسکین اور فرحت پینے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کچھ وہی جانتے ہیں دوپہر کے کھانے کے بعد ایک سیب کھانا دانتوں کی صفائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ غذا کے ذرات دانتوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جو سیب چبانے کی وجہ سے نکل آتے ہیں۔ چونکہ اس میں فولاد کا عنصر کافی ہے لہذا اس کے عرق کی تیزی غذا کی تحلیل میں دواؤں سے زیادہ کام دیتی ہے۔ منہ سے جو کھانے کی بدبو آنے لگتی ہے وہ سیب کھانے سے دور ہو جاتی ہے۔ رات کو سونے سے پیشتر روزآنہ ایک سیب کھا لینا بھی بہت سودمند ہے اس سے بےخوابی کی شکایتیں بھی دور ہو جاتی ہیں اور آرام سے نیند آنے لگتی ہے۔ اناس بھی بہت مزیدار اور مفید پھل ہے اس کے استعمال سے جگر کی تمام خرابیاں دور ہوتی ہیں۔ اس کی مٹھاس ذیابیطس کے مریضوں کے لئے بھی نقصان دہ نہیں۔ بھوک کی افزائش کیلئے یہ مشہور ہے۔ عموماً گرمیوں سے لیکر جاڑے کے آغاز تک ملتا ہے۔ یہ پھل دیسی اس قدر زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ البتہ سنگاپور

کا ذائقہ بہت ہی رنیلی اور ذائقہ دار ہوتی ہے۔

گرمیوں میں پھلوں کی آئس کریم بہت لذیذ تیار کی جا سکتی ہے۔ آئس کریم گھر میں تیار کرنی چاہئیے۔ بلکہ بازاری آئس کریم اور قلفیاں ہرگز نہیں کھانی چاہئیں کیونکہ عموماً ان کے استعمال سے طرح طرح کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ بازاری آئس کریم کی کئی قسمیں ہیں ایک تو وہ جو پیکٹ میں لپیٹ کر بازاروں میں بیچی جاتی ہے یہ عموماً زیادہ مہنگی ہوتی ہے اس لئے عوام اس کو استعمال نہیں کر سکتے۔ دوسری وہ جو آئس کریم کی مشین میں بنتی ہے اور برف فروش دو پیسے چار پیسے کی گلی کوچوں میں نکال نکال کر بیچتے ہیں اس پر مکھیاں بھنکتی پھرتی ہیں اور بار بار چمچہ ڈال کر نکالتے اور جھوٹے میلے برتنوں میں دینے کی وجہ سے ان برتنوں کے جراثیم آئس کریم میں مل جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا دودھ بھی ناقص اور عموماً نقصان دہ ہوتا ہے تیسری قسم قلفیوں کی ہے۔ میلی میلی ٹین یا الومینم کی قلفیوں میں دہی وغیرہ ڈال کر غلیظ آٹے سے ان کے منہ ڈھکنے چپکا دیتے ہیں۔ پھر ایک میلی سی ہانڈی میں برف شورہ اور نمک ڈال کر اس کو سر پر لئے لئے پھرتے ہیں۔ اسی کو چھوٹے آدمی اور بچے خرید کر بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ کیا گھر پر آئس کریم بنانا مشکل ہے جو پیسے خرچ کر کے ہم بیماریوں کو مول لیتے ہیں۔ حالانکہ گھر پر بنائی ہوئی آئس کریم اور آئس فروٹ نہایت لذیذ فائدہ مند اور اسی قیمت پر با فراط ہوتی ہے۔

جن کے گھروں میں رفریجرٹر ہیں وہ تو روزانہ بہ آسانی پھلوں کے لذیذ شربت تیار کر کے آئس فروٹ اور کریم ڈال کر تیار کر سکتے ہیں لیکن جہاں یہ آسانی میسر نہیں وہاں بھی آئس کریم کی مشین میں تھوڑی محنت سے خود آئس کریم بنا کر گرمیوں میں کھانا بہت لذیذ اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ عموماً دعوتوں میں کھانے کے بعد زردہ متنجن میٹھے ٹکڑے وغیرہ کھلائے جاتے ہیں۔ اگر ان کے بجائے دعوتوں کے مرغن اور محرک کھانوں کے بعد آئس کریم کی ڈش رکھی جائے تو یہ زیادہ مرغوب اور فائدہ بخش ہوگی۔

داستانِ الم

ساحرہ

بسلسلۂ گذشتہ

پتہ نہیں معلوم انھوں نے کیسے اور کہاں کہاں کی تلاشی لی مگر جب وہ کمرے سے باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں خون آلودہ اور میرا شب خوابی کا وہ لباس تھا جس پر خالہ کی گردن سے خون کے چھینٹے اڑ کر پڑے تھے۔

" دیکھئے خاتون" ایک نے کہا۔ ہم نے آپکے کمرے کی مجبوراً تلاشی لی تھی کیونکہ خاتون محترمہ فرزانہ سے معلوم ہوا تھا معزز کاؤنٹس صباح فاخرہ کی قاتلہ آپ ہیں (تلوار و کپڑے دکھا کر) اور اس کا ثبوت ہمیں مل گیا۔

" کیا ــــ" میں چیخ پڑی۔ پھر مجھے خبر نہیں کہ انھوں نے کیا کارروائی کی۔ جب آنکھیں کھلیں تو فرزانہ نے مجھے بھینچ کر لپٹا لیا " آہ اس قصر کی مالکہ یوں گئیں اور اس کی وارث اب یوں چلی۔ آہ محسن کش لڑکی۔ مجھے معلوم ہے پیاری شہزادی قاتلہ کون ہے۔ وہی آپ لوگوں کی منظور نظر غزالہ ــــ انسان کے بھیس میں شیطان ۔"

میں نے فرزانہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا " فرزانہ ــــ مالک کے لئے یہ الفاظ پھر نہ دوہرانا۔ کیا تمہیں نہیں خیال کہ غزالہ کو خالہ کس قدر چاہتی تھیں۔ پھر اس پر کیوں مصیبت لاتی ہو؟"

" مصیبت ؟" فرزانہ نے حقارت سے کہا " ہرگز نہیں ــــ اسے اپنے فعل کا انجام بھگتنا پڑے گا۔ اف کس قدر بھیانک انجام ہو رہا ہے اس معزز خاندان کا ــــ صرف ایک ذلیل صفت محسن کش لڑکی کی بدولت ۔"

" فرزانہ خاموش رہو اس سے زیادہ نہ کہو۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی اور میں خاموش کچھ سوچ رہی تھی۔

" میں عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں جمیل بیگ کا سہارا لئے کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آہ میں بدنصیب ایک معزز خاندان کی چشم و چراغ اور خود ذلیل مجرم ــــ سب کے سامنے ذلیل ترین لڑکی ــــ جو اپنے خاندان کو تباہ کرنے والی ۔ لوگوں کی نفرت انگیز نظریں میرے نصف کھلے ہوئے چہرے پر تھیں ۔لیکن قصر کی تمام قدیم خادمائیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں انھیں یقین تھا کہ ان کی شہزادی مجرم نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔

" کیا تم صفائی میں کوئی گواہ پیش کرنا چاہتی ہو ؟" عدالت نے سوال کیا ۔

میرے دماغ میں خالہ صباح کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ " صاحی۔ تم سے ۔ التجا ہے ــــ غزالہ کو بچا لینا " ــــ اور دل میں غزالہ کی محبت کا دریا موجزن تھا۔

" جی نہیں " عدالت کے مکرر اس سوال پر میں نے کپکپاتی آواز میں کہا ــ نفرت انگیز نظریں حیرت سے پھیل گئیں اور ایک بے معنی سا شور سنائی دینے لگا۔

" کیا تم جرم کا اقبال کرتی ہو ؟" عدالت نے پھر پوچھا

" جی ہاں " ــــ مجھے اطمینان ہو گیا کہ خالہ کی روح مسکرا رہی ہو گی۔

تماشائیوں میں شور سا مچ گیا مگر عدالت کے حکم پر فوراً ہی خاموشی چھا گئی ۔

" کیا تم کو اس کا اعتراف ہے کہ تم نے معزز خاتون کاؤنٹس صباح فاخرہ کا خون کیا ہے ؟" عدالت کا یہ سوال سن کر میں رک گئی ۔ زیادہ نہ کہہ سکی کیسی گھڑی

صبح میں ڈوب گئی۔
"جواب دو!" عدالت کے حکم نے مجھے چونکا دیا۔
"جی"۔
"جی کیا ——؟ کیا واقعی تم نے معزز کاؤنٹس مباح فاخرہ کا خون کیا ہے؟"
"ہاں" —— میں آپ میں نہ تھی ممکن تھی بیہوش ہو جاتی۔
"تم نے خون کیوں کیا؟"
"معلوم نہیں!"
"کیا معلوم نہیں؟ عدالت کا سوال ہے کہ تم نے خون کس لئے کیا؟"
"نہیں بتا سکتی ——"
"بتانا چاہیئے!"
"نہیں بتا سکتی!"
"اچھا فیصلہ کل سنایا جائیگا"
دوسرے دن فیصلہ معلوم ہو گیا۔ مجھے سات سال قید سخت کی سزا رعایت کے ساتھ ملی تھی۔
جمیل بیگ روز آیا کرتے ایک دن کہنے لگے "شہزادی میں نے اصلی مجرم کا پتہ لگا لیا"
"کیا؟" میں چونک پڑی۔
"گھبرائیے نہ مجھے معلوم ہے کہ مجرم کون ہے؟"
"کیا واقعی؟" میں رک گئی "نہیں محترم یہ آپ کا خیال ہے۔ ورنہ گناہگار تو میں ہی ہوں اب کسی اور کو کیوں پھنسائیے۔
"شہزادی آپ کی فطرت —— اف کس قدر بلند ہے۔ آپ کا ایثار بے نظیر ہے۔ کسی کو بچانے کیلئے آپ بے گناہ معصوم نے اتنا بڑا جرم اپنے سر لیا۔" میں نے سر جھکا لیا۔
"یہ جگہ آپ کیلئے نہیں۔ آپکا محل آپکے بغیر سوگوار ہے۔ وہ پر رونق محل اب اس قدر بھیانک معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں برسوں سے انسانیت کا گذر نہیں۔ آپ کو چلنا پڑے گا۔ ہم یہ کبھی نہیں گوارا کرسکتے کہ اونچے محلوں میں رہنے والی معزز شاہزادی زندان کی آہنی سلاخوں کے درمیان بسر کرے۔ مجھے معلوم ہے معزز شہزادی کے قاتلہ غزالہ ہے۔ اصلی قاتلہ —— ایک محسن کش لڑکی" —— جمیل بیگ غصہ میں بپھرے ہوئے اٹھکر جانے لگے۔
"ٹھہر جائیے" —— وہ رک گئے "دیکھئے جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب خاموش رہئے۔ میں خود اس زندان میں بسر کرنا چاہتی ہوں جمیل صاحب خالہ میرے لئے اور میں خالہ کیلئے تھی۔ جب وہ نہ رہیں تو میرا کیا کام۔ محل میرے لئے ایک دہشت ناک جنگل سے زیادہ بھیانک ہے پھر جب غزالہ بھی چلی جائیگی تو میں محل کی مضبوط دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑ لونگی۔ جمیل صاحب میں یہیں خوش ہوں۔ مجھے رہنے دیجئے" میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

کیسی طفلانہ باتیں کرتی ہیں آپ شہزادی ۔۔ یہ ناممکن
ہے آپ کا یہاں رہنا غزالہ کو بھگتنا پڑے گا اپنے کئے
کا پھل۔ شہزادی میں اب جاتا ہوں اور پولیس انسپکٹر کو
تحقیق کیلئے بلواتا ہوں میرے پاس بیشمار ثبوت ہیں آپ
کی بے گناہی اور غزالہ کے جرم کے ۔۔۔۔"

"جمیل آفندی ۔۔۔ غزالہ معصوم لڑکی ہے
اس پر رحم کیجئے۔ اسے تکلیف میں دیکھکر خالہ مرحومہ کی
روح کو تکلیف ہوگی۔ وہ اسے بیحد چاہتی تھیں۔" اور
آپ کو تکلیف میں دیکھکر یقیناً آپ کی خالہ کی روح خوش
ہوگی ۔۔ کیوں؟" جمیل آفندی نے نہایت حقارت سے
کہا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں اپنا کام کرنے"

" نہیں مالک کیلئے نہیں۔ غزالہ اب پشیمان ہوگی
وہ فطرتاً نیک لڑکی ہے۔
جمیل آفندی۔ مجھے حیرت ہے اس نے کیسے یہ حرکت کی
میری التجا سُن لیجئے ۔۔۔۔

" نہیں اب میں کچھ نہیں سُن سکتا۔"

" جمیل صاحب" ۔۔۔

آپ فرشتہ ہیں شہزادی ۔۔۔

ذرہ نوازی۔ میں گناہگار فرشتہ کی برابری
نہیں کر سکتی" یکایک ہم دونوں چونک پڑے غزالہ میلے سے
رنگ کے لباس میں پریشان چہرہ لئے داخل ہوئی۔

"غزالہ" ۔۔۔ میں دوڑ کر اسے لپٹ گئی۔ تھوڑی
دیر بعد وہ الگ ہو کر بولی۔

"صباحی۔ جاؤ۔ جاؤ۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ آہ"
میری روح میرے گناہوں کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑا صباحی
میں نے کیا کیا۔ میں پاگل ہوگئی تھی۔ خالہ صباح ۔ امی سے
زیادہ مجھے چاہنے والی۔ آہ میں بدنصیب محسن کش لڑکی
صباحی مجھے معاف کرو۔ اور جاؤ یہاں سے جاؤ۔ (میرے
ہاتھ میں کڑیاں دیکھکر وہ چیخ پڑی) صباحی یہ کیا ہے؟
اسے نکال دو۔ جلدی۔ صباحی مجھے معاف کرنا۔ میں ہوش
میں نہ تھی مجھے ایک عارضہ تھا۔ عرصہ سے۔ لیکن میں بہت تندرست
ہوگئی تھی۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوگیا۔ آہ میں نے بیہوشی
میں اتنا بڑا جرم کیا۔" میں پھر اسے لپٹ گئی اور تھوڑی دیر
تک ہم دونوں سسکیاں بھرتی رہیں۔

"شہزادی۔ جلدی چلئے۔ اس ناپاک جگہ سے دور
یہ جگہ گناہگاروں اور سیاکاروں کیلئے ہے۔ آپ مقدس
روح ہیں چلئے کہیں اس ناپاک جگہ کا عکس آپ کی آئینہ
سی فطرت پر نہ پڑ جائے" میں نے چونک کر دیکھا تو عارف
پاشا جیلر کھڑے مندرجہ بالا الفاظ ادا کر رہے تھے اور
وہاں جسٹس سر یعقوب پولیس انسپکٹر رفعت پاشا اور
بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ میں اور غزالہ دونوں اُٹھ
کھڑی ہوئیں اور اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپا لیا۔

"معزز شہزادی چند دنوں سے لوگ آپ سے حقارت
کرنے لگے تھے مگر اب اصل واقعہ معلوم ہو جانے سے آپ کی
حقیقت سب پر واضح ہوگئی ہے۔ اس انکشاف سے آپ پہلے
سے زیادہ معزز و ہر دلعزیز ہوگئی ہیں" جسٹس سر یعقوب نے کہا

"شہزادی ہمیں معاف کیجئے جو ہماری لاپروائی کی وجہ سے آپ کو اس قدر تکلیف سہنی پڑی اگر جب ہی ہم اچھی طرح تحقیقات کرتے تو ایسا کیوں ہوتا خیر اب تو تحقیقات سے آپ کی بیگناہی سب پر عیاں ہو گئی ہے۔" انسپکٹر عارف پاشا کہہ رہے تھے جمیل بیگ مسکراتے ہوئے بڑھے اور کڑیاں میرے ہاتھ سے الگ کر کے زمین پر ڈال دیں۔ میں بھی مسکرا اٹھی مگر دوسرے ہی لمحہ میرے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ جب میں نے دیکھا کہ جیلر نے کڑیاں غزالہ کے سفید نازک ہاتھوں میں ڈال دیں۔ ممکن تھا میں بیہوش ہو کر گر پڑتی اور سر پھوٹ جاتا۔ اس وقت ہمیشہ کے غموں سے چھٹکارا پا لیتی۔ مگر افسوس جمیل بیگ اور کنیز نرگس نے سہارا دے کر بچا لیا۔

" ایکدم صدمات سے میں سخت بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے نہایت تندھی سے علاج کیا مسلسل ایکماہ مجھے دنیا کی کوئی خبر نہ رہی۔ پھر رفتہ رفتہ حالت درست ہوئی جس دن میں اٹھنے کے قابل ہوئی میں نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا کہ اپنی غزالہ سے ملنے جاؤنگی۔ لیکن فرزانہ نہایت حقارت سے بولی "اونہ کہاں جائینگی وہ تو اپنے کردار کو پہنچیں۔"

" فرزانہ"۔ میں نے بگڑ کر کہا "تم کو ایسی باتیں کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ خبردار اب اس طرح نہ کہنا غزالہ کو۔ تمھیں نہیں معلوم وہ کتنی اچھی لڑکی۔ اس نے جان بوجھکر نہیں بلکہ بیہوشی کے دوران میں جرم کیا تھا۔"

" اچھا ٹھیرئے میں جمیل افندی کو بھیجتی ہوں آپ ان سے کہیئے"۔ تھوڑی دیر بعد جمیل بیگ داخل ہوئے اور صوفے پر بیٹھکر پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے بولے " مبارک شہزادی صاحبہ —— آج کا دن کس قدر خوشگوار ہے کہ آپ پلنگ سے اٹھنے کے قابل ہوئیں فرمائیے کس لئے یاد فرمایا ہے آپ نے"۔

" دیکھئے میں غزالہ سے ملنا چاہتی ہوں وہ تنہائی سے گھبرا گئی ہوگی اور مجھے تو بہت یاد کرتی ہوگی"۔ جمیل بیگ ایکدم چونک پڑے پھر سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولے " ہوں۔ تنہا کیوں ہونے لگی۔ بہت سے لوگوں کیساتھ اور بہت مسرور ہے۔ مگر آپ فی الحال تو اس سے مل نہیں سکتیں، کیونکہ وہ آج کل بغداد کے جیلخانہ میں ہے وہاں سے ایک ماہ بعد یعنی ماہ آئندہ کی دس تاریخ کی صبح کو آئیگی"۔

" اچھا کیا میں اسے خط لکھ سکتی ہوں۔ کیا پتہ ہوگا؟"

نہیں خاتون خط تو آپ نہیں لکھ سکتیں۔ بس ایکماہ انتظار کیجئے پھر شاید وہ آزاد ہو جائے گی۔ ہاں جس وقت میں نے اسے دیکھا وہ بہت مسکرا رہی تھی" یہ سن کر میں بھی مسکرا پڑی۔

ایک مہینہ میں نے دن گن گن کر کاٹا روز جمیل بیگ سے پوچھا کرتی اب کتنے روز رہ گئے ہیں اور اس سے ملنے کی مسرت میں میں ہر وقت بشاش رہا کرتی۔ کافی تندرست ہو گئی تھی مگر خالہ صباح کو یاد کر کے بلا ناغہ روزانہ دو ایک گھنٹہ ضرور رو لیا کرتی۔

دس تاریخ کو تین روز باقی رہ گئے تھے میں نے
جمیل بیگ سے کہا " افندی غزالہ تین روز میں آجائیگی تا
---- اگر اسے محل میں آنے کی اجازت نہ ملی تو آپ
میرے رہنے کا بھی وہیں زندان میں ہی انتظام کر دیجئے گا۔
" زیادہ کیا چھپاؤں شہزادی " جمیل بیگ نے
آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا " خدا کے فضل سے آپ
اب اس قابل ہیں کہ اس خبر کو برداشت کر سکیں۔
شہزادی آپ کی غزالہ اب اس دنیا میں نہیں "
" کیا ---- ؟ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ " ناممکن۔
ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں،
جمیل افندی ؟ "
" صبر شہزادی میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک صبح
جب اس کے لئے ناشتہ گیا اور زندان کا آہنی دروازہ
کھولا گیا تو اس کا جسم سرد و نیلا ہو چکا تھا پوسٹ مارٹم
سے معلوم ہوا کہ اس نے ہیرے کی کنی کھا کر خودکشی کی
ہے " اس سے ایک دن پہلے اس نے بلا کر مجھ سے کہا کہ
" افندی میں نے غفلت میں جرم کیا ہوش میں رہ کر
میں ایسا جرم ہرگز نہ کر سکتی۔ آہ مجھے خالہ اور صباحی سے
بے پناہ محبت ہے۔ مگر میری بدقسمتی ---- افندی مجھے
اس سے تین سال پہلے اس قسم کا عارضہ دوبارہ ہو چکا
لیکن خون میں نے کبھی نہیں کیا تھا " غزالہ کے آنسو
دیکھکر اور اس کے الفاظ سن کر مجھے اس کی معصومیت کا
یقین آگیا تھا مگر بیچاری ---- " جمیل بیگ خاموش
ہو گئے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے میری آنکھیں خشک
تھیں۔ میں پاگلوں کی طرح اطراف میں کھڑی ہوئی کیٹرو
اور جمیل بیگ کو دیکھ رہی تھی " مگر آپ نے مجھ سے
یہ خبر کیوں پوشیدہ رکھی " ؟ میں نے دریافت کیا۔ تو
کہنے لگے۔ " شہزادی آپ کی جان ہمیں عزیز تھی یہ خبر
آپ کو بیماری اور کمزوری میں سنا کر کیا ہم آپ کی جان
جوکھوں میں ڈالتے " ؟ تین چار روز تک میری حالت
پاگلوں کی سی رہی۔ مجھے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ اس
کے بعد میں دس روز وہاں اور رہی پھر سیاحت کی
غرض سے چلی آئی۔ میں نے تقریباً نصف دنیا کی سیر کی
ہے۔ لیکن مجھے کہیں کوئی دلچسپی نہیں نظر آئی۔ دنیا
کی کوئی مسرت میرے لئے کشش نہیں رکھتی۔ مجھے بس
خالہ صباح اور غزالہ کی یاد اور آنسو بہانا بہت محبوب ہے
اچھا خاتون شہلا خدا حافظ۔ اب میں کہیں دوسری جگہ
جا رہی ہوں مجھے ایک جگہ رہنے سے وحشت ہوتی ہے۔

فقط دلفگار صباحی یا فرسانی

مجھے یہ داستان پڑھکر پانچ سال پہلے کے بغداد
ٹائمز کی ایک خبر یاد آگئی جو بالکل اس داستان سے
ملتی ہوئی تھی۔

مکتوبات جمیل

خدیجہ محمد یونس

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے   کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

شہلا! یہ مسلسل "چپ" کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تمھیں مخاطب کرنے کی جسارت میرے لئے عجیب کیوں ہو؟ میں نے بارہا تمھیں پکارا ہے۔ مانا کہ یہ مدھم سی شکستہ آواز دنیا کے شور وغل میں مدغم ہوکر کبھی تمہارے نازک کانوں تک نہ پہنچ سکی ہو، ایک ٹوٹے ہوئے ساز کے بے سُرے نغمے تم سُن کر بھی کیا کرتیں ـــــ کہتے ہیں دل کی آواز ہمارے تنگ سینہ کی لامحدود وسعتوں میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہے اور کبھی نگاہوں کے چور راستے اسے باہر نکلنے کی بھی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر شہلا پیاری! میں نے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند رکھیں اور انشاء اللہ کبھی انہیں افشائے راز کا موقع نہ دوں گی۔ عورت کے جذبات ـــــ شہلا، گہرے اور خاموش ہوتے ہیں۔ تم خود ستائی نہ کہو اسے۔ مرد کے جذبات وقتیہ اور ہنگامی۔ خدا کرے کبھی میں ایک پختہ کردار کی ’عورت‘ ثابت ہوسکوں۔

تم فیروزنگر کی اونچی نیچی سنگلاخ چٹانوں عمیق وادیوں اور وحشی درختوں میں تنہا گھومتی رہتی ہو۔ کبھی تم اپنے دارالمطالعہ کی کھلی ہوئی دریچی میں خاموش بیٹھی کوئی کتاب دیکھا کرتی ہو۔ تم کہتی ہو اس وقت تمہارا دل بےاختیار چاہتا ہے کہ میں تمہارے پاس ہوتی۔ شہلا یہ خود میری زبردست خواہش تھی۔ کل ہی صبح بھائی جان سے میں کہہ رہی تھی۔ نسائیت کی زنجیریں مجھے فیروزنگر جانے کی اجازت دیتیں۔ پھر میں بھی بتاتی۔ مجھ میں سب کچھ بھول جانے کی قوت ہے۔ دنیا مجھے چاہے کسی نظر سے دیکھے شہلا، میرا ضمیر آزاد ہے اور میں اسی میں خوش ہوں۔ میری جن حرکات کو تم لغزش کہہ رہی ہو وہ خود میرے نزدیک زبردست مجبوری ہے۔ عذرا کے خط میں ایک جگہ تم نے لکھا ہے "چھپنے کی کوشش مت کرو تم۔ من خوب می شناسم"۔ ہاں تقدس مآب ـــــ مجھے بھی اعتراف ہے " تو خوب می شناسی"۔ مگر یہاں حالت بالکل برعکس۔

تمہارے بعض جملے کتنے پیارے ہوتے ہیں شہلا۔ ادبی حیثیت سے میں نہیں کہتی۔ ان کی تاثیر دیکھو۔ درد گھولدیا ہے جیسے۔ اسی بناء پر میں تمھیں "ساحرہ" کہوں تو کیا بیجا ہے۔ بعض وقت دوسروں کی بیقراری ہمیں بیقرار کردیتی ہے اور یہی عارضی اضطراب مستقل کرب کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ شہلا تمہاری طرح آگ لگا کر تماشا دیکھنے والوں کی دنیا میں کمی نہیں۔

ننگسگور سے واپسی پر موٹر لڑھکتی سنبھلتی ایک ننھے گاؤں کی گندی گلیوں میں سے گذری ــــ شہلا کیا پوچھتی ہو کیا دیکھا۔ کسی پرانے قبرستان کی طرح شکستہ مٹی کے مکانوں کا انبار۔ جن کی دیواروں پر گوبر تھپا ہوا تھا بدبو ــــ تم کہو گی بجمہ چرکین کی سی بکواس کر رہی ہے۔ مگر تم کیا جانو یہ ان فاقہ مستوں کی ننگی تصویر ہے جو دو مٹھی چنوں کی خاطر سخت ترین محنت پر آمادہ ہیں۔ جن کا نیم عریاں بدن سارا سارا دن گرم ممالک کے آگ برساتے ہوئے سورج تلے جھلستا رہتا ہے۔ تم نے ان کے بچوں کو دیکھا ہے ــــ؟ زرد، زرد رنگ۔ لاغر بدن، چہروں پر حسرت اور بیکسی۔ زندہ ہیں جن پر مردوں کا دھوکہ ہوتا ہے۔ زیادہ کیا کہوں مجھ سے زیادہ خود تم واقف ہو۔ شہلا بے اختیار یہی جی چاہتا تھا اس آبادی میں اتر پڑوں۔ ہمیں کیا حق ہے بہنا۔ یوں شاندار موٹروں میں گھومنے بلند کوٹھیوں میں رہنے اور آرام دہ گدوں پر سونے کا ــــ؟ کیا یہ غریب ہم سے زیادہ مستحق نہیں، ہم غاصب نہیں، ظالم نہیں؟

تمہاری نام نہاد تعلیم یافتہ سوسائٹیاں مجھے ململ کی ساڑی میں قبول نہ کریں تو کوئی پروا نہیں۔ ان زر پرستوں کی خود میری نظر میں کوئی وقعت نہیں شہلا۔ تم کسی شادی کی دعوت میں جاتی ہو۔ اس وقت تمہاری سب سے بڑی خواہش یہ کہ تمہارے جسم پر بہترین قسم کا زیور ہو، تمہاری ساڑی سب سے زیادہ بھڑکیلی ہو۔ دیکھنے والیاں تمہیں تحیر خیز نگاہوں سے دیکھیں۔ تمہارے جہاں تاب حسن کو سراہیں۔ عام محفلوں میں تمہارے چرچے ہوں۔ یہی تمہاری سب سے بڑی عزت ہے۔ شہلا پیاری مجھے معاف کرو تو میں اسے تمہاری تنگ نظری کہوں گی۔ تمہاری یہ تمنا، غور تو کرو کسقدر طفلانہ ہوگی۔ اور غالباً اسی وجہ سے مائیں بڑی تنخواہ والا داماد اور ساسیں "جہیز لانے والی" بہو ڈھونڈتی ہیں۔ یاد رکھو سوسائٹی میں یہ زہریلے اثرات ہم عورتوں ہی کے پھیلائے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ہمیں قرضداری اور افلاس کی لعنت میں گرفتار کروا دیا ہے۔ تمہارے پاس تعلیم یافتگی کا معیار کیا ہے ــ؟ کسی بڑی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لینا یا کم از کم ایک جملہ میں تین چوتھائی انگریزی بول دینا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم عام ہونے کے باوجود ہمارے ملک کی اخلاقی حالت اتنی گری ہوئی ہے۔ "سوشل" کہلانے کی سب کو خواہش ہے مگر انسانیت ان انسان نما ہستیوں کو چھو تک نہیں گئی۔ شہلا۔ اف ــــ معاف کرو۔ میں بہت بھٹک گئی۔ کیا کہہ رہی تھی میں ــــ؟ ہاں یہ کہ میرا دل وہاں اتر پڑنے کو چاہا۔ موہنی۔ تمہیں وہ خواب یاد ہیں۔ اسکول کے خوشگوار ایام میں جب ہم ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے حوض کے کنارے گھوما کرتے تھے۔ تم کیا کرتیں۔ "بجمہ جب ہم بڑے ہو جائیں گے نا ہماری سمجھ بوجھ سیانی ہو جائیگی ہم کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو ہماری ایک چھوٹی سی کٹیا ہوگی ــــ دور کسی ننھے گاؤں میں۔ ہم روز وہاں جایا کریں گے۔ ان مصیبت کے ماروں کی خدمت کریں گے۔ انہیں رہنے کا ڈھنگ سکھائیں گے۔ انہیں تعلیم دیں گے۔

" میں جھک کر تمہاری طرف دیکھتی "یہ پہلے ماسٹر صاحب بن جاؤ" پھر ہم دونوں ہنسنے لگتیں ۔ شہلا میں سمجھتی ہوں ، ان خوابوں کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے ۔ تم گھبراتی کیوں ہو ۔ تمہارا استقلال واقعی قابل ستائش ہے ۔ جو کام تم انجام دے رہی ہو وہ بجائے خود ایک عبادت ہے ۔ خدا تمہیں برکت دے ۔" راہ گیروں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔

للیتا پور کا نقشہ تم نے کچھ عجیب بکیسانہ انداز میں کھینچا ہے ۔ روح تڑپ اوٹھتی ہے ۔ یقین جانو وہ تمہارا پہلا خط پڑھ کر میں رات بھر نہ سو سکی ۔ تم بار بار "دور افتادہ" یا "تم سے کوسوں دور" نہ لکھا کرو شہلا ۔ دل پر ضربیں لگتی ہیں اور میرا تخیل مجھ مجھ سے کوسوں دور ـــــ ایک نئی سرزمین میں لیجاتا ہے جہاں تم آباد ہو اور میں مسافت کی دوری کا اندازہ لگانے میں گھنٹوں گم ہو جاتی ہوں ۔ کیا واقعی تم مجھ سے اتنی دور ہو ـــــ ؟

تم کہتی ہو "دعا میرے نزدیک کسی نا قابل فہم" نا قابل دید ہستی یا قوت کی طرف اپنی غرض وغایت کا منسوب کرنا نہیں بلکہ از خود اپنی ہی ذات سے اپنی ہی عاملانہ قوتوں سے کام لینا ہے ۔ اور جب اس طریقہ پر دعا کیجائے تو یقیناً قبول ہوگی" خدا جانے اس نظریہ کے تحت تمہاری "معصوم دعا" میرے حق میں کیا اثر کریگی ۔ شہلا تمہارے ان پیارے پیارے جملوں کو اگر میں چراؤں تو کہو تمہیں بُرا لگیگا ـــــ ؟ اچھا خدا حافظ ۔ پھر ملیں گے اگر حالات اجازت دیں ۔

تمہاری نجمہ

ڈاکیہ

مسز عظمت عبد القیوم خاں

اے ڈاکیہ کتنا اچھا ہے تیرا فریضہ ! لوگ تیرے آنے کے کتنے منتظر رہتے ہیں اور تیرے آنے سے کس قدر خوش ہوتے ہیں ۔ میرا تو یہ حال ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تیرے آنے کا وقت کونسا ہے ۔ دس مرتبہ نوکر سے دریافت کرتی ہوں "آیا ڈاکیہ" جاہل نوکر سوچتے ہوں گے کہ کیا لاتا ہے آخر ڈاکیہ ؟ یہی نا کاغذ کے چند ٹکڑے ! ان کے لئے بیگم صاحبہ کیوں اسی قدر بے چین اور منتظر رہتی ہیں ؟ وہ کیا جانیں کہ تو جو چیز لاتا ہے وہ کتنی قیمتی ، کتنی سکون افزا ، اور کتنی مسرت بخش ہوتی ہے ۔ جس روز تو میری عزیز سہیلیوں میں سے کسی کا خط لاتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ تیرا چھٹا پرانا ......

بھر دوں گا سیم و زر سے تیرے نامہ بر کو میں

اور جس روز تو میرے پیارے ابا اور امی کے شفقت خیز نامے لاتا ہے تو میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے دل میں

تیری کتنی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ میں تجھے اپنا محسن سمجھتی ہوں۔ اور اس احسان کا بدلا کیونکر ہوسکتا ہے میں نہیں جانتی اتنے قلیل معاوضہ پر اتنی محنت! میلوں دوڑ دھوپ!! وقت پر پہنچنے کا خیال۔ ایک روز کا واقعہ میں کبھی نہ بھولوں گی۔ ہم گاؤں سے آرہے تھے۔ ایک ڈاکیہ نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا نظر آیا۔ جیسے ہی اس نے ہماری موٹر کی آواز سنی یہ سمجھکر کہ "موٹر بس" ہے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا۔ جتنا تیز وہ دوڑ سکتا تھا دوڑ رہا تھا۔ یہ بہت ممکن تھا کہ موٹر اس سے آگے بڑھ جاتی لیکن یہ دیکھنے کے لئے کہ آخر یہ کبتک اتنا تیز دوڑیگا۔ ہم نے موٹر بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اچانک وہ دم سے سڑک پر گر پڑا۔ ہم نے فوراً موٹر روک لی۔ قریب جاکر ہمدردانہ دریافت کیا کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ وہ جب کچھ سنبھل گیا تو گاڑی کو دیکھا کہ "بس" نہیں "اسپیل کار" ہے تو بیچارہ خفیف ہوگیا پھر اس نے تبلایا کہ سامنے بس اسٹانڈ ہے اور بس آنے سے پہلے اس کو وہاں پہنچ جانا ضروری ہے۔

اس واقعہ نے مجھے بیحد متاثر کیا کہ ان پڑھ بھی کس قدر فرض شناس ہوتے ہیں۔

عزرائیل کی ڈائری کا ورق

وحیدہ خاتون نسیم

۶ر ڈسمبر ۱۹۴۱ء

سردیوں کے آغاز نے مغربی ممالک کی مصروفیات ختم کردیں یہ ایسی مصروفیتیں ہیں کہ ابتک روزنامچہ لکھنے کیلئے وقت نہ ملا۔ ۶ر ڈسمبر ۹-۳۵ منٹ پر صبح کو آصف آباد گیا۔ یہاں ایک ۲۰ سالہ نوجوان لڑکے کو عدم آباد کی سیر کرانی تھی اس کی والدہ کی حالت واقعی قابل رحم ہے ابھی ابھی اس نے ہنس ہنس کر اپنے بیٹے کو رخصت کیا۔ بیٹا سیر کے لئے دریا پر گیا تیرتے تیرتے گہرائی میں پہنچ گیا۔ میرے لئے یہی موقع تھا۔ میں نے اپنا فرض انجام دیا گو کہ مجھے اس کی موت کا افسوس ضرور تھا، مگر کیا کرتا؟ حکم یہی تھا۔

ایک بج کر ۳۰ منٹ پر کلکتہ گیا وہاں مجھے ڈاکٹر اسمتھ پر عنایت کرنا تھا میں مٹیا برج کے اوپر سے ہوتا ہوا اس کے کوٹھے کے صحن میں اترگیا اور وہاں سے زینہ سے برآمدہ میں گیا اور ڈرائنگ روم سے ہوکر بلا اجازت اس کی خوابگاہ میں داخل ہوگیا۔ حالانکہ یہ خلاف تہذیب تھا مگر مجھے اس سے کیا سروکار؟ ڈاکٹر اسمتھ اس وقت بائیں کروٹ سورہے تھے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ تندرست اور توانا ہیں۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور کام کرنے سے پہلے

اپنی نوٹ بک نکالی تاکہ شناخت میں دھوکہ نہ ہو........ میں اپنا کام ختم کرکے واپس ہوا۔ عین اسی وقت مسنر استم کمرے میں داخل ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب کو پکارنے لگیں میں کمرے سے باہر نکل گیا..........

۵ بجے شام شملہ پہنچا یہ خوشگوار مقام مجھے پسند ہے مگر میں اپنی ڈیوٹی یہاں زیادہ انجام نہیں دیتا چنانچہ ادھر ادھر سیر کرتا رہا ۸ بجے شب نور روزجی کے بنگلہ پر پہنچا...... مکان نہایت صاف ستھرا تھا اور زبان حال سے کسی کے حسن سلیقہ کی داد دے رہا تھا ایک کمرے میں نور روزجی صاف ستھرے بستر پر لیٹے ہوئے تھے چند گھنٹہ قبل ڈاکٹر جوہن نے برانڈی پلائی تھی۔ پلنگ کے گرد اطبا کا ہجوم تھا "ایک ڈاکٹر نے کہا فی الوقت خطرہ رفع ہو گیا ہے" دوسرے نے کہا " سر پر برف رکھئے" تیسرے نے مارفیا کا پانچواں انجکشن دینے کی تیاری کی۔ میں نے گھڑی دیکھی صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے

...... نور وزجی نے آنکھیں کھولیں اور اپنے بیٹے پستم جی کو قریب بلایا...... انھوں نے اپنی حالت پہچان لی۔ اور کہا " کاش مجھے اتنا وقت ملجائے کہ میں وصیت نامہ پورا کرسکوں"...... "ہاں بیٹا دیکھو میری جائداد میں سے

...... ہاں ڈاکٹر تم گواہ رہنا...... ہاں تو میری جائداد میں سے نصف........

بھلا میں ان کو ایک یا دو منٹ کیا ایک لحہ بھی زیادہ نہیں دیسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا فرض انجام دیا پستم جی باپ کی لاش پر گر کر رونے لگے...... مجھے اس بوڑھے پر ذرا بھی رحم نہ آیا کیونکہ حضرت انسان اس قدر حریص ہیں کہ بقول خود حضرت انسان کے کہ :-

ہم کیا رہے جہان میں آج آئے کل چلے گر عمر خضر بھی ہو کہیں گے بوقت مرگ

پانچ بجے صبح...... اب مجھے لکھنو کی ایک نازنین کو دنیا کی جھنجھٹ سے چھڑانا تھا..... گیا... یہ اس وقت گومتی کی سیر کر رہی تھی جس کا حُسن خداداد تھا.... گومتی کے پرفضا کناروں پر...... سرسبز میدانوں میں پھرتی ہوئی وہ ایک آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی اس کے نرم لچکدار اور سیاہ بال .نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے رقص کر رہے تھے غرض کہ وہ ایک پیکر حسن تھی مگر مجھے حسن سے سروکار؟...... وہ ٹہلتے ٹہلتے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی...... پھر نہ جانے کیا سوچ کر اٹھی..... ملاح کو بلایا اور کشتی میں سیر کرنے لگی......

کشتی بھنور میں چلی گئی...... اور پھر... غرق ہو گئی۔ بس یہی وقت میرے کام کا تھا.........

میں نے فہرست نکالی...... ابھی دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ بارگاہ خداوندی سے احکام صادر ہوئے کہ مشرقی ہند میں سنگاپور اور ملایا کی طرف رخ کروں...... میں نے جنتری پر نظر دوڑائی۔ سات ڈسمبر کی صبح تھی......

اب شاید مجھے عرصہ تک روزنامہ لکھنے کی فرصت نہ ملے کیونکہ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے اور میرا کوئی اسسٹنٹ نہیں۔

انتظار

نزہت سلطانہ

اجل کی فردوسی پری اپنے سنہری پروں سمیٹ مسکراتی ہوئی بڑھی۔ میری پرشوق نگاہوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ خوابگاہ کے نیلگوں دریچوں سے نور کی رنگین شعاعیں سفید نرم بستر پر اس طرح پھیل گئیں جیسے جھیل کے عمیق اور چمکدار پانیوں پر سورج کی سنہری کرنیں جگمگاتی ہیں۔ اس نے بے پناہ آرزوؤں ناتمام ارمانوں کے ہجوم سے نکال کر پرمحبت اور ناز آفریں انداز سے اپنے آغوش میں لیلیا۔ درد وکرب کی مسلسل شورشوں سے اکتائی ہوئی بیمار آنکھیں و نور طرب سے آخری بار چمک اوٹھیں اور پھر ہمیشہ محو خواب ہوگئیں۔ خوابیدہ روح پر ایک ناقابل بیان سکون ایک لطف انگیز راحت۔ ایک جان نواز تبسم ایک دائمی مسکراہٹ چھاگئی۔

علالتوں کی تلخ اذیتوں نہ ختم ہونے والے کرب انگیز دنوں ناتمام ہونیوالی اندوہگین راتوں کے بعد یہ کتنی دلنواز کتنی لطیف کتنی کیف پرور اور سرور آمیز نیند ہے۔

جس میں علالت کی ستم خیزیوں کیلئے کوئی بھی راہ کھلی ہوئی نہ رہی۔ فردوسی دریچوں سے آسمانی فرشتوں نے نیلوفر اور کنول کی ریشمی پتیاں سرخ اور زرد گلاب کے شگفتہ پھول بکھیر دئے۔

آسمان کی لامحدود وسعتوں پر ایک خواب آسا لیکن سحر انگیز روشنی پھیل رہی تھی جس میں مدت کے بچھڑے ہوئے محبوب دوست معبود جانے کب سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ فنا کی دیوی نے نگاہ اٹھائی تو نیچے آخری تاریخوں کے چاند کی سفید روشنی میں تھکے ماندے تیمار داروں کے مضمحل چہرے عجیب طرح کا ستم انگیز منظر پیش کر رہے تھے۔

فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے۔

اٹھو ——!

نجم شاہ

اٹھو ——! کیونکہ دن گذر رہا ہے اور تم ابھی خواب ہی میں مبتلا ہو —— دوسروں نے اپنے زرہ بکتر سنبھال لئے ہیں اور لڑنے چلے گئے ہیں —— اور —— صف میں تمھاری جگہ خالی ہے —— ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے —— حال کے سامنے ماضی و مستقبل کچھ نہیں ——

اٹھو ——! اپنے مستقبل کے خوابوں سے جاگو —— کیونکہ میدان میں جیتنا مشکل ہے —— اپنے خیالی قلعوں سے نکل آؤ —— اور —— فوجوں کو آگے بڑھنے کا حکم دو —— اسی حکم میں تمہارے مستقبل کی ترقی پوشیدہ ہے —— تمہاری عزت (خدا کرے کہ بڑھے) —— تمہارے بازو —— آج کی طرح پھر مضبوط نہ رہیں گے اور نہ تمہاری خواہشات حال کی مانند ——

اٹھو ——! کہ ماضی تمہیں روک رہا ہے —— اس کے واقعات کو بھول جاؤ —— کیونکہ ماضی کی زنجیروں کو پکڑنے سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں —— رنج ہو یا خوشی —— وہ ہمیشہ کیلئے گذر چکی ہیں —— اس کی خیالی لذت کو بھول جاؤ۔ —— پیچھے مڑکر تم اسے کیوں دیکھتے ہو —— جبکہ آج کے بکھیڑے تمہارے سامنے پھیلے ہوئے ہیں۔ ——

اٹھو ——! کیونکہ دن گذر رہا ہے —— جو آواز تم سُن رہے ہو یہ لڑائی پر جانے والے بہادروں کے قدموں کی ہے —— جانتے ہو یہی نشان انہیں مستقبل میں کامیاب کریں گے —— اپنے ہتھیاروں کو سنبھالو، ورنہ یہ وقت گذر جائے گا —— اور تم اپنے خواب سے جاگو گے تو ان جنگی لمحات کو ماضی میں پاؤ گے —— (ماخوذ)

دربار اکبر کا دوسرا رتن

ش - ف

فیضی ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ فاضل ابوالفضل سے پانچ برس بڑا تھا کمسنی میں عربی علوم پر کامل عبور حاصل کیا اور پھر بنارس میں ایک فاضل برہمن سے سنسکرت میں تعلیم پائی۔ اکبر کے دربار میں گو اور بھی کئی مسلمان تھے جنھیں خاصی سنسکرت آتی تھی لیکن ابوالفیض فیضی سنسکرت میں اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھتا تھا۔

فیضی سنسکرت عربی شاعری پر ایسا حاوی تھا گویا روز ازل ہی میں اس کی سرشت میں آمیز ہو چکا تھا منطق، سائنس، فلسفہ میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا اول جب کہ دربار میں پہنچا ہے تو اورلیسید داروں کی طرح چاندی کے کٹہرے کے باہر کھڑا کیا گیا۔ اس کے اندر وہی شخص داخل ہو سکتے تھے جو درباری یا ارکان سلطنت تھے پاس آنے کی اجازت نہ ملتی تھی۔ جب فیضی کٹہرے کے قریب آکر کھڑا ہوا اور اس نے بدیہہ یہ قطعہ پڑھا۔

بادشاہا درون پنجرہ ام — از سر لطف خود مرا جا دہ

زانکہ من طوطی شکر خایم — جائے طوطی درون پنجرہ بہ

یہ بدیہہ قطعہ اکبر کو بہت پسند آیا اس نے فیضی کو فوراً کٹہرے کے اندر بلا لیا اور نوازشات سلطانی سے سرفراز فرمایا۔

شہاب

جلد ۱۱ دے ۱۳۵۲ف م نومبر ۱۹۴۲ء نمبر ۲

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسملؔ

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (۵عہ)
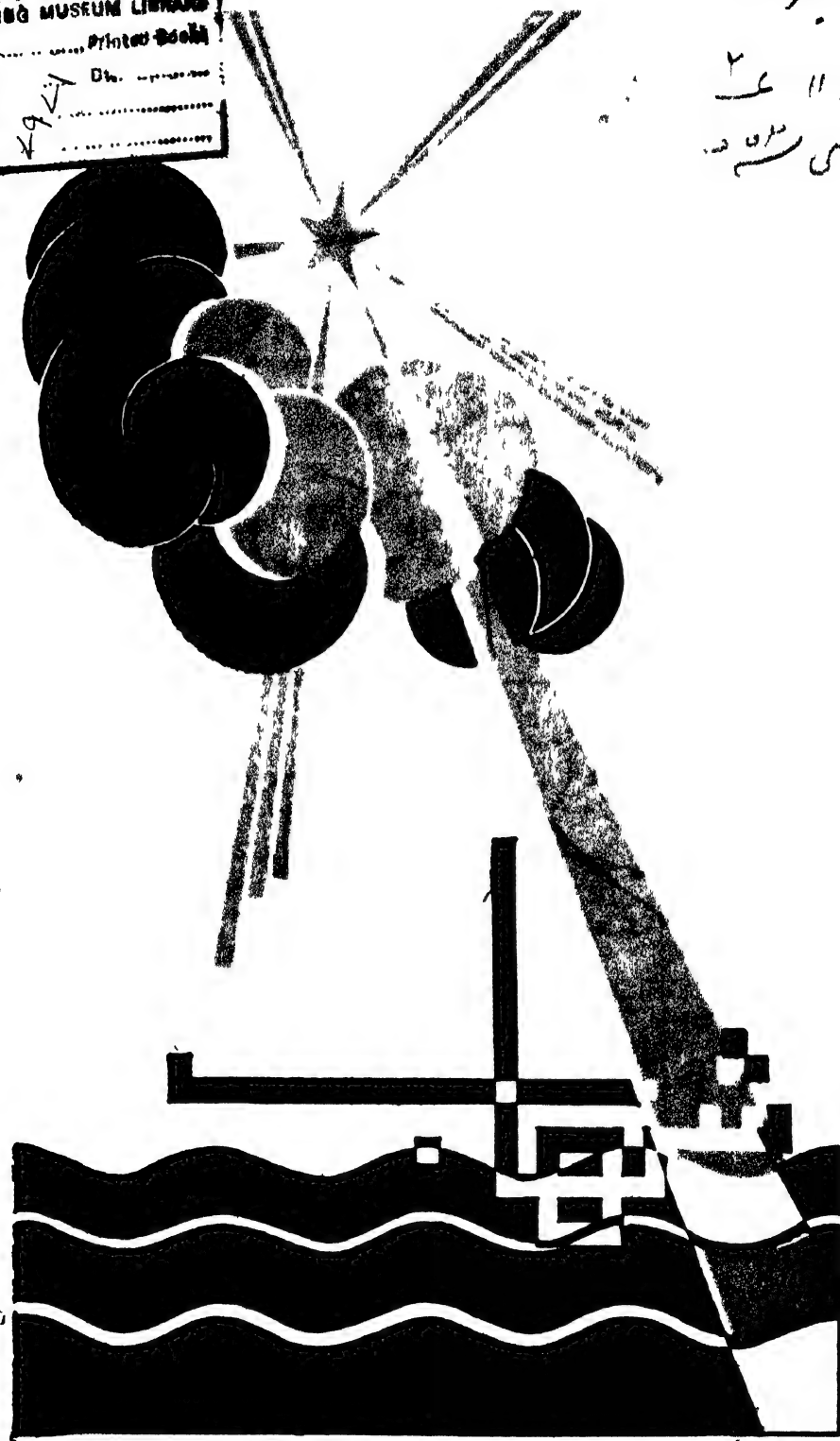
مستزاد

جناب مسلمؔ حیدرآبادی

دی آخر شب گشت یکے جلوہ پدیدار — بر دیدۂ خون بار
گفتم چہ فسوں بود کہ شد برمنِ ہشیار — اے کاشفِ اسرار
گفتا کہ فریب نظرت بود تجلّیٰ — اے عاشقِ شیدا
پنداشتی آں را تو خداوند چو موسیٰ — بر کوہِ مُعلّیٰ
گفتم کہ چرا ظلم کُنی برمن مجبور — بر عاشقِ مہجور
گفتا چہ کنم ہست اگر دیدۂ تو کور — چوں شپّرہ از نُور
گفتم کہ اگر چشم مرا نیست چہ باک است — ایں سینہ کہ پاک است
گفتا کہ بسینہ بنما گر دلِ چاک است — یا کوزۂ خاک است
مسلمؔ نتواں گشت بدونِ دلِ صافی — اے مرد گزافی
ذات است بعید از ہنر و وصفِ اضافی — افسانہ چہ بافی

"غایت حیات"

جناب میر ولی الدین صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا
استاذ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن

گذشتہ صحبت میں تم یہ مان چکے ہوکہ "خیالات ہی کے تغیر سے زندگی میں تغیر پیدا کیا جا سکتا ہے اور نقطہ نظر کے بدلنے سے زمین وآسمان بدل جاتے ہیں"۔ اب یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مقصود شخصیت ہی کا باطنی طور پر بدلنا ہے اور خیالات کا کامل تغیر، مقصود خارجی حالات کا بدلنا نہیں۔ اور زندگی کو نرم، آسان اور لذت بخش بنانا! یاد رکھو کہ جب تک تم آسان اور آسودہ زندگی کو مقصود قرار دے کر اس کی تلاش میں رہوگے تمھاری مشکلات بڑھتی ہی جائیں گی، اور تمھاری مثال اس شخص کی سی ہوگی جو بے وعدہ ساری عمر انتظار میں گذارتا ہے! یہ مقصود قابل حصول نہیں۔ ابو تراب بخشی نے اصل بات کہدی جب اس نے کہا "مردم در دنیا دو چیز طلبند و ہرگز نیابند راحت و فرحت، و آں ہر دو چیز جز در بہشت نبود۔ ؎

طلب الراحۃ فی دار الفنا ۔ خاب من طلب شیئاً لایکون[1]

اس مغالطہ سے فوراً نکل آؤ، اس بصری التباس میں کب تک گرفتار ہوگے، کب تک 'نار' کو 'نور'، 'خار' کو 'گل' سمجھ کر عمر خراب کروگے۔ زندگی کا مقصود تمھیں تن آسان بنانا نہیں بلکہ تمھیں قوی بنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے تم ہی میں تغیر کا پیدا ہونا ضروری ہے اور جب اس کی تکمیل ہوجائے تو تم دیکھوگے کہ خارجی حالات میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوجائے گا اور تمھاری مشکلات غائب ہوتی جائیں گی۔ اصل میں اب بھی حالات وہی ہیں جو پہلے تھے۔ لیکن یہ تمھیں پہلے مشکل نظر آتے تھے۔ کیونکہ تم تن آسان، خود غرض، بزدل تھے، اب جب کہ تم نے ان کمزوریوں کو دور کرلیا۔ اپنی ذات میں خوشگوار تغیر پیدا کیا، نقطہ نظر بدل گیا، ماحول بھی باوجود نہ بدلنے کے بدل گیا! یہ معنی ہیں اس شعر کے ؎

چوں برخیزد خیال از چشم احول ۔ زمین و آسماں گردد مبدل

تمھیں زندگی جو دیوانہ کا خواب نظر آتی ہے جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ تم خود ہی تو جنون میں مبتلا ہو!

---

[1] اس دار فانی میں راحت طلب کرتا ہے! جو شخص ایسی چیز کا طلبگار رہتا ہے جو پائی ہی نہیں جاتی وہ بیشک ناامید ہوکر رہے گا۔

عزت نفس کا خیال تمھیں اجازت نہیں دیتا کہ جنون کی نسبت اپنے دماغ کی طرف کرو، اس کی نسبت تم "دنیا" کی طرف کرتے ہو اور اسی کو ملعون اور مطعون قرار دیتے ہو جب تک اس مغالطہ میں مبتلا رہو گے حالات درست نہ ہوں گے اور زندگی کی موسیقی بے سری رہے گی! یاد رکھو کہ زندگی میں آفات و مصائب کا ورود بے معنی اور عبث نہیں ہوتا، یہ محض تمھارے عذاب اور اذیت ہی کی خاطر وارد نہیں ہوتیں۔ یہ نتیجہ ہوتی ہیں تمھارے باطنی مرض کا، قلب کی کمزوری اور اخلاق کی ابتری کا۔ یہ تمھیں کچھ سبق دینے آتی ہیں، ان کے درد پر تم دیوانہ کی طرح پیچ و تاب نہ کھاؤ۔ اور قسمت اور ماحول کو کوسنے مت لگو، دنیا تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے معلم ہیں۔ تربیت زندگی کے تجربات ہی کے ذریعہ دی جاتی ہے، آلات تربیت یا تو دوسرے افراد انسانی ہیں یا واقعات زندگی۔ اس تربیت کا مقصود تزکیہ باطن ہے، سیرت سازی ہے اور ربط بہ حق پیدا کرنا ہے۔ درد الم، رنج و غم سے انسان اپنی سیرت کی کمزوریوں کو پہچانتا ہے، نقائص سے واقف ہوتا ہے، اب اگر وہ عقلمند ہے تو ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جب ان کی اصلاح ہو جاتی ہے تو مصائب کا نزول بھی موقوف ہو جاتا ہے۔ یہ سبق دینے آتی تھیں اور اپنے مقصد کے حصول کے بعد فوراً غائب ہو جاتی ہیں۔ اگر ان کی موجودگی سے سبق نہ لیا جائے تو یہ اور سخت ہوتی جاتی ہیں، ان کے نشتر تیز تر ہوتے جاتے ہیں۔ زمانہ کی لگد کوب اتنی بڑھتی ہے کہ ہمیں مجبوراً ان کی طرف توجہ کرنی ہی پڑتی ہے۔

کیا زندگی کو تم نے ایک تفریحی سفر (   ) سمجھ رکھا تھا؟ راحت و آرام، آسائش و آسودگی مقصد حیات تھا؟ جوں جوں اس مقصد کے حصول کی تم نے کوشش کی تم نے پایا کہ زندگی کی تکلیفیں بڑھ رہی ہیں، راستہ کٹھن ہو رہا ہے! وجہ کیا ہے؟ وجہ یہی ہے کہ تم نے حیات کی ماہیت صحیح سمجھی نہ اس کی غایت۔ ہمیں آرام و آسائش کے لئے نہیں پیدا کیا گیا اور نہ ہمیں اس کی خواہش کرنی چاہیئے۔ یہ مقصود بالذات ہرگز نہیں۔ زندگی کا مقصود سیرت سازی ہے اور دنیا "غم کی وادی" اس لئے ہے کہ سیرت کی اصلاح کے لئے غم سے زیادہ موثر شئی نہیں۔ غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہوتا ہے، روح کا تجلیہ ہوتا ہے۔ تم لذت کو خیر سمجھتے ہو اور اس کی وجہ سے زاغ و زغن کی طرح مردار شئی سے لپٹے رہتے ہو۔ نعم تمھیں للکار کر کہتا ہے۔

تا بکے ہمچو زناں ایں راہ و رسم و رنگ و بو — راہ رنداں گیر و با صاحبدلاں دمساز شو

چو زغن تا چند باشی بستۂ مردار تن — در ہوائے سنزجان یک لحظہ در پرواز شو

غم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے قلبی امراض کا معالجہ کر لیا، نفس کی تطہیر میں کامیاب ہو گئے۔ ایمان اور عمل صالح سے

مزیّن ہوگئے تو یاد رکھو کہ تم نے "فوز عظیم" حاصل کیا! گو دنیا وی معنی میں تم کامیاب نہ سہی، یعنی نہ تم نے دولت جمع کی نہ مشہور خاص و عام ہوئے۔ طمانیت خاطر، بردقلبی کے لحاظ سے تم ہی "لہم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا والآخرہ" کے مصداق ہو۔

دنیا طلب دنی بہ دنیا آرزو — مفتون تمنا بہ تمنا آرزو
در عالم ایجاد ندیدیم حزیں — چیزیکہ بدل بستگی ! آرزو (علی حزیں)

بلبل کے نام پھولوں کا تار

جناب ظفر علی خاں صاحب

گجر دم بلبلوں کے نام پھولوں کا یہ تار آیا — کہ رخصت ہوگئی فصل خزاں عہد بہار آیا
نسیم اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گذری خیاباں سے — اور اس کے پیچھے پیچھے ابرِ مروارید بار آیا
طیورِ صبح خواں کا نغمہ گونجا شاخساروں میں — وہ نغمہ جس کو سُن کر جانِ مضطر کو قرار آیا
زمیں پر آسماں کی رحمتیں اتریں صف اندر صف — خدا کے فضل کا لشکر قطار اندر قطار آیا
پرستارانِ خاک کعبہ کی قسمت چمک اوٹھی — نئی تقدیر کے سانچے میں ڈھل کر روزگار آیا
بقدرِ منزلت بخشی گئی آزار کی لذت — مسلمانوں کے حصہ میں دو عالم کا فشار آیا
مری مشکل کو دنیا میں نہ آساں کر سکا کوئی — مصیبت میں جو کام آیا مرا پروردگار آیا
نہ کیوں رہ رہ کے جبرئیل امیں چومے زباں میری — کہ محبوب خدا کا نام اس پر بار بار آیا

وہ اُمّی جس نے امت کو حیات سرمدی بخشی
وہ پیغمبر جو ہو کر شافع روز شمار آیا

(از زمیندار)

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

رسالہ ہندوستانی ادب بابتہ ماہ آبان ۱۳۵۱ف میں مولوی علی اختر صاحب تخلص اختر کی ایک دلچسپ نظم زیرعنوان "تجلیات" طبع ہوئی ہے - ہے تو یہ صرف چھ شعروں کی مختصر سی نظم مگر اس کا ایک ایک لفظ نقد و نظر کی دعوت دے رہا ہے - اگر کسی شعر کا مطلب و معنی سمجھ میں نہ آئے تو یہ اپنی سمجھ ہی کا قصور ہے کیونکہ عمداً تو کوئی بے معنی شعر نہیں کہتا البتہ بعض دفعہ الفاظ شاعر کا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں - بہرحال مطلب و مفہوم سے قطع نظر شایقین شعر و ادب کی ضیافت طبع نوجوان شعراء کے غور و فکر اور ادب اردو کی خدمت کی خاطر میں صرف اون الفاظ و محاورات اور طرز بیان کا تجزیہ کرکے بتانا چاہتا ہوں جن کی صحت میں ادبی نقطہ نظر سے شبہ کی گنجائش پائی جاتی ہے -

تری تجلی وہ معجزہ ہے کہ جب اٹھا دی نقاب تو نے ۔۔۔ تو خاک کے "شب پرست" ذرے بنا دئے آفتاب تو نے

"تجلی" بمعنی جلوہ کردن یعنی ظاہر ہونا یا آشکار کرنا - شعرائے فارسی نے ظہور نور کے معنی میں بھی اس کا استعمال کیا ہے جیسا کہ طور پر ہوا تھا - یہ مطلع حمد میں کہا گیا ہے اس لئے لفظ معجزہ کا استعمال بے محل ہے کیونکہ معجزہ صرف انبیا علیہم السلام کے خرق و عادات کو کہتے ہیں" - "تجلی" کو معجزہ کہنا بھی صحیح نہیں - مصرعہ ثانی میں تو وجوہ شکوک و شبہات ایک سے زیادہ ہیں -

۱ - "ذرے" کو شب پرست کس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں ؟ فارسی میں شب پرست یا شب پرہ چمگادڑ کو کہتے ہیں - ایک آفتاب کے نور سے چمکتا ہے دوسرے کو آفتاب کی روشنی میں کچھ نہیں سوجھتا اور یوں بھی دونوں میں مابہ الاشتراک کوئی صفت یا شباہت نہیں -

۲ - ذرہ کی جمع حالت مفعولیت میں "ذرے" غلط ہے "ذروں" کہنا چاہیئے - عام قاعدے کے لحاظ سے جس اسم مفرد کے آخر الف یا ہائے مختفی ہو اوس کی جمع حالت فاعلیت اور مفعولیت میں جداگانہ طریقہ سے بنائی جاتی ہے یعنی بحالت فاعلیت الف یا ہائے مختفی کو ہائے مجہول سے بدل دیتے ہیں جیسا کہ ذرہ سے ذرے - گھوڑا سے گھوڑے - اور بحالت مفعولیت الف یا ہائے مختفی کو حذف کرکے واؤ اور نون کے اضافہ سے جمع بناتے ہیں مثلاً ذرہ سے ذروں گھوڑا سے گھوڑوں -

(۳) " بنا دے " فعل متعدی بصیغہ جمع کا استعمال اس موقعہ پر صحیح نہیں نحوی قاعدہ یہ ہے جب جملہ میں کوئی فعل ایسا ہو جس کے دو مفعول ہوتے ہیں تو مفعول اول کے ساتھ علامت مفعول (کو) کا استعمال لازم ہے۔ چنانچہ فعل متعدی " بنا دینا " کے دو مفعول ہیں لہٰذا مصرعہ ثانی میں علامت مفعول (کو) کا حذف صحیح نہیں۔

(۴) جب جملہ میں مفعول کے ساتھ علامت مفعول کا استعمال ہوتا ہے تو فعل تابع مفعول نہیں رہتا وہ ہر حال میں واحد ہی آئے گا خواہ مفعول جمع ہی کیوں نہ ہو۔

نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مصرعۂ ثانی کی یہ نثر " خاک کے شب پرست ذرے تونے آفتاب بنا دے " غلط ہے صحیح عبارت اس طرح ہوگی۔ خاک کے شب پرست ذروں کو تونے آفتاب بنا دیا۔

مجھے اگر ناز ہے بجا ہے کہ اس فرومائگی کے ہوتے 	لیا تیرے غم نے قلب میرا کیا مجھے انتخاب تونے

" فرومائگی " کے معنی معروف کمینہ پن یا بداصلی ہے۔ " اس فرومائگی " سے کون سی یا کس نوعیت کی فرومائگی مراد ہے ؟ " قلب لیا " اردو میں تو نہیں بولتے اردو میں دل لینا یا دل چھین لینا بمعنی فریفتہ یا مفتون کرنا محاورہ ہے مگر اس مصرعہ میں " قلب لیا " کا فاعل " غم " ہے اس سے معلوم ہوتا ہے مصنف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تیرے غم نے میرے دل پر قبضہ کر لیا یا غم نے میرے دل کو اپنا گھر بنا لیا اس میں سے نکلتا ہی نہیں مگر الفاظ اس مطلب کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ قطع نظر اس کے غم ایک جذباتی کیفیت ہے جو فوت یا فقد مطلوب کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ شدائد غم پر ناز کرنا فطرت انسانی کے خلاف اور عجیب و غریب بات ہے۔ غم نے تو قلب کو لے لیا " مجھے انتخاب کیا تونے " کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ جس کے لئے غم تھا جب خود اوسی نے " غم زدہ " کو منتخب کر لیا تو غم کو خود بخود رفع ہو جانا چاہیئے اس متضاد کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ شعر مہمل ہو گیا۔

سکون ناکام آرزو کی ہے ایک ہمت شکن حقیقت 	حصول راحت کہاں نہ سمجھی جو فطرت اضطراب تونے

پہلے مصرعہ میں بہت بری تعقید واقع ہوئی ہے۔ " سکون " کی جگہ مصرعہ کے آخر میں ہے " ناکام آرزو کی ہمت شکن حقیقت سکون ہے " " ایک " کا لفظ تو بھرتی کا ہے مگر بحالت موجودہ شعر خود مطلب و معنی سے بے نیاز ہے۔ ممکن ہے مصرعہ ثانی میں کتابت کی غلطی ہوئی ہو۔

گل و برگ بار بنگئے ہیں بجائے خود ایک نظم دلکش 	پھر اے مغنی بزم فطرت کہاں سے چھیڑا رباب تونے

عجیب و غریب شعر ہے۔ کس درخت کے " گل و برگ و بار میں یہ طلسمی کیفیت کب اور کیوں پیدا ہوئی ؟ آخر اس کا کوئی سبب بھی تو ہو۔ قیاسات شعری بغیر ثبوت کے ادعائے بے معنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے

اس کے لئے علم بیان پر عبور کے علاوہ فکر و تخیل کی مشکل پسندی اور وسعت نظر کی بلندی بھی درکار ہے "گل و برگ و بار" کا "دلکش نظم" بن جانا درحقیقت بوالعجبی ہے - اس مصرعہ میں نظم کے معنی کلام موزوں کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے انہی معنی میں لفظ نظم کو طالب آملی نے بھی استعمال کیا ہے ؎

باایں طبیعت کج و ایں فہم دون اساس ۔۔۔ ہر اک سپردہ اند بخود نظم گستری

"معنی بزم فطرت" سے کون مراد ہے اور یہ کس قسم کا استعارہ ہے استعارے کا حاصل مشبہ کو عین مشبہ بہ قرار دینے سے زیادہ نہیں مگر یہاں اصلیت ہی مفقود ہے - دونوں مصرعوں میں کوئی ربط ہی نہیں پایا جاتا۔

نظم کی ایک قسم مثلث بھی ہوتی ہے جس کے تین مصرعہ ہوتے ہیں "گل و برگ و بار" کو بہ زعم خود تین مصرعہ قرار دے لئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں خواہ باہم کوئی علاقہ ہو یا نہ ہو -

وہی نظر آزما حقیقت جو عقل کا راز جستجو تھی - اوسی کو اے حسن اک تجلی میں کردیا بے نقاب تونے

"نظر آزما حقیقت" کیا چیز ہے - ایک حقیقت "ہمت شکن" گزر چکی یہ دوسری حقیقت ہے - کہتے ہیں عقل کی جستجو کا راز "نظر آزما حقیقت" تھا مگر عقل اوس کو نہ پا سکی "حسن" نے اوس کو اپنی ایک ہی تجلی میں آشکار کردیا مگر افسوس ہے کہ فہم و ادراک کے لئے "نظر آزما حقیقت" اب بھی عقدہ لاینحل ہی رہی۔

سپاس اہل نظر ادا کریں گے بنگیئں پردہ دار نظریں ۔۔۔ حجاب ٹوٹا تو اور پایا لطیف تر اک حجاب تونے

ٹھیٹ اردو میں سپاس ادا کرنا نہیں بولتے شکر ادا کرنا کہتے ہیں - "پردہ دار" اسم فاعل ترکیبی کے معنی ہیں دربان ؎

آنرا کہ عقل و ہمت و تدبیر و رائے نیست ۔۔۔ خوش گفت پردہ دار کہ کس در سرائے نیست

سپاس ادا کرنے کا فاعل نظریں ہے جن کا حجاب ٹوٹا وہ بھی نظریں ہیں اور جس نے لطیف تر پایا وہ بھی نظریں ہیں - شعر کے ذہن شاعر میں تو ضرور کچھ نہ کچھ معنی ہوں گے مگر فاعل "نظریں" بصیغۂ جمع حاضر اور اس کی ضمیر آخر مصرعہ میں بصیغۂ واحد مخاطب "تو" کس قاعدے سے صحیح ہو سکتی ہے ؟

حجاب ٹوٹنا کے معنی ہیں شرم دور ہونا -

گریاں کروں میں پھیر امقصد ملے نہ میرا ۔۔۔ جب تک حجاب تیرا پردہ نشین نہ ٹوٹے (جرات)

سپاس ادا کرنا بے شرمی تھی تو وہ دور ہوگئی مگر یہ "لطیف تر حجاب" کیا چیز ہے جو اس کے معاوضہ میں مل گیا - حجاب کی صفت "لطیف تر" تو بالکل انوکھی بات ہے غالباً یہ کسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو ظاہر

نہیں ہوتی۔ ✧

معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں (شیفتہ)

غزل

جناب سید سلطان محی الدین صاحب سیفؔ بی۔اے

سکونِ دل میں بھی حاصل ہے اضطراب مجھے
پسند کیوں نہ ہو دنیا کا انقلاب مجھے

چھپائے سے نہیں چھپتیں تجلیاں رُخ کی
دکھا رہا ہے تیرا پردہ حجاب مجھے

ملی تھی روز ازل جو شراب اے ساقی
پلانا ہو تو پلا پھر وہی شراب مجھے

شمار تیرے کرم کا جو ہو تو کیوں کر ہو
میرے گناہوں کا ملتا نہیں حساب مجھے

ستم کے بعد کرم ہے، کرم کے بعد ستم
دکھا رہا ہے یہ عالم تیرا عتاب مجھے

نگاہ ناز کا یہ معجزہ تھا یا افسوں
میرے سوال سے پہلے ملا جواب مجھے

زبان موج سے جو کچھ سنا کیا قصہ
دکھا رہا ہے وہی دیدۂ حباب مجھے

نظر فریب ہے کیا کیا یہ عالم اسباب
دکھائی دیتا ہے سیلاب بھی سراب مجھے

میں کیوں نہ سیفؔ کروں شکر اپنے ساقی کا
پلا رہا ہے مئے حُبِّ بُوتراب مجھے

"ریڈیو"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے (امرتسری)

ایک دیہاتی مدرسہ 'ہال کمرہ' چبوترہ پر میز اور میز پر ریڈیو رکھا ہوا ہے۔ میز کے قریب ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ریڈیو پر تقریر فرما رہے ہیں، ہال کمرہ طلباء سے بھرا ہوا ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ یہ تو آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس (ریڈیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) حیرت انگیز ایجاد کا خیال بتدریج کس طرح انسانی دماغ میں پیدا ہوا جس سے مغرب و مشرق اس طرح مل گئے ہیں کہ ان میں ایک انچ برابر فاصلہ نہیں رہا۔ آج ۱۹۴۲ء ہے، فی الحال ہم کرۂ ارض پر آوازیں سن رہے ہیں وہ وقت دور نہیں جب متکلم اور مخاطب روئے زمین کے کسی حصہ میں ایک دوسرے سے بالمشافہ گفتگو کریں گے ٹیلی وژن سے ہم وہ سب کچھ دیکھیں گے جو ریڈیو کے ذریعہ سُن رہے ہیں"۔

ایک طالبعلم۔ "میرے خیال میں یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت ہم اجرام سماوی کے باشندوں کی آوازیں سُن سکیں"۔

ہیڈ ماسٹر۔ "ہاں ممکن ہے بالکل ممکن"۔

دوسرا طالب علم۔ اس کا علمی فائدہ کچھ بھی نہیں، ہندوستانی زبانوں کا کچھ شمار نہیں ہو سکتا۔ اردو کے سوا میرے لئے سب باغی زبانیں ہیں۔ بر اعظم یورپ وغیرہ کی زبانوں کا علم کسے ہے۔ آسمانی بولیوں کا علم فرشتوں کو ہو تو ہو"۔

ہیڈ ماسٹر۔ "دیکھو، اگر بات میں بات پیدا کیجائے تو ہم اپنے موضوع سے بہت دُور جا پڑیں گے، آج ہم ریڈیو کے علمی فائدوں کا ذکر کریں گے"۔

آوازیں۔ "سنو، سنو"

ہیڈ ماسٹر۔ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، علمی فائدہ ضروریات زندگی کا پورا ہونا ہے خواہ یہ مادی ہو یا روحانی، میرے عزیزو، کیا آپ میں سے کسی کو معلوم ہے، کسی ایک علمی فائدہ کا علم ہے؟

ایک طالب علم۔ "سیاسی پروپانگنڈا"۔

دوسرا۔ (سوداگر کا بیٹا) مختلف ممالک کی تمام منڈیوں کا روزآنہ نرخ گھر بیٹھے معلوم ہو جاتا ہے۔

تیسرا۔ یہ مادی فائدے ہیں، روحانی غذا، راگ رنگ ـــــ"

ڈراما میں یہ واضح کرنے کی کوشش کیگئی ہے کہ ایک بازاری عورت کی زندگی کس طرح بسر ہوتی ہے جسے ہم گناہ کی زندگی کہتے ہیں وہ ایک نظریہ ہے اور عملاً اس کی تائید اور تصدیق نہیں ہوتی۔"

ہیڈ ماسٹر۔" لاحول ولاقوۃ، عزیزو، میں یہ ڈراما سننا پسند نہیں کرتا اور نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ آپ سنیں"

طلباء" آل انڈیا سٹیشن رہا ہوگا اگر ہم بھی سن لیں تو کیا مضائقہ ہے"

ہیڈ ماسٹر" نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ اس میں اخلاقی سبق بھی ہو۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ بہت تھوڑے ہیں جو اس سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اکثر گمراہ ہو سکتے ہیں"

طلباء۔" کیا مضائقہ ہے آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ریڈیو تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ کچھ اخلاقی تعلیم حاصل کریں گے"

ریڈیو۔" اخلاق کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے مفکرین کا نظریہ اس کے متعلق بھی مختلف ہے، ہر ایک ملک کی آب و ہوا کا اثر دل و دماغ پر مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اخلاق کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہو سکتی ایک بازاری عورت بھی جو زیور حسن سے آراستہ ہو بلحاظ سیرت بھی خوبیوں کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ اگرچہ عام عقیدہ کے مناسب یہ بات نہ ہو۔ لیکن جہاں تک اس نسوانی جماعت کا تعلق ہے یہ عمیق فلسفہ جو اس ڈراما کے سطحی مناظر میں پیش کیا گیا ہے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن مناسب ہے کہ آپ اس نادر فلسفہ کو بی زہرہ کے منھ سے سنیں۔ اس ڈراما کا پہلا سین بی صاحبہ کے مکان کے ایک کمرہ میں جو ہر طرح آراستہ ہے کھلتا ہے۔ محفل نشاط گرم ہے۔ موسیقی کے ساز بج رہے ہیں۔ قوم اور ملک کی امیدیں یعنی چند نوجوان تعلیم یافتہ جو مغربی تعلیم کے زیر اثر دین و دھرم کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ بیٹھے ہوئے سگریٹ نوش فرما رہے ہیں۔ ساغر بھی دور میں ہے، اور بی صاحبہ سورٹھ میں گا رہی ہیں۔

یہ زمانہ عالم خواب ہے، پئے تشنہ مثل سراب ہے | جو مکان ہے مثل حباب ہے جو مکین ہے نقش بر آب ہے
نہ پھرے عدم کو جو چل بسے، ہیں منزل اجزا کی خبر کسے | یہ یہیں کے ہیں سب مبلغے نہ ثواب ہے نہ عذاب ہے

ہیڈ ماسٹر۔ (ریڈیو کو بند کرتے ہوئے) " عزیزو میری طبیعت بہت بدمزہ ہو رہی ہے مناسب ہے کہ آج کی صحبت یہیں ختم کی جائے"

طلباء۔" مشاعرہ، مشاعرہ"

ہیڈ ماسٹر" وہ بھی کچھ ایسا ہی بدمزہ ہوگا۔ لیکن۔ لیکن۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس یہاں کی وضع

ہوجائے کہ ریڈیو تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے، اس بے زبان آلہ کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ دنیا جہان کی تمام بولیاں بولتا ہے۔ جسے اہل زبان خوب سمجھتے ہیں۔ اس کے دلکش نغمات سے ہر ایک شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جو موسیقی سے کم وبیش واقف ہو۔ دہلی اردو زبان کا مرکزی مقام ہے آج وہاں سے مشاعرہ نشر ہو رہا ہے۔ کس قدر حیرت انگیز مسرت کا مقام ہے کہ ہم یہاں ایک گاؤں میں بیٹھے سب کچھ سنیں گے۔ اور آپ کے معلومات میں ایک آدھ گھنٹہ میں اتنا اضافہ ہوسکتا ہے جو سال بھر کے مطالعہ کتب سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے جناب میسولینی کا یہ ارشاد کہ ریڈیو تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے۔ صحیح واقعات پر مبنی ہے۔

ریڈیو۔ "گھرار۔ گھرر۔ گھرار۔ یہ دہلی ہے۔ ہم دہلی کے آل انڈیا ریڈیو سٹیشن سے بول رہے ہیں، آج کی تازہ خبریں آپ کو سنائی جاتی ہیں، لندن۔ کل رات جرمن ہوابازوں نے برطانوی مشرقی ساحل پر بمباری کی، ایک بوڑھیا عورت اور ایک بچہ ہلاک ہوا۔ اور ایک جھونپڑے میں آگ لگ گئی جو فوراً بجھا دی گئی نقصان بہت کم ہوا۔ ہماری توپوں نے چار جرمن ہوائی جہاز مار نیچے گرائے۔ ہمارے طیاروں نے بھی مقابلہ کے لئے پرواز کی، بادلوں کی آڑ میں دشمن کے جہاز بھاگ گئے۔ لیکن اس پر بھی تین کو نشانا بنایا گیا جو سمندر میں گرتے ہوئے نظر آئے۔ ماسکو۔ روسی محاذ سے جنگ کے متعلق بہت کم خبریں موصول ہوتی ہیں۔ جرمن فوج نے روسی فوج کو خارخوف کے محاذ پر گھیرے میں لانے کی جو کوشش کی تھی ناکام ثابت ہوئی۔ جرمن فوج کو سخت جانی نقصان کے بغیر دور تک پسپا ہونا پڑا۔ قاہرہ۔ لیبیا میں بئیر حکیم پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اور دشمن کے حملوں کا جواب منہ توڑ دیا گیا۔ رنگون پر ہمارے طیاروں نے کامیاب بمباری کی۔ اتحادی جلدی ہی ایک اور محاذ جنگ مغربی یورپ میں قایم کریں گے۔ اس کے لئے واشنگٹن اور لندن کے ماہرین جنگ تیاری میں مصروف ہیں، آج کی خبریں ختم ہوئیں۔ اس کے بعد ایک مختصر ڈراما پیش کیا جاتا ہے، جس کا نام ہے 'لیل ونہار' اس کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک طوائف کی زندگی کے دن اور راتیں کس طرح گذرتی ہیں۔۔۔۔"

ہیڈ ماسٹر۔ (کچھ کھسیانے ہو کر) "کیا آپ یہ ڈراما سننا پسند کرتے ہیں"

طلبا۔ "کیا مضائقہ ہے، ریڈیو تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے ــــ"

ہیڈ ماسٹر۔ "اس میں کچھ شک نہیں کہ اس میں بھی اخلاقی سبق ضرور ہوگا"

طلبا۔ "بیشک، بیشک، ایسے ڈرامے تعلیم نسوان کا جزو ہوں تو ہونہار لڑکیاں زیادہ فائدہ میں رہیں"

ریڈیو۔ "گھرار ررر، یہ دہلی ہے۔ ہم دہلی سے بول رہے ہیں۔ ڈراما لیل ونہار پیش کیا جاتا ہے، اس

یہ ایک خط ایک صاحب کی طرف سے ہے جس میں اس امر کا تقاضا ہے کہ شمشاد نے جو غزل سارنگ کی دھن میں گائی تھی وہ ہمارے حلقہ احباب میں بہت پسند کی گئی۔ امید ہے کہ آپ بی صاحبہ کو ریڈیو کے پروگرام میں زیادہ سے زیادہ وقت دیں گے۔ ہم دلی رنج کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ لاہور ریڈیو کا یہ مائیہ ناز آرٹسٹ تھوڑے دن ہوئے قتل کیا گیا۔ مقدمہ عدالت میں چل رہا ہے اس لئے سخت افسوس ہے کہ ہم راقم کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں اس امر کی خوشی ہے کہ ہمارے انتخاب کی داد مل رہی ہے۔ اس لئے آپ کو یقین کرنا چاہئے کہ ہم چوٹی کے استادان فن کو پیش کرتے رہیں گے۔ لیجئے یہ دوسرا خط ایک اور صاحب کی طرف سے ہے فرماتے ہیں کہ یہ ریڈیو کیا بلا ہے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ کارخانہ کنجروں، ڈوموں، بھڑووں کے روزگار کے لئے کھول رکھا ہے۔ اس مکتوب کے راقم کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ریڈیو سننے والے صرف آپ کے مذاق کے آدمی واقع نہیں ہوئے۔ اور ہمیں ہر ایک مذاق کے موافق ہر شیئی نشر کرنی پڑتی ہے۔ یہاں سکھوں کے گیانی گرو گرنتھ کے شبد گاتے ہیں، پنڈت صاحبان ویدوں کے منتر پڑھتے ہیں اور شاستروں کا ارتھ کرتے ہیں۔ قاری صاحبان قرآن شریف کی سورتیں تلاوت کرتے ہیں۔"

طالب علم۔ "جناب، انھیں لکھ دیجئے کہ روزانہ پانچ وقت نماز بھی پڑھا دیا کریں ہم سب گھروں ہیں —"

ہیڈ ماسٹر۔ "سنو، سنو، شور نہ کرو۔"

ریڈیو۔ "راگ رنگ کے شوقین بہت ہیں۔"

طالب علم۔ "(ایک ساتھ) تعلیم۔ تعلیم —"

ہیڈ ماسٹر۔ "یہ کیا طوفان بے تمیزی ہے۔ چپکے رہو۔ لو اب دہلی کی نشریات سنو۔

ریڈیو۔ "گھرار۔ گھرر ر۔ یہ دہلی ہے۔ ہم دہلی کے آل انڈیا ریڈیو سٹیشن سے بول رہے ہیں۔ صبح کا پروگرام ختم ہو چکا۔ شام کا پروگرام حسب ذیل ہے۔

ہندوستانی میں خبریں۔ ایک مختصر ڈراما، جس کا نام ہے "لیل و نہار"۔ اس کے بعد مشاعرہ جس میں ہندوستان کے نامی شعرا حصہ لیں گے۔ اب ہم آپ کی خدمت میں آداب عرض کرتے ہیں۔

مدرسہ۔ ہال کمرہ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ریڈیو پر تقریر فرما رہے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر۔ " دہلی کا دلچسپ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ امر اچھی طرح آپ کے ذہن نشین

ہیڈ ماسٹر۔ "یہ تمام فائدے کم وبیش غرض مندوں کو حاصل ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ ان سے کسی کو فائدہ اور کسی کو نقصان بھی ہو، میرا مطلب ایسے فائدے سے ہے جو تمام عالم انسانی کا بلا لحاظ مذہب وملت وقومیت یکساں ہے"

طالب علم۔ "جناب، کیا ایسا فائدہ بھی ممکن ہے۔ ایسا عالمگیر فائدہ جس میں نقصان کا پہلو نہ ہو"

ہیڈ ماسٹر۔ "یہ قاعدہ کلیہ نہیں، کم از کم میرے خیال میں ایک فائدہ ضرور ہے، جو سراسر فائدہ، اس میں نقصان کی آمیزش نہیں ــــ "یہ علم" ہے"

طالب علم۔ "کیا علم جب عمل میں آئے تو نقصان کا موجب نہیں ہو سکتا"

ہیڈ ماسٹر۔ "علم بلا عمل بیفائدہ ہے، اس لئے علم کا فائدہ عمل ہی ہے۔ لیکن اس وقت ہم ہر ایک موضوع پر جو بجائے خود مستقل حیثیت رکھتا ہے مفصل بحث نہیں کر سکتے۔ آج ہماری تمام تر توجہ کا جاذب یہ ریڈیو ہے۔ یہ اشاعت تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ رائے کچھ میری ہی نہیں میسولینی بھی یہی ارشاد فرماتے ہیں جانتے ہو کہ میسولینی کون ہے؟"

طالب علم۔ "دیکھا تو نہیں نام سنا ہے۔ حبشہ کے لوگ اسے خوب جانتے ہیں"

ہیڈ ماسٹر۔ ریڈیو کی نسبت اس کی رائے ہے کہ تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے" (گھڑی دیکھکر) اب وقت ہو گیا ہے، لو سنو، ہم لاہور آل انڈیا ریڈیو سٹیشن سے شروع کرتے ہیں"

(گھرور۔ گھرار۔ گھرار" یہ لاہور ہے۔ آپ کی سمع نوازی کے لئے بی امراؤ جان موجود ہیں۔ آپ کو بھروین میں ایک ٹھمری سنائیں گے، جس کے بول ہیں،

رسیلی توری اکھیاں، جیا للچائے" ــــ طنبورہ اور طبلہ اور دیگر ساز موسیقی کے ٹھمری گائی جاتی ہے)

طالب علم۔ "جناب کیا اطالیہ میں بھی تعلیم کا یہی سلسلہ جاری ہے جو ہمارے ہاں بازاری رنڈیوں ــــ"

ہیڈ ماسٹر۔ "دل بہلانے کے لئے ریڈیو سٹیشن گانے بجانے کا ساز و سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ لوگ گھروں میں اپنا شوق پورا کر لیا کریں، موسیقی بھی ایک علم ہے۔"

طالب علم۔ "اور اس میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے"

ہیڈ ماسٹر۔ "اپنا اپنا مذاق ہے"

(گھرر ر۔ گھرار۔ اب ہم آپ کو ان بیشمار خطوطوں میں سے چند ایک کا خلاصہ سناتے ہیں جو اس ہفتہ کی ڈاک میں موصول ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی التماس کرتے ہیں کہ آپ بھی آگاہ ہے گا ہے ریڈیو کی نشریات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرماتے رہا کریں تاکہ ہمیں یہ معلوم کرنے کا موقع مل سکے کہ ہم کس حد تک اپنے اور آپکے مقصد میں کامیاب ہو رہے ہیں"

کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ کوئی شیئی نہ تو خالص اچھی اور نہ خالص بری ہے اس شیئی کا استعمال ہی اچھا اور بُرا ہے۔ ریڈیو بھی یہی کچھ ہے لیکن اچھی چیزوں کا انتخاب خود کارکنان ریڈیو کے مذاق پر منحصر ہے وہ اسے تعلیم کا بہترین نشر گاہ بھی بنا سکتے ہیں اور لوگوں کے اخلاق بھی بگاڑ سکتے ہیں۔

ایک طالبعلم۔ (دبی زبان سے) "اور گھر بیٹھے سب کچھ ہو سکتا ہے"

ریڈیو۔ "گھر ررارر۔ یہ دہلی ہے، مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ جناب تبسم صاحب جو کیمبرج یونیورسٹی کے سند یافتہ اور سٹیٹ کالج کے پرنسپل ہیں صدارت کو شرف وافتخار بخشیں گے، پہلے ان کی تمہیدی تقریر سنیں۔"

صدر۔ "زمانہ بدل رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عالم انسانی بدل رہا ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ چند سالوں کے بعد متقدمین اور متاخرین میں کیا کچھ نمایاں اختلاف واقع ہوگا۔ شاعری بھی بدل گئی، وہ ردیف اور قافیہ کی قید جس میں میر و مرزا اور آتش اور ناسخ غرض پہلے دور کے شاعروں کا کلام جکڑا ہوا ہے آج کی شاعری ان قیود سے آزاد ہو چکی ہے، میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ مغربی شاعری کا اثر ہے "بلینک ورس" یورپ کے شاعروں کی عام زبان ہے اور مرغوب اور محبوب ہے، لیکن ہمارے ہندوستانی شعرا نے کچھ ایک قدم اور آگے بڑھا کر عروض کی دوسری بندشوں سے بھی آزادی حاصل کرنے کی ٹھانی ہے۔ چنانچہ جناب دل صاحب جو حضرت جگر کے ہم درس ہیں ان بحروں پر کامل عبور حاصل کر چکے ہیں جو متقدمین کے کلام میں مشاہدہ ہوتے ہیں اور مغربی شاعری کا تتبع کرتے ہوئے اپنی نظم تین چار بحروں میں سنائیں گے اور جناب کامنہ اور ساغر کسی ایسے آئندہ دور کی خبر دے رہے ہیں۔ جب نظم و نثر میں کچھ زیادہ فرق نہ رہے گا۔ جناب اثر صاحب آپ کو ایک گیت سنائیں گے جو ہندی شاعری کو زندہ رکھنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ حضرت اختر پرانی وضع کے آدمی ہیں پرانی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ ان کی وضع کے بہت مناسب ہے وہ آزادی جو موجودہ شاعری نے حاصل کی ہے ان کے نصیب نہ ہوئی لیکن کچھ نہ کچھ اثر ان کے کلام میں عہد حاضرہ کا پایا جاتا ہے۔ جناب دل صاحب تشریف لائیں اور اپنی نظم سنائیں"

دل۔ "میری نظم کا عنوان ہے۔ 'نغمہ بہار' (نظم گا کر سناتے ہیں)

یہ موسم بہار ہے

نسیم صبح کی اٹکھیلیاں معصوم پتوں سے		دلاتی یاد ہیں پیری میں بچپن کی!
کہ مائیں گود میں لیکر ہیں کرتی پیار بچوں سے		فضا کے قطرہ ہائے آب منہ کلیوں کا دھوتے ہیں

یہ موسم بہار ہے

شب پر کیف سے انگڑائیاں لیتی ہے لیلیٰ شاخِ مجنوں سے　　نہیں بھولی ہیں پریاں میں مجھے باتیں لڑکپن کی

صبا لائی ہے بوئے گل چمن میں دشت ہاموں سے　　پریشاں جس طرح گیسو کسی مہوش کے ہوتے ہیں

یہ موسم بہار ہے

خندۂ گل ہا، قلقلِ مینا، نغمۂ بلبل، فرحت افزا، تابِ سنبل، زلف صوتا،

یہ موسم بہار ہے

صدر۔" جناب دل کا نغمہ بہار آپ نے سن لیا۔ اب جناب اثر "ساون کا جھولا" آپ کو اپنے مخصوص انداز میں سنائیں گے۔

اثر۔ (گا کر سناتے ہیں)

یہ برکھا رت ہے اور ٹھنڈی ہوائیں برستی آتی ہیں کالی گھٹائیں　　سکھی ری آؤ مل ملہار گائیں پیا آؤ تمہیں جھولا جھلائیں

چھپے ہیں بادلوں میں چاند تارے　　دکھاؤ اپنا مکھڑا آ کے پیارے

پپیہا کہتا ہے جمنا کنارے　　پیا آؤ تمہیں جھولا جھلائیں

چلے آتے ہیں بادل کالے کالے　　گھٹائیں گھاٹ کو گھیرے ہیں ڈالے

پیا پیارے پئیں ہم پریم پیالے　　منائیں منہ میں منگل مل کے گائیں

پیا آؤ تمہیں جھولا جھلائیں

صدر۔" سبحان اللہ، جناب اثر کے جھولے کی تاثیر محسوس ہو رہی ہے آپ سب صاحبان جھوم جھوم کر سن رہے تھے۔ اب حضرت اختر آپ کو "شانِ انسانیت" سے روشناس کرائیں گے۔ چونکہ پرانی وضع کے بزرگ ہیں اس لئے پرانی روش سے ہمارے نوجوان شعرا کی طرح کنارہ کش نہیں ہو سکتے۔ لیکن آپ کی نظم میں عہد حاضرہ کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔

اختر۔

یہ مضمون اگرچہ اشارات میں ہے　　مقدس کتابوں کی آیات میں ہے

بزرگانِ دیں کی روایات میں ہے　　جو مقبول ہو تو مناجات میں ہے

تصور تھا اک خاص فطرت کے دل میں　　مجسم وہ آ کر ہوا آب و گل میں

سمایا جہاں اس کی آنکھوں کے تل میں　　الٰہی یہ قدرت تیری ذات میں ہے

ہوا جلوہ افروز جب روح ہستی | فرشتوں نے آغاز کی بت پرستی
بلندی جھکی آکے تا حد پستی | شہادت یہ ارض و سموات میں ہے

ہوا رونما حسن فطرت کا جلوہ | کیا اس نے عریاں حقیقت کا جلوہ
ظہور اس کا گویا قیامت کا جلوہ | یہ انجیل میں اور تورات میں ہے

یہ آئینہ ہے حسن خلوت نشین کا | پتہ دیتا ہے لامکاں کے مکیں کا
مکان و زماں آسمان و زمین کا | یہ مذکور قرآنی آیات میں ہے

زمیں تخت اس کا فلک تاج اس کا | خدا کی خدائی سوا راج اس کا
سر عرش پر پائے معراج اس کا | قیام اس کا اعلیٰ مقامات میں ہے

کرشنا کی گیتا کی جادو بیانی | سریلی رسیلی وہ امرت کی بانی
سنی میں نے گوکل میں نٹے کی زبانی | کتھیا یہ محبت کی نغمات میں ہے

یہ شستہ زباں اور شیوا بیانی | یہ جان سخن اور روح معانی
یہ افکار عالی، قلم کی روانی | یہ خوبی تو اختر کی ہر بات میں ہے

ہیڈ ماسٹر۔ (ریڈیو کو بند کرتے ہوئے) عزیزو ۔ آج کا پروگرام ہم ختم کرتے ہیں میں ارباب ریڈیو کو لکھوں گا کہ نشریات میں نوجوانوں کے اخلاق کا خاص خیال رکھیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ گھروں میں مستورات بھی سنتی ہیں۔

رباعیات

موج حیدرآبادی

۱

مرگ و ہستی کا مدعا کیا ہے | دین و دنیا کا مقتضا کیا ہے
میں نے یہ آج تک نہیں سمجھا | بندے کیا چیز ہیں خدا کیا ہے

۲

رہبری ہے نہ رہنمائی ہے! | حسن مقصد پہ یاس چھائی ہے
تو ہی خود غور کرکے دیکھ کبھی | کتنی اندھی تیری خدائی ہے

"پچھتاوا"

جناب عبدالباری خاں صاحب سبحانی

(۱)

"شاہد تمہیں ہمیشہ خط کیوں لکھا کرتا ہے؟ تم اس کے ساتھ گھنٹوں سیر سپاٹے کرتی رہتی ہو اور بچوں کی خبر تک نہیں لیتی۔ تم نے شاید مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔ اور سمجھتی ہو کہ گیلی مٹی کے کھلونہ کی طرح توڑ پھوڑ کر اپنا مطلب نکالتی رہو گی"

عزیز کی یہ باتیں ایسی تھیں جن کا صفیہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ حیران تھی کہ آخر عزیز کو ہو کیا گیا ہے نہ پہلی سی چاہت تھی اور نہ میل ملاپ باقی تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اسی قسم کی اناپ شناپ باتیں شروع ہو جاتیں اور باہر جانے تک ان کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ صفیہ گھنٹوں سوچتی کہ آخر اس نے کونسا ایسا قصور کیا ہے جس کی سزا بھگت رہی ہے۔

شاہد کا آنا جانا اور اس کی خط و کتابت کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ اس کا کالج کا ساتھی تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ صفیہ پر جان دیتا تھا اور اب بھی اس کے اظہار خلوص و محبت میں کسی قسم کی کمی نہیں تھی۔ وہ اسے اسی طرح بے باکانہ طور پر چٹھیاں لکھا کرتا اور اسی پابندی کے ساتھ اب بھی آیا جایا کرتا۔ اس بات کا اندازہ تو خیر صفیہ ہی کو ہوگا یا پھر اس کے خدا کو کہ اُسے بھی شاہد سے کس قدر خلوص اور محبت تھی، لیکن بظاہر صفیہ کے طرز عمل میں کوئی فرق نہ تھا، اور وہ کسی طرح شاہد سے بے رخی اور لاپروائی کا اظہار کر بھی نہیں سکتی تھی اسلئے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ روشن خیال خاتون تھی، اور ساتھ ساتھ فیشن پرست بھی۔

عزیز بھی صفیہ سے کسی طرح کم فیشن پرست نہ تھا۔ وہ انگریزی ماحول اور انگریزی سوسائٹی کا دلدادہ تھا اور در اصل اس کے اسی رجحان نے صفیہ کو اس قدر ہمت بخشی تھی کہ وہ کھلم کھلا جدید طرز کے فیشنوں کو اپنی زندگی میں جگہ دے رہی تھی، اور سوسائٹی کی ہر نئی آرزو پر لبیک کہنا اپنا فرض جانتی تھی عزیز نے اپنے دوستوں سے صفیہ کا تعارف کرایا۔ بہت سارے کلبوں میں اس کی دل بہلائی کی خاطر نام درج کروایا اور صفیہ کے لئے ہر نئے ہوٹل کا کھاتا دار بننا پسند کیا۔ اس قدر گنجائش اور سہولت کے بعد اگر صفیہ کا جواب اس سلوک کے منافی ہوتا تو یقیناً دنیا صفیہ کی پیشانی پر "ایک صدی پیشتر کی بیوی" کا بورڈ لگا دیتی۔ صفیہ مطمئن تھی کہ اس نے وہ کیا جو ایک تعلیم یافتہ شوہر پرست بیوی کا فرض ہوتا ہے۔ لیکن عزیز کے خیالات کے اس انقلاب نے اُسے تو کھلا سا دیا، اور عزیز کا

موجودہ طرز عمل اس کے لئے سوہان روح بنا جا رہا تھا۔

اب عزیز کی زندگی کا دھارا اپنا رخ پھیر چکا تھا اور اس رخ پر بہہ رہا تھا جو صفیہ کی زندگی کے لئے مخالف ہوا ایسی چلا رہا تھا۔ عزیز اپنی زندگی میں تھکان محسوس کر رہا تھا اور اس طرز زندگی سے اکتا سا گیا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا اس نے بساط زندگی پر شروع ہی سے غلط مہرے چلے ہیں اور ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح بار بار جھنجھلا جاتا۔ پچھتاوے کا ناقابل برداشت بوجھ سمجھ نہ سکا اور چاہتا کہ پوری بساط کو تھس نہس کر دے لیکن وہ موجودہ سوسائٹی کا پیرو تھا اور فیشن کا بھوت اس پر پوری طرح سوار تھا۔ بھلا اس قید سے اس کی رہائی کس طرح ممکن تھی۔ وہ چوروں کی طرح نکل بھاگتا بھی تو کہاں جاتا جبکہ ہر طرف اسی سوسائٹی کا بھیڑ پڑ رہا ہے۔

اسی خوف سے عزیز میں اس قدر تو ہمت نہ تھی کہ وہ صفیہ سے صاف صاف کہدے کہ تم اپنا یہ بہروپ اتار پھینکو جب کہ خود اسی کی مرضی سے صفیہ نے اسے پہنا تھا اور نہ اپنی نام نہاد ہمسائی کے خوف سے وہ یہی کہہ سکتا تھا کہ تم سوسائٹی کو چھوڑ دو۔ غرض اسی پچھتاوے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صفیہ کی ہر بات عزیز کے نزدیک قابل اعتراض ہونے لگی، اور اس کا ہر فعل عزیز کو بُرا معلوم ہونے لگا۔ روز بروز تعلقات میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ اور تلخی پیدا ہوتی گئی۔

(۲)

صفیہ گو نئے رنگ میں رنگ چکی تھی، لیکن بڑی نبض شناس تھی۔ اس نے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ اب وہ اپنی زندگی کے دوراہے پر پہنچ چکی ہے۔ یا تو اسے فیشن پرست سوسائٹی کا ساتھ دینا ہوگا یا اس راہ سے کترا کر ایسا راستہ اختیار کرنا ہوگا جو اس کے شوہر کے مرضی کے مطابق ہو۔ لیکن وہ بھی اس سوال کے حل کرنے میں پیچ و تاب کھانے لگی کہ کس طرح وہ سوسائٹی سے منہ موڑ سکتی ہے؟ شوہر کے نام کا خیال اور اپنی پوزیشن کا پاس اسے بار بار ستاتا تھا۔ وہ سوچتی کہ آخر وہ کس طرح اپنے دوست و احباب سے کنارہ کش ہو سکتی ہے؟ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ گویا اسے ایک ناقابل تسخیر مہم سر کرنی ہے۔ اس کا نازک دماغ اکثر خیالات کے سمندر میں غوطہ کھانے لگتا کبھی موجوں کی تاب نہ لا کر دست و پا ڈھیلے کر دیتا اور کبھی ان ہی موجوں کے بہاؤ کے خلاف ہاتھ پیر مارنے لگتا۔

ظاہر ہے صفیہ عورت تھی اور ایک متحرک نفس کی مالک۔ بس اسی ایک چیز نے اس کے لئے بحث و تکرار کی گنجائش کم چھوڑی تھی۔ اس نے معقول دلائل اور مدلل بحثوں سے عزیز کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ عزیز پہلے ہی سے بازی کھو چکا ہے۔ عزیز کے ہارے ہوئے دماغ میں اس قدر طاقت کہاں تھی کہ وہ مسلسل ہارتا جاتا۔ نتیجہ برعکس ہوا۔ صفیہ نے جس دوا کو تریاق سمجھ کر پلایا تھا وہ عزیز کے

زہر ثابت ہوئی۔ اس کی ضد نے اب جنون کی صورت اختیار کرلی۔

صفیہ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور وہ سوچنے لگی کہ کاش وہ پہلے ہی اپنی راہ کا صحیح انتخاب کرلیتی آئندہ کے لئے اس نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ وہ قدم قدم پر عزیز ہی کی مرضی کے مطابق عمل پیرا ہوگی۔ اور صحیح معنوں میں اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ کلب کی حاضری کو بالائے طاق رکھا۔ باہر کی آمدورفت میں ایک لخت کمی کردی جلسوں اور سوسائٹی کی دوسری مصروفیتوں میں شرکت سے صاف انکار کردیا کرتی اور دوست واحباب سے حتی الامکان دور رہنے کی کوشش کرتی۔ حتیٰ کہ شاہد جیسے عزیز دوست کو بھی اس سے نہ ملنے کی شکایت رہنے لگی غرضکہ اس نے چند ہی دنوں میں بہت ساری چہ میگوئیوں اور اعتراضات کا مرکز اپنے آپ کو بنالیا۔ لیکن صفیہ کے اس طرز عمل نے بظاہر عزیز پر اچھا اثر کیا، اور اس کے جنون میں کمی ہونے لگی۔ مگر انھیں دنوں ایک واقعہ نے عزیز کے جنون کو دوبالا کردیا اور صفیہ کی ساری محنت نقش برآب ہوکر رہ گئی۔

(۳)

ایک دن جب کہ عزیز دفتر جاچکا تھا، صفیہ بچوں کی صفائی میں مصروف تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ملازم نے ایک چٹھی شاہد کی اسے لاکر دی۔ شاہد نے لکھا تھا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ براہ کرم فوراً ہی آؤ۔ اس میں شک نہیں کہ صفیہ عزیز کی بیوی تھی لیکن شاہد اس کا پرانا ساتھی تھا۔ گو شاہد سے اسے محبت نہ سہی ہمدردی ضرور تھی۔ وہ بے چین ہوگئی۔ ارادہ کیا کہ چلی جائے۔ لیکن پھر عزیز کا خیال اس کے لئے سدّ راہ بن گیا۔ وہ مجبور تھی۔ اس نے لکھ بھیجا کہ وہ معافی کی خواستگار ہے۔ چونکہ سواری موجود نہیں ہے اسلئے نہیں آسکتی۔ صفیہ لکھ تو رہی تھی لیکن اس کا دل رو رہا تھا کچھ ہی دیر بعد صفیہ اور بھی شش و پنج میں پڑ گئی جب اس نے دیکھا کہ شاہد کی موٹر اسے لینے کو آئی ہے۔ اس نے چلا کر ملازم سے کہا "موٹر واپس کردو اور کہدو کہ شام میں آنے کی کوشش کروں گی" ——— اتنا کہہ کر وہ ضبط نہ کرسکی اور اس کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے قطرے ڈبڈبا آئے۔

اتفاق سے اُس دن عزیز کو پہلے ہی فرصت مل گئی اور وہ گھر لوٹ گیا۔ جوں ہی عزیز کی موٹر پھاٹک میں داخل ہوئی اس نے دیکھا کہ شاہد کی موٹر واپس جارہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اُس کے جنون میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوگیا۔

صفیہ نے عزیز کو بہتیرا سمجھایا، شاہد کی چٹھی بتائی، قسمیں کھائیں۔ لیکن عزیز نے ایک نہ سُنی۔ اس نے صفیہ پر کھلم کھلا اتہام لگادیا کہ وہ اسے بیوقوف بنارہی ہے۔ یہ تمام ترکیبیں محض خوش کرنے کے لئے اور دھوکے میں رکھنے کیلئے

کی گئی ہیں۔

اب دن بدن عزیز کی بدگمانیوں میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اور اب صفیہ کے پاس بھی کوئی ایسا ہتھیار باقی نہ رہا تھا جس سے عزیز کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا۔ صفیہ مجبور تھی اور اپنی تقدیر پر شاکر!

عزیز کا چڑچڑا پن بڑھتا ہی گیا۔ ایک دن اُس نے صفیہ کو صاف صاف سُنا دیا کہ اسے اب صفیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ وہ اب جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اور اب وہ بھی آزاد ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ صفیہ کو تو اب بھی عزیز کی ضرورت تھی۔ ہندوستانی عورت کی زندگی تو اس کے شوہر ہی سے سرسبز ہے۔ وہ اسی کی پوجا کو اپنا دھرم سمجھتی ہے۔ گو صفیہ کی لغزش بھی اُسی تہذیب نو اور فیشن کی اندھا دھند پیروی کا نتیجہ تھی جس کا پیرو خود عزیز بھی تھا۔ مگر فرق یہ تھا کہ صفیہ عورت تھی، اس لئے اسے ہی جھکنا پڑا، اور اب وہ عزیز کے حکم اور اسی کی مرضی پر چلنے ہی کو اپنی دنیا جانتی تھی۔ لیکن عزیز کو یہ کس طرح سمجھا سکتی تھی۔ یہ اس کی طاقت سے باہر ہو چکا تھا۔ اور وہ اس کیلئے مجبور تھی۔

(۴)

صفیہ نے سینہ پر پتھر رکھ کر ایک دن یہ بھی سُن لیا کہ عزیز دوسرے بیاہ کی تیاری میں مصروف ہے۔ نہیں معلوم کس جذبہ کے تحت اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بھی عزیز کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ تمام نوکر چاکر حیرت زدہ تھے کہ صفیہ کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ خود عزیز نے بھی دیکھا۔ لیکن اس نے یا تو بے خیالی برتی یا کچھ سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ شادی کے دن تک صفیہ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح سارے انتظامات نہایت تن دہی سے کرتی رہی۔

عزیز کی شادی چند ہزار مہر پر ایک جگہ قرار پائی تھی اور نکاح کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ شادی کے روز عزیز کی بارات گھر سے نکلی۔ صفیہ نے حسرت بھری نظروں سے عزیز کو دیکھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھیں ساون بھادون برسانے لگیں۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ آخر کرتی کیا۔ چپ ہو رہی۔ بچوں کو کپڑے پہنائے اور ایک چٹھی اس مضمون کی عزیز کے نام لکھی:۔

"میں نے اپنا آخری فرض بھی بحسن وخوبی انجام دیدیا ہے اور اس لئے میرا قلب مطمئن ہے اس کا افسوس ضرور ہے کہ آپ کی بدگمانی کو دُور نہ کر سکی۔ اب چند گھنٹوں کے بعد اس گھر کی مالکہ شاید کوئی اور ہو۔ اس لئے آئندہ یہاں میرا قیام نہ میرے لئے ممکن ہے اور نہ آپ ہی کیلئے خوشی کا باعث۔ اسی بناء پر باقی زندگی کسی گوشۂ تنہائی میں گذار دینا چاہتی ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے اس نئے دَور کو بخیر وخوبی انجام کو پہنچائے۔ خدا حافظ۔" "صفیہ"

چٹھی لکھ کر اس نے میز پر رکھ دی اور بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی آئی۔ صفیہ کے والدین، عزیز و اقارب اور سہیلیوں نے اسے بہت سمجھایا۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں نے زندگی کے نشیب و فراز پر لمبی لمبی تقریریں کیں۔ لیکن نہیں معلوم صفیہ کس جذبہ کے تحت اپنی حالت پر اس قدر مطمئن تھی کہ وہ ایک کی بھی نہ سنتی تھی۔

(۵)

عزیز کی بارات بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ دولہن کے گھر پہنچ تو گئی لیکن نکاح کے وقت دولہن والوں نے مہر کے ذکر کے ساتھ چند اور شرطیں باندھ دیں جن کا پہلے سے عزیز کو علم نہ تھا۔ عزیز بوکھلا سا گیا۔ اس نے دولہن والوں سے دریافت کیا کہ بغیر اس کی مرضی و منشا کے انھیں کیا حق تھا کہ ایسی ناقابل شرطیں لگا دیں۔ دولہن کے عزیزوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جناب! ہمیں بھی یہ کب قبول ہے کہ اپنی لڑکی کو آپ جیسے بد معاملہ انسان کے پلے باندھ دیں۔ آج تک آپ نے ہمیں اس چیز سے ناواقف ہی رکھا کہ آپ شادی شدہ ہیں اور ماشاء اللہ سے دو بچوں کے باپ بھی ہیں۔" عزیز غصہ سے تمتما اٹھا۔ اس نے کہا "میرے ذاتی معاملات سے آپ کو کیا کام ہے۔ مجھے یہ شرطیں کسی طرح منظور نہیں تھیں۔" دولہن کے عزیزوں نے جواب دیا "جناب! اگر ہم یہ شرطیں نکال دیں تو ہمیں یہ کیسے یقین ہو کہ ہماری لڑکی آپ کے پاس خوش رہے گی یا چند دنوں بعد اس بیچاری کا بھی وہی حشر ہوگا جو آپ کی پہلی بیوی صاحبہ کا ہوا ہے۔" غصہ سے عزیز کا سر چکرانے لگا اور وہ اسی حالت میں بڑبڑاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچ کر عزیز نے دیکھا کہ ہر طرف ویرانگی مسلط ہے اور صفیہ موجود نہیں ہے۔ یکایک عزیز کا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ندامت اور شرمندگی کے تاریک غار میں گھرا جا رہا ہے، گھر کا چپہ چپہ اسے لعنت کر رہا ہے اور ہر طرف سے اس کے کان "بدگمانی" کی صدا سن رہے ہیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کی نظریں صفیہ کی چٹھی پر پڑی۔ اس نے جلدی سے چٹھی اٹھالی اور پڑھنا شروع کیا۔

عزیز نے جب خط ختم کیا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں کا سیلاب بہا رہی تھیں۔ عزیز کے دل و دماغ پر ندامت اور پچھتاوے کا اس قدر بار تھا کہ اس نے ساری رات جاگتے ہی کاٹ دی۔

(۶)

دوسرے ہی روز صبح میں عزیز نے ملازمین کو حکم دیا کہ مکان کو نئے سرے سے آراستہ کر دیں۔ اس نے اپنی موٹر نئے اور خوش رنگ پھولوں سے سجوائی اور خود کپڑے پہن کر جا بیٹھا۔

عزیز کی موٹر جب صفیہ کے میکے پہنچی تو لوگوں کو دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ عزیز موٹر سے اترا اور دیوانہ وار صفیہ کو تلاش کرنے لگا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ صفیہ ابھی ابھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے اور شاید دیر سے لوٹے تو وہ مایوس ہو گیا اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچ کر عزیز کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے صفیہ کو سہیلیوں کے جھرمٹ میں دولھن بنا دیکھا۔ عزیز کی آنکھوں میں شرمندگی اور ندامت کے آنسو جھلک رہے تھے اور صفیہ کی آنکھیں خوشی اور انبساط کے آنسوؤں سے لبریز تھیں، اور وہ فاتحانہ انداز میں سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔

اب عزیز کی زندگی مذہبی رنگ اختیار کر چکی ہے اور اس کا ہر پہلو مشرقی تہذیب کا صحیح مرقع نظر آتا ہے۔

قند ظرافت

جناب سید عبد القادر صاحب رضوی وکیل مرحوم

بی۔ اے بنا دیا مجھے ایم۔ اے کیا مجھے
کالج کی التفات نے کیا کیا کیا مجھے

کیا خاک اب جوارش سنفرا کا کام دے
پیٹنٹ کوئی چاہئے غم کی دوا مجھے

روزے نماز کی تو پرانی ہے ہسٹری
واعظ شراب خانے کے قصے سنا مجھے

سیزن بدل گیا ہے زمانہ کا ان دنوں
مشکل ہے اس کی آب و ہوا موافق ہوا مجھے

کہتا ہوں جی ہی جی میں ظلم ان کے دیکھ کر
ایسا تماشا پھر نہ دکھائے خدا مجھے

یہ انفلوئنس کا ہے اثر مانتا ہوں میں
جو پست تھا بلند نظر آ گیا مجھے

تعلیم کا طریق بھی نو نو گراف ہے
جو میں نے کہہ دیا وہی اس نے کہا مجھے

اب زندگی سے اپنی ہی بائیکاٹ کیجئے
فرقت میں اور کچھ تو نہیں سوجھتا مجھے

قاصد کا لو حریف بنا ٹیلیفون بھی
بے واسطہ جو کہنا تھا اوس نے کہا مجھے

تقدیر کا تو نام ہی اب نام رہ گیا
ڈپلومیسی نے کر ہی دیا کیا سے کیا مجھے

دھوکا ہوا ہے اس کو تو سن ہیٹ و کیل
دربان اون کا یوں نہ کبھی روکتا مجھے

جناب مرزا رفیق بیگ صاحب

عینک کے لفظ سے غالباً ناظرین کو یہ دھوکا ہوتا ہوگا کہ یہ کسی عینک فروش یا ماہر امراض چشم کا اشتہار ہوگا۔ اور شاید اکثروں نے تو اس عنوان کو دیکھکر اس مضمون کو پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی ہوگی۔ مگر مجھے واقعی ایسے حسن ظن رکھنے والوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ بھی اس کو پڑھ لیتے تو ممکن تھا کہ ان کو اپنی عینک اور غلاف کر لینے کی ضرورت ہوتی۔

قبل اس کے کہ ہم اصل مضمون کی طرف رجوع کریں۔ ہم یہ کہدینا بلکہ اعلان کردینا چاہتے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم نے آپ بیتی لکھی ہے۔ خدا کے لئے کوئی صاحب اس کو اپنے سے متعلق نہ فرمالیں۔ اور ہم بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہر عینک والا اپنے گریبان میں منھ ڈالے۔ اسلئے کہ یہ اون سے بالکل متعلق نہیں ہے۔

ہم نے لفظ عینک کیوں اور کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس کی جب تک پوری طرح تشریح نہ کی جائے آپ کی یا کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بات یہ ہے کہ جب ہم عمر کے ایسے حصہ میں پہنچے۔ جہاں پہنچ کر انسان اپنے پہلے کے کرتوتوں۔ افعالوں وغیرہ پر کبھی کبھی بھولے سے نظر ڈال لیتا ہے تو ہم کو معلوم ہوا کہ اس میں بہت سی ایسی باتیں اور واقعات بھی جو ہم کو بغیر عینک کے نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ جب عینک آئی تو یہ سب چیزیں دکھائی دینے لگیں۔

عام طور پر مسلمان بچوں کی شادیاں بائیس سے تیس سال کی عمر تک ہوا کرتی ہیں۔ اسی طرح ہماری شادی بھی ستائیس سال کی عمر میں ہوئی۔ بچپنا تو چھوڑ دیجئے کہ وہ ایسی لاؤبالی عمر ہوتی ہے کہ اوس میں کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ خود کیا ہیں۔ کون ہیں۔ اور دنیا کیا چیز ہے۔ البتہ لڑکے کی اٹھارہ سال کی عمر ضرور ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ خاصی سمجھ رکھتا ہے۔ میٹرک پاس یا فیل ہوکر اتنا ضرور سمجھنے لگتا ہے کہ ہم دنیا میں ہیں۔ میٹرک کو پہلے انٹرنس یعنی دروازہ اسی لئے کہا جاتا تھا کہ وہ سمجھداری کی دنیا میں جانے کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ شادی کے جبکہ زندگی میں بلکہ ایسی زندگی جو دن رات کی زندگی میں شریک ہونے والی آتی ہے۔ اوس وقت ہر بن بیاہا لڑکا اپنے کو اپنے ہی رشتہ داروں میں پاتا ہے۔ یعنی ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ خالہ۔ پھوپی۔ نانا۔ دادا وغیرہ وغیرہ جتنے بھی رشتہ دار ہوتے ہیں وہ سب واقعی رشتہ دار اوس کے اپنے ہوتے ہیں۔ مگر نہ معلوم ایسی کونسی اور کیا خاص وجہ ہوتی ہے کہ شادی کے بعد یہ تمام رشتہ دار کچھ غیر غیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور فوراً ہی اپنی گھر والی کے باپ۔ ماں۔

بھائی۔ بہن۔ بالکل اپنے ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن معلوم ہوتے ہیں۔ اور جیسے جیسے شادی کے بعد زمانہ گذرتا جاتا ہے
ویسے ویسے اپنے خاص رشتہ دار بہت دور فاصلہ پر دکھائی دیتے ہیں اور گھر والی کے تمام رشتہ دار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
وہ اور ہم بالکل ایک خون ایک جان ہیں۔ اون کی محبت۔ اون کی شفقت۔ اون کی مہمان نوازی۔ اون کی ہمدردی۔
اون کا ہر برتاؤ۔ حتی کہ اون کا تمدن۔ اون کی معاشرت۔ اون کی نشست و برخواست۔ اون کی میٹھی میٹھی گفتگو۔
بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درصل ہم بالکل اندھیرے اور کسی بہت ہی غیر متمدن لوگوں میں تھے۔ اور آج ہم کو خدا نے
اچھے لوگوں میں پہنچایا ہے۔ خدانخواستہ اگر ہم اسی طرح اوس ماحول میں کچھ روز اور رہتے تو یقیناً ہم جیسے تعلیم یافتہ
اور عقلمند نوجوان ضرور پاگل ہوجاتے۔ اور ہماری ساری عمر انہی جاہل لوگوں کی نذر ہوجاتی۔

یہ باتیں یہیں ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ ہم کو اس کا بھی تجربہ ہوا ہے کہ ہمارے ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن وغیرہ
میں بہت سی برائیاں بھی تھیں۔ جو ہم کو پہلے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اب نہ معلوم کیوں ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ
ہماری ماں بہت ہی بدمزاج۔ چڑچڑی۔ ہمارے باپ نہایت گم سُم۔ کمزور طبیعت اور انسان کو جانور سمجھنے والے ہیں۔
رہا بھائی اور بہن۔ تو اون کو چھوڑو۔ وہ تو بیچارے جیسے گندے پانی میں پلے ہیں۔ ایسی ہی اون کی عادتیں
بھی ہیں۔ اون کا شمار تو کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر ایک ایک دو دو واقعات ہم اپنے درج کرتے ہیں جس سے
ہمارے والدین کے غیر متمدن اور بدسلیقہ ہونے کی کافی شہادت مل سکتی ہے۔

ہم کو بچپنے سے عادت ڈالی گئی تھی کہ والد صاحب صبح کو نماز کے وقت اٹھاتے تھے۔ زبردستی نماز پڑھواتے تھے۔
اور سورج نکلتے نکلتے ہم ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر اپنے کاموں میں مشغول ہونے کیلئے بالکل تیار ہوجاتے تھے۔ یہ عادت
چونکہ بچپنے سے ڈالی گئی تھی اس لئے ہماری فطرت ثانیہ ہوگئی تھی۔ مگر ہر قاعدہ میں مستثنیات بھی ہوا کرتے ہیں۔
جب ہماری شادی ہوئی اور ہم اپنی شریک زندگی کو خوشی خوشی بیاہ کر گھر لائے تو نہ معلوم کیوں ہم غیر معمولی طور پر
دیر تک صبح کو سوتے رہے۔ اور اوس وقت بڑبڑا کر اوٹھے جب کہ سورج خاصہ اوپر ہوچکا تھا۔ دل میں کچھ شرمندگی
محسوس کرتے ہوئے چپکے سے کمرے سے نکل کر باہر چلے گئے۔ مگر ہم نے یہ سوچ لیا کہ یہ بہت بُری بات ہے کل سے اپنی
عادت کے مطابق بہت سویرے ہی اٹھا کریں گے مگر دوسرے اور تیسرے دن بھی ہم بغیر امداد کے اوسی طرح دیر سے
برآمد ہوئے۔ ہماری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ خلاف معمول والد صاحب بھی کچھ نہ بولے۔ ہم نے خیال کیا کہ ہم اب شاید
بڑے آدمی ہوگئے ہیں۔ اس لئے والد صاحب نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ اب ہماری مرضی پر چھوڑ دیا جائے لیکن
ہمارا یہ خیال چار روز کے بعد بالکل غلط نکلا۔ یعنی چار روز کے بعد جب کہ ہم نہایت اطمینان سے ۹ بجے ناشتہ تناول

فرمارہے تھے تو والد صاحب باہر سے کسی کام کو اندر آئے اور نہایت نرم لہجہ میں فرمایا کہ تم بہت دیر سے اوٹھ رہے ہو۔
یہ بہت بُری بات ہے۔ صبح ہی اٹھا کرو۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ ہم مارے شرم کے پانی پانی ہو گئے۔ مگر معلوم نہیں کہ
کیا ہوتا تھا کہ باوجودیکہ کوشش کرتے تھے۔ مگر صبح کو دیر سے اوٹھتے تھے والد صاحب نے دو تین دن کا وقفہ دے کر اس مرتبہ
ذرا سختی سے جتایا کہ اب ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ اب کی مرتبہ ہم کو بھی ذرا دل میں تھوڑی سی تکلیف محسوس ہوئی کہ
بڑے میاں کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری بیگم صاحبہ بھی ہمارے ساتھ ناشتہ میں شریک رہا کرتی
تھیں۔ اونھوں نے بھی دونوں مرتبہ اس تنبیہ کو سنا تھا۔ اکیلے میں ہم سے کہا کہ اب ناشتہ باہر نہ کیا کرو۔ بلکہ کمرہ میں
منگا لیا کرو۔ بڑے میاں نہ ہم کو دیر سے ناشتہ کرتے دیکھیں گے اور نہ ایسا کہیں گے۔ ہم نے بھی سوچا کہ چلو ترکیب اچھی
ہے۔ دو ایک روز اسی طرح الگ ناشتہ کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں سسرال سے بلاوا آیا۔ اور ہم دونوں وہاں چلے گئے
وہاں بھی ہم جب صبح کو دیر سے بیدار ہوئے تو ابھی ہم کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ ہمارے کان میں ہماری خوشدامن
صاحبہ کی آواز آئی جو بچوں پر خفا ہو رہی تھیں کہ "غل نہ مچاؤ۔ دولہا بھائی کی آنکھ نہ کھلجائے۔ رات کو دیر تک ہم
لوگوں سے باتیں کرتے رہ کر سوئے ہیں۔ ابھی آنکھ کھل گئی تو دوپہر کہیں سارا دن سر میں درد نہ ہو جائے"
ہم اوٹھ بیٹھے۔ فوراً ایک ماما منھ دھونے کا سامان لے کر حاضر ہوئی۔ وہ پانی ڈالتی جاتی تھی اور ہم منھ دھوتے
جاتے تھے۔ ہم کو بڑا اچھا معلوم ہوا۔ منھ بھی خوب صاف دُھلا۔ اسلئے کہ ابتک عمر بھر میں کسی نے اس طرح ہمارے ہاتھ
پر پانی نہیں ڈالا تھا۔ ورنہ ہم تو ایک ہاتھ سے لوٹا سنبھالتے تھے اور ایک ہی ہاتھ سے منھ دُھلا کرتا تھا۔ آج ہم کو
معلوم ہوا کہ منھ اوس وقت تک اچھا نہیں دھل سکتا جب تک کہ دوسرا آدمی پانی نہ ڈالے۔ ہمارے منھ دھونے کی دیر
تھی کہ دسترخوان اور ناشتہ کا سامان ہمارے کمرہ میں بغیر ہمارے کہے چلا آرہا ہے۔ ابھی دسترخوان پر پوری طرح
سامان بھی رکھا نہ گیا تھا کہ خوشدامن صاحبہ خود ہی کمرے میں تشریف لے آئیں تاکہ ناشتہ ہم کو کرائیں۔ ہم نے
اوٹھ کر نہایت ادب سے سلام کیا۔ اونھوں نے ہماری بلائیں لیں۔ سینکڑوں دعائیں دیں۔ مزاج پوچھا۔ اور
ساتھ ہی معذرت بھی کی کہ بچوں سے ناک میں دم آگیا۔ منع کرتے کرتے تھک گئی۔ مگر بچے نہ ماننا تھا نہ مانے اور
اتنا غل مچایا کہ بیٹا تمھاری آنکھ کھل گئی۔ خیر کل سے دیکھو میں ان کا ایسا بندوبست کروں گی کہ تم کو تکلیف نہ
ہوگی۔ خیر ہم بیٹھے تو اوسی وقت اونھوں نے ایک ماما پر خفا ہونا شروع کیا کہ اے ہے، تونے کوئی قالین وغیرہ
بھی یہاں نہیں بچھایا۔ میاں ٹھنڈی زمین پر کیسے بیٹھیں گے۔ چل جلدی وہ میرا گبھا اٹھا لا اور یہاں بچھادے
بہرحال تفصیل لکھی جائے تو مضمون بہت ہو جاتا ہے۔ میں اپنے اصل موضوع سے دور ہٹتا جاتا ہوں۔ مقصد یہ

جناب جب تک ہم سسرال میں رہتے اپنی نیند سوتے اور اپنی نیند اوٹھتے - عمر بھر کبھی کسی نے اس طرح منھ نہیں دھلایا تھا - بڑے ٹھاٹھ سے منھ دھوتے - سب سے بڑھکر بیت الخلا کا جب ارادہ کرتے تو فوراً ایک ماما ڈور کر لوٹا بیت الخلا میں رکھ آتی - بھلا یہ چیزیں ہم نے پہلے کب دیکھی تھیں - بڑی طبیعت خوش ہوئی اور ہم کو ایسا معلوم ہوا کہ واقعی گھر یہ ہے - جہاں ہر ایک شخص کی اوس کے رتبہ کے لحاظ سے وقعت کیجاتی ہے - ہمارے اپنے اوس گھر میں ہم کو کبھی کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا - ہم کو اب سسرال میں آرام اور اپنے گھر میں ذرا تکلیف معلوم ہونے لگی - اپنے گھر کہا جب ہم گئے تو صبح سویرے ہی ہماری بیگم صاحبہ ہم کو جھنجھوڑ کر اٹھاتی کہ جلدی اٹھو، نہیں تو ابا جان پھر خفا ہوں گے - کبھی کبھی کہتیں کہ میں نے تم سے ابتک ذکر نہیں کیا کہ تمہارے دیر سے اوٹھنے پر اماں جان صاحبہ کہتی تھیں کہ لڑکا تو ہمیشہ سویرے اٹھا کرتا تھا جب سے تم آئی ہو یہ دیر تک سویا کرتے ہیں - بھلا تم ہی بتاؤ کہ کیا میں تم کو زیادہ دیر تک سونے کے لئے کہتی ہوں - تم جلدی اٹھا کرو - مجھ سے یہ طعنے نہیں سُنے جاتے - غلطی تو تم کرو اور طعنے میں اٹھاؤں - میں نے بھی سوچا کہ واقعی اس بیچاری کا کیا قصور ہے جو اماں جان ان کو ایسے الفاظ کہتی ہیں - بہر کیف اسی طرح ایک جگہ یہ لاپرواہی - اور دوسری جگہ یہ خاطریں اور مُدارات ہوتے رہے - دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گذرنے لگے - اب ہم کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہمارے والدین خواہ مخواہ ہر چیز میں ہم کو روکتے ہیں اور بلاوجہ خفا ہوتے ہیں - ہماری بیگم صاحبہ ہم کو بتاتی رہتی تھیں کہ آج فلاں نے یہ کہا - اور فلاں نے یہ کہا - تم کو یہ کہا مجھ کو یہ کہا - اور یہ بھی ہم پر احسان جتاتی تھیں کہ میں کسی بات کا جواب نہیں دیتی ہوں کہ تمہاری ماں ہیں تمہارے باپ ہیں - ایسا نہ ہو کہ تم کو بُرا معلوم ہو -

ہمارا دفتر ہمارے گھر سے تقریباً دو میل تھا - اور سسرال سے ۲½ میل تھا - مگر اول اول ہماری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب سے ہماری شادی ہوئی تھی - جب ہم اپنے گھر میں ہوتے تھے تو ہمیشہ پندرہ بیس منٹ دیر سے پہنچتے تھے - اور جب سسرال میں ہوتے تھے تو ہمیشہ وقت سے ۲ منٹ پہلے ہی پہنچ جاتے تھے - حالانکہ ہمارا گھر بہ نسبت سسرال کے قریب تھا - ہم نے بارہا رات کو سوچا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے ؟ آخر سوچتے سوچتے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے گھر میں انتظام بہت خراب ہے نہ تو منھ دھونے کا سامان اور پانی ہم کو جلدی ملتا ہے اور نہ ناشتہ وقت پر ملتا ہے - خود ہی جب تک دوڑ دھوپ نہ کرو - کوئی ناشتہ جلدی نہیں لاکر دیتا ہے - سسرال میں گو ہم دیر تک سوتے رہے - مگر جس وقت بھی بیدار ہوتے ہیں - ہر چیز ہم کو اس طرح تیار ملتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اس کا حکم دے چکے تھے اور ہم بھی جلدی جلدی سب کاموں سے فارغ ہو کر وقت پر دفتر جا پہنچتے ہیں -

ان چیزوں نے رفتہ رفتہ ہماری طبیعت پر اثر کرنا شروع کیا۔ اب جب ہم اپنے گھر میں ہوتے تو ہم کو ذرا تکلیف اور تکلف محسوس ہوتا۔ والد صاحب کی خفگی اور والدہ صاحبہ کی باتیں اب ہم کو ذرا بری معلوم ہونے لگیں، اور دل ہی دل میں خیال کرتے کہ سسرال سے بہت دن سے بلاوا نہیں آیا۔ پہلے تو بیگم صاحبہ سے کہتے ہوئے جھجکتے کہ ایسی بات نہ کہنا چاہیئے مگر آخر جب کسی طرح وہاں سے کوئی نہیں بلاتا تو خود ہی باتوں باتوں میں بیگم سے کہتے کہ تم بہت دن سے اپنے میکے نہیں گئیں۔ وہ فرمائیں کہ ابھی آئے ہوئے دس روز ہی تو ہوئے اگر ابھی سے وہاں بلالیں گی تو تمھارے والدین خفا ہوں گے۔ گذشتہ مرتبہ ہی آپ کی اماں جان صاحبہ فرما رہی تھیں کہ جب دیکھو۔ ڈولی کھڑی ہے کہ بلا رہی ہیں۔ دولہا میاں کو بھی بلایا ہے۔ ایک تو تم کو بلایا جائے اوپر سے باتیں بھی سنی جائیں اور تم کو یاد نہیں اوس روز تمھاری والدہ صاحبہ نے کیا کہا تھا کہ بہن کے گھر بھائی کتا۔ اور ساس کے گھر داماد کتا۔ ہم نے کہا یہ سب باتیں پرانے زمانہ کی ہیں۔ ان لوگوں کو تو سوائے ایسی باتوں کے آتا ہی کیا ہے۔ یہ کہکر ہم بھی دو ایک روز خاموش رہے اور پھر بیگم سے کہا کہ اب تو بہت دن ہو گئے۔ آخر ہماری بیگم خود ہی اپنی والدہ کو کہلا بھیجتیں کہ بلالو۔ ہم کو نہ تو وہاں کوئی خفا ہوتا اور نہ کسی قسم کی تکلیف ہوتی۔ وہاں ایک قسم کا آرام اور لطف آنے لگا۔

چونکہ ہم زیادہ تر سسرال میں رہنے لگے تھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ ہماری ضروریات کا سامان بھی یہاں سے وہاں بغیر کسی خاص ارادہ کے منتقل ہوتا رہا۔ اور اب ایسی نوبت پہنچ گئی کہ ہم اپنے والدین کے گھر جب آتے تو ہم کو بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ ہم بطور مہمان یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان کو جہاں زیادہ آرام ملتا ہے اوسی کو اپنا گھر اور ٹھکانا سمجھنے لگتا ہے۔ ہم جب والدین کے گھر میں ہوتے تو ہم کو اب وہاں کی ہر چیز سے غیریت معلوم ہونے لگی۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ ہمارے اس طریقہ عمل پر اکثر کہا کرتے۔ مگر ہم یہ سوچ کر کہ بڈھوں کو باتیں کرنے کی زیادہ عادت ہوا کرتی ہے اور موجودہ تمدن اور معاشرت سے بھی یہ لوگ چونکہ ناواقف ہیں۔ اسلئے اون کی باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ہم خاموش ہو جایا کرتے مگر دل میں اون کی یہ باتیں کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی تھیں اور اس کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے سامنے جانا ہی نہ چاہیئے۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اس لئے ہم مہینہ میں ۲۵ دن سسرال رہتے اور پانچ چھ روز کیلئے اپنی طبیعت پر جبر کر کے والدین کے ہاں چلے جاتے۔

ہم اکثر بیگم کو لے کر سینما جایا کرتے تھے۔ مگر جب کبھی گئے اتفاق سے ایسے دنوں میں گئے تھے کہ ہم سسرال

ہی تھے۔ ایک مرتبہ ایسے دن جانے کا ارادہ کیا جب ہم اپنے والدین کے گھر میں تھے۔ جاتے وقت تو والدہ صاحبہ نے کچھ نہ کہا مگر دوسرے روز جب ہم دفتر گئے ہوئے تھے تو نہ معلوم والدہ صاحبہ نے بیگم سے کہا کہ اب جو ہم دفتر سے آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم اٹواٹی کھٹواٹی لئے پڑی ہیں۔ یعنی ایک پلنگ پر بیگم پڑی ہوئی ہیں اور رو رہی ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ رونے کا یہ سلسلہ کب سے جاری تھا یعنی دوپہر سے یا ابھی تھوڑی دیر پہلے سے۔ بھلا ہم آج کل کے بہادر مرد ہو کر عورت کی آنکھ میں آنسو دیکھ سکتے تھے۔ دل بےچین ہی تو ہو گیا۔ اول اول تو بہت خوشامد کی کہ معلوم تو ہو کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ بڑی دیر کی منت سماجت وعدے اور نہ معلوم کیا کیا کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کل کے سینما جانے پر والدہ صاحبہ نے بیگم کو کچھ کہا ہے۔ ہم نے بہت دلدہی کی۔ والدہ کی طرف سے خود معافی چاہی ہم کو بھی والدہ صاحبہ کی یہ تنبیہہ بری معلوم ہوئی۔ اور کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔

دو چار روز کے بعد ہی سسرال سے بلاوا آگیا۔ خدا ہی نے دیکھا۔ فوراً چلنے کو تیار ہو گئے۔ والدہ صاحبہ نے کہا بھی کہ آئے ہوئے ابھی پانچ دن ہوئے کہ پھر چلے۔ مگر ہم نے یہ کہہ کر کہ بیگم کی طبیعت ذرا خراب ہے وہاں ان کا خانگی ڈاکٹر بہت اچھا ہے۔ ذرا علاج ہو جائے گا۔ سردست اس معاملہ کو ٹال دیا اور روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ یہ ضرور ہوا کہ جس قدر ممکن ہو سکا۔ زیادہ سے زیادہ سامان اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اب زیادہ تر سامان ایسا رہ گیا جو بھاری اور وزنی قسم کا تھا۔ اس کی منتقلی کا کوئی بہانا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب ہم نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ ہو روز کی دا تا کِل کِل سے بہتر یہ ہے کہ سسرال میں ہی رہا جائے۔ تھوڑے روز کے بعد ایک ایسا بہانہ ہاتھ آگیا کہ ہماری سامان بھی منتقل ہو گیا۔ اور ہم اب یہاں منتقل سکونت پذیر ہو گئے ہیں وہاں والد صاحب، والدہ صاحبہ، خالہ صاحبہ، ماموں صاحب وغیرہ جس کو دیکھو ایک نہ ایک بات ٹیڑھی ہی کرتے تھے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی نصیحت ہو رہی ہے۔ طعنہ دیا جا رہا ہے۔ اوروں پر رکھ رکھ کر ہم کو سنایا جا رہا ہے۔ آخر ہم بھی انسان تھے۔ کہاں تک یہ روز کی مصیبت اٹھاتے۔ اب ہم سسرال میں بڑے آرام سے رہتے ہیں نہ کوئی طعنہ دیتا ہے نہ ہماری کسی بات پر ہم کو ٹوکتا ہے۔ ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور نہایت مزے سے دن گذار رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کی عمر چالیس سال کے بعد پختہ ہوتی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے بھی چالیس سال سے کم عمر میں کسی کو پیغمبری نہیں دی۔ سسرال میں ہم کو رہتے ہوئے اور والدین کو چھوڑ کر تقریباً پندرہ۔ سولہ سال گذر گئے مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ اس کے بعد ہم کو اپنے والدین کیوں اکثر یاد آتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہر ہفتہ

تعطیل کے دن ہم وہاں ضرور ہو آتے ہیں مگر دل میں ایک کھٹک ضرور محسوس کرتے ہیں۔ غور کیا اور بہت غور کیا۔ چونکہ عمر چالیس سے بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ اب ہم اکثر سونچا کرتے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ ہمارے والدین اور ہمارے دوسرے رشتہ دار جتنی باتیں ہم کو کہتے تھے۔ اور جو ہم کو شادی کے بعد بُری معلوم ہوتی تھیں کیا وہ صحیح تھیں یا یونہی زبردستی اتہام تھا۔ یا ہماری بیگم سے کوئی پُرخاش تھی۔ ہم جتنا غور کرتے تھے۔ ہم کو اون کی اوس وقت کی باتیں نہ تو بُری معلوم ہوئیں اور نہ بیجا تھیں بلکہ جس قدر سونچا اوس میں ہماری بھلائی وغیرہ تھی۔ پہلے بھی یہ لوگ اسی طرح خفا ہوتے تھے مگر سمجھ کیا بات ہے کہ اوس سے پہلے ہم کو یہ باتیں بری معلوم نہیں ہوئیں اور نہ ہم کو خیال آیا کہ یہ بری ہیں۔ مگر جب سے شادی ہوئی وہی باتیں ہم کو ایسی کیوں معلوم ہونے لگیں۔ بہت عرصہ تک سوچنے کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ گو اس زمانہ میں ہماری آنکھیں ضرور تھیں مگر ایسی تھیں کہ اون سے کچھ دکھائی نہیں دیتا اور نہ سمجھ ایسی تھی کہ اون کو کچھ سمجھتے۔ اس لئے عقل اور سمجھ کے جو دروازے تھے وہ بند پڑے تھے۔ شادی کے بعد شریک حیات نے رفتہ رفتہ وہ دروازے کھولے آنکھوں پر سے پردہ اٹھایا اور خود عینک بن کر ہم کو دیکھنے کے لئے کہا تو واقعی ہم کو دکھائی دیا کہ ہمارے والدین میں ہمارے رشتہ داروں میں تمام برائیاں ہی برائیاں ہیں اسلئے ہم نے بھی اپنے تمام رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ اور ہماری بیگم کے تمام رشتہ دار ہم کو اپنے اور بالکل اپنے رشتہ دار دکھائی دینے لگے۔ بیگم کے آنے سے پہلے ہمارے جتنے عزیز و اقارب تھے وہ سب اب غیر معلوم ہونے لگے۔ بہرحال خدا بھلا کرے اس عینک کا کہ ہم کو اس قابل بنا دیا کہ ہم اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے لگے۔

اس تمام مضمون کے بعد میرے نتیجہ نکالنے سے پہلے غالباً آپ لوگ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے عینک کے لفظ کی جو تمہید باندھی تھی وہ صحیح تھی یا نہیں؟ اب آپ لوگ جو بھی اس کو مہربانی فرما کر پڑھیں وہ خود خیال کریں کہ آیا اون کے پاس بھی عینک ہے یا نہیں ہے اور جو بہنیں اس کو پڑھکر مجھ کو برا بھلا فرمائیں۔ وہ کہنے سے پہلے یہ سونچ لیں کہ آیا وہ خود بھی عینک بن چکی ہیں یا نہیں؟ یہ بہت ممکن ہے کہ پانچ فیصدی شاید ایسے لوگ بھی ہوں گے جنھوں نے عینک کو ان معنوں میں استعمال نہ کیا ہو۔ مگر میں جہاں تک سمجھتا ہوں ۹۵ فیصدی ضرور ایسے ہیں کہ انھوں نے اس عینک کو میری عینک کی طرح ضرور استعمال کیا ہوگا۔ کر رہے ہیں۔ اور آئندہ کریں گے۔ یہ آج کل کی ہوا ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا اور اگر کوئی بچ گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ آج کل کے ہندوستان کا سب سے بڑا سورما اور بہادر ہے +

---

(۱۶۹)

ڈاک

(عکاس)

یقیناً اوروں کیلئے پیام راحت ہے لیکن مجھ خوش نصیب کیلئے ہمیشہ مصائب و آلام کا پیغام ثابت ہوئی ہے۔ ڈاکیہ کو دور سے ہی دیکھکر باچھیں کھلجاتی ہیں۔ مگر مجھ مسرور کیلئے اوس کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی حرمان اور مایوسی کی نوید پہنچاتا ہے۔ جبکہ دوسرے نہایت خندہ پیشانی سے اوس کا استقبال کرتے ہیں اور میں کوسوں دور بھاگنے کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہوں آپ مسرور اور شگفتہ رہتے ہیں کہ شادمانیاں اور کامرانیاں ملفوف ہوں گی اور میں گھبراتا ہوں کہ خدا جانے کتنے خطرناک بمب اور کتنی 'سوختہ سامانی' کی اسکیمیں ہوں گی آپ بیرنگ ڈاک وصول کرنے پر نازاں اور شاداں رہتے ہیں کہ 'پیام یار' ہوگا۔ اور میں ٹکٹ ہونے پر بھی قبول کرنے سے عمداً گریز کرتا ہوں کہ پیغام اجل' نہ ہو۔ ڈاک کیلئے آپ کی روزآنہ مسرتیں اور میرے لئے ہر روز کی قیامتیں۔ پریشان کن ہیں۔

چین ایک لحظہ کو، ایک لمحہ کو امید فلاح۔ اپنے حصہ میں نہیں، ڈاک اور ڈاکیہ سے پیچھا چھڑانے کیلئے کوئی ایسا مقام بھی نہیں ملتا کہ جہاں غالب کا فلسفہ کوئی نہ ہو' پورا اترے۔ عہد جدید کے شسلر اگر چیکہ بمب پروف سہی۔ لیکن میرے لئے اس جائے پناہ میں بھی ڈاک کی آواز صور اسرافیل سے زیادہ ہیبت ناک ہے اور یہ شیطان کسی جگہ بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

لطف یہ کہ آپ ڈاک وصول کرکے ڈاکیہ کی ہمت افزائی فرماتے ہیں اور بخشش و کرم سے حوصلہ بڑھاتے ہیں میں سوچتا ہوں پروردگار ڈاک اور ڈاکیہ پر بم کیوں نہیں گر پڑتا اور دنیا سے اس کا وجود مفقود کیوں نہیں ہو جاتا۔

صبح بستر سے اوٹھتے ہی آپ ڈاک کی پذیرائی کیلئے اپنی آنکھیں فرش راہ کئے دیتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے رستہ میں کانٹے بچھا دوں۔ ورنہ آفتاب کہیں سوا نیزے پر نہ آجائے۔

مگر ظالم ڈاکیہ باوجود میری اتنی احتیاط کے ڈاک پہنچا ہی جاتا ہے۔ کانپتے ہاتھوں، دھڑکتے دل خشک لبوں۔ زرد چہرہ پر بھی اوسے رحم نہیں آتا۔ چہ ستم یہ ہے کہ اکثر اوس کا تبسم زیر یہ کہتا "حضور آج تو انعام دلوایئے" تیر بن کر کھٹکتا ہے۔ جی تو چاہتا ہے ساری ڈاک مع ہستی کے اوس پر دے ماروں مگر مجبوری یہ ہے کہ قانون مانع ہوتا ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے ذیل کی اسکیموں پر غور کیجئے کہ آخر انسان زندہ رہے تو کیونکر۔

"ا۔ زنگہ شکر کا اوٹھنا بھی ہوا ہے مشکل ہے۔ گردنیں اتنی جھکا دیں تیرے احسانوں نے" آپ کی کرمفرمائیوں کا، قبقدر ظرف، شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ میرا بے بس سکوت کسی طرح تکلم بلیغ بن سکے تو خدا کیلئے اسی کو اعتراف شکر سمجھئے۔ آپ کے خوبصورت عذر کے لئے "گناہ نکردہ" کا بھی اعتراف کرتی ہوں اس کے ساتھ چشم منفعل کا تماشہ دیکھئے

متمنی۔ اگرچیکہ بے بال و پری نے کسی قابل نہ رکھا۔ آزاد زندگی کی لطافت ختم ہو چکی۔ ع "طاقت نغمہ و پرواز کہاں سے لاؤں" اپنی عرش آسا بلند پروازی چھوڑ کر کبھی فرش کے غریبوں پر بھی نظر ڈالئے۔

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را توانگران نخوردہ گزند را چہ خبر

آپ کو کیا خبر کہ وہ لطافت حیات اور بلند پروازی خیال گذر گئی ختم ہو گئی۔

۲۔ اپنی خیریت مجھے کوئٹہ کے زلزلہ کے بعد بھی کبھی نہ ہوئی۔ بیشک آپ پریشان ہو گئے۔ تعجب ہے کہ آپ کو خط کیوں نہیں لکھا۔ آپ کا خیال ہمیشہ ہے اور رہے گا۔ خط نہ لکھنا بالکل اور بات ہے اس کا تعلق بے تعلقی سے مطلقاً نہیں ہوتا۔ سچ بتایئے آپ کیسے ہیں؟ ہائے وہ پرانے دن۔ کدھر چلے گئے کتنی خوابوں کی بستی کو عبور کر کے نکل گئے۔ جنگ نے زندگی کی عشرتوں میں خلل اندازی ڈال رکھی ہے۔ زندگی اوداس کر دی مسلسل تاریکی نے راتوں کو ویران کر دیا۔

۳۔ مجھے آپ کے خیال سے اختلاف ہے "عورت" کبھی اپنے حسن کی تعریف سُن کر خوش نہیں ہوتی ہماری ساتھیوں سے جب کوئی تبصرہ کرتی ہے کہ "اللہ تم کتنی اچھی ہو وغیرہ تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ شرم سے کٹ کر رہ جاتی ہوں، دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بھاگ جاتی ہوں اس وقت سے زیادہ بے چین اور پریشان کبھی نظر نہیں آتی بالکل نیم پاگل سی حالت ہو جاتی ہے۔ میری زلفین بریدہ کیوں ہونے چلیں۔ ہائے کتنا بُرا معلوم ہوگا۔ مجھے غصہ آتا ہے ان پر جو شان کے مارے بال کٹوا دیتی ہیں، "آپکے سفارش کی ضرورت نہیں۔ ہماری فہمی خود ہماری سفارش کر دیتی ہے۔

۴۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ دن سخت امتحان کے ہوتے ہیں۔ الحمد اللہ کہ کامیاب نظر آتی ہوں۔ سب گر دیدہ ہیں یقیناً دوستو کے مزاج سے واقف ہونا اور طبیعت پر قابو پانا نہایت کٹھن ہے۔ یہ ہو گیا تو سمجھئے کہ بند بند قید میں ہے۔ اپنے بھائیوں کو منا لینا کچھ مشکل نہیں۔ ان کے دلوں میں سوائے محبت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی طرف دیکھئے۔ بھائیوں کے دل ایسے ہی ہونے چاہیئے اور یقین کیجئے کہ بہنوں کو اس سے زیادہ چاہت ہوتی مگر بیچاریاں جب تک اپنے کو مٹا نہ ڈالیں تب تک زندگی نہایت تلخ ہوتی ہے۔ اگر ایک دفعہ کا یہ حکم کہ اپنے ہر ایک کو چھوڑ کر صرف ہم لوگوں کا ہی نام جپو۔ مان لیا تو خدا شاہد ہے۔ دو ایک سال کی ریاضت کے بعد آج اگر ہی حکم میں دوں تو گھر کا بچہ بچہ ماننے کو تیار ہے۔ اچھے لوگ ہیں کہ نیکی اور شرافت کے خواہاں ہیں۔

میں اپنے دل کی قیمت عرض کر دیتا دو جگ بالآخر مگر ارشاد تو ہو آپ کی ہمت کہاں تک ہے

جنوں کا ادعا حد تکلف میں نہ کر اکبر گریباں چاک ہے تیرا مگر دیکھوں کہاں تک ہے۔

ناہید

جلد ۶ — دے سنہ ۱۳۵۲ف م نومبر سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۲

۱- عجیب کمزوری - عزیز سلطانہ پہلی مرتبہ ناہید میں تشریف لائی ہیں اور اپنی کمزوری کا اظہار کیا ہے مشق جاری رکھیں تو مستقبل میں اور بھی اچھا لکھ سکیں گی۔

۲ - گھوڑے کی آپ بیتی - رفعیہ سلطانہ ، اچھا لکھتی ہیں اور ایک عرصہ سے ناہید کو فراموش کر دیا ہے زیر اشاعت مضمون بھی غالباً کسی کی فرمائش پر لکھا ہوگا - مگر اونھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ناہید ہی اون کی مشق کا اولین گھوارہ رہا ہے پھر اوس کو فراموش کر دینا صریح ظلم ہے۔

۳ - امتحان - ساحرہ کے واردات ہیں غالباً ہر امتحان میں شرکت کرنے والی پر ایسا ہی گذرتا ہوگا۔

۴ - قرض کی لعنت - صغرا عبد السبحان نے جب کبھی لکھا وہ سماج ہی پر لکھا اور اس وقت ضرورت بھی ایسے ہی مضامین کی ہے۔

۵ - بلندی وپستی - ساجدہ احمد محی الدین کا مضمون غور کے قابل ہے۔

۶ - فیشن پرستی اور پردہ - خواتین کیلئے دعوت فکر دیتا ہے رافعہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح مشاہدہ ہے۔

۷ - افسانوی خط - رشید فاطمہ کی اولین کوشش ہے اوس کی طوالت کئی اقساط چاہتی ہے جس کا ہم کو افسوس ہے۔

"ب"

"عجیب کمزوری"

سلطانہ عزیز بی۔اے ابتدائی (کلیہ اناث)

کون اپنی فطری کمزوری کو عریاں کرنا چاہتا ہے۔ہر شخص کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپائے۔خود کو مرقع نیکی و مجسمہ خوبی بتائے۔لیکن میں ان نظریات کے برعکس اپنی کمزوری صاف صاف بتلائے دیتی ہوں۔اس کی بدوضع لمبی لمبی ٹانگیں میرے سارے بدن میں پھریریاں پیدا کردیتی ہیں۔جب کبھی میری نظر ٹڈے کی غیر شاعرانہ مورت پر پڑجاتی ہے میں لوگوں کی نظروں سے خود کو بچاتی اس جگہ سے رفوچکر ہوجاتی ہوں کسی گوشۂ عافیت میں سکون کا سانس لیتی ہوں۔جہاں اس بے ڈول پرندے کی رسائی نہ ہوسکتی ہو۔جب سیاہ سیاہ بھیانک بادل آسمان کو ڈھانک لیتے ہیں۔خوفناک بادل کسی تنومند دیو کی طرح زور زور سے ڈکار رہے لیتے ہیں۔نظروں کو خیرہ و چکا چوند کردینے والی برق مسلسل چمکتی رہتی ہے۔یعنی ساری فضا قیامت برساتی ہے۔میں اس ورانڈے سے اُس ورانڈے تک بہادرانہ شان سے چلی جاتی ہوں۔نہ کبھی اس کا خیال آیا کہ برق خرمن حیات کو خاکستر کردے گی یا مہیب بادل کا بڑا بھاری ٹکڑا میرے سر پر گر کر مجھے تہہ زمین کردے گا۔لیکن میں ٹڈے سے ڈرتی ہوں۔گو وہ قدرت کا ایک حقیر ترین کرشمہ ہے لیکن میرے لئے بڑا بھاری شاہکار ہے۔جو انسان ایسی اشرف المخلوقات ہستی کے ڈرانے کے لئے کافی ہے۔میں پہروں سوچتی ہوں۔میں اس سے کیوں ڈروں؟ یہ بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے انسانی فوجی ہاڑ کے آگے ایک بھنگا بھی تو ہے۔کمزور ترین ذرہ ہی تو ہے۔دل میں ٹھان لیتی ہوں کہ اب اگر خدانخواستہ اس سے ملاقات ہوجائے تو میں اپنی جگہ ایک بے حس چٹان کی طرح جمی رہوں گی۔

بڑی حسین چاندنی رات تھی۔لیکن روح فرسا امتحانات سر پر موت کی طرح کھیل رہے تھے فرصت کسے تھی کہ شب مہتاب سے لطف اندوز ہوتے۔میں اَن پڑھی کتابوں کے مطالعہ میں محو تھی۔نیند بری طرح سوار تھی۔غنودگی نے پڑھنا نہ پڑھنا برابر کر رکھا تھا۔گھنٹے نے بارہ بجائے۔میں نے روشنی گل کی جھپکے سے اٹھی۔خنک بستر پہ دراز ہوگئی۔جب کتاب ہاتھ میں تھی۔نیند کے جھونکے پہ جھونکے آرہے تھے یا بستر پہ لیٹتے ہی نیند غائب۔بڑی کوفت ہوئی۔غصہ بھی آیا۔کیا کرتے۔دبکے پڑے رہے۔ٹہلنے کا جی نہ چاہا۔سنہری فضا کا لطف لیٹے ہی لیٹے اٹھانے لگے۔ پھُر پھُر سی آواز آئی۔سارے جسم میں برقی روئیں گزرنے لگیں۔میں نے بے کیف سانس لیا۔مچھردان کا باقاعدہ جائزہ لینا شروع کیا۔سرہانے ایک گوشہ میں میاں ٹڈے بغیر اطمینان بخش حالت میں جالی سے چمٹے ہوئے تھے۔سامنے

رستمانہ (رستم آنہ) منصوبے دماغ سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ جرات آفرینیاں مٹ چکی تھیں۔ آہستہ سے بغیر سانس لئے اٹھی۔ چپکے سے مچھردان کھولا۔ پلنگ سے بے چینی میں اتر پڑی۔ ننگے پاؤں صحن میں پہنچ گئی۔ دل کی دھڑکن ذرا سی تیز ہو چکی تھی۔ پاؤں میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی کمزوری سے نجات پانے کے لئے غیر اطمینان بخش ہوتے ہوئے بھی اطمینان سے ٹہلنے لگی۔ معبود! کیا آج کی رات یوں ہی چہلقدمی میں گذر جائے گی۔ خدایا کیا یہ شب بیداری میں بیت جائے گی۔ بھئی یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ اس کمبخت کو نکالنے کی تدبیر کرنی چاہئیے۔ کسی موٹے کپڑے سے پکڑ کر باہر بہت دور پھینک دینا چاہیئے۔ مصمم ارادہ کر لیا۔ ہمت کی۔ دبے پاؤں مچھردان کے قریب پہنچی۔ وہ حسب حال وہیں چپکا ہوا تھا۔ پریشانی اور کمزوری کی لہریں دوڑنے لگیں۔ دل پر پتھر رکھا۔ مچھردان احتیاط سے اٹھایا۔ ہم نے سمجھا ہم نے بڑی سخت احتیاط برتی ہے۔ لیکن درحقیقت ہم نے گھبراہٹ میں بڑا زور کا جھٹکا دیدیا تھا۔ وہ مچھردان میں پھر سے اڑا۔ ایک بری آواز سارے ورانڈے میں مرتعش تھی۔ میں دوڑی اور دور کھڑی ہو گئی۔ عجیب کشمکش میں تھی کہ کیا کروں اگر کسی کو اٹھاؤں تو گناہ الگ ہو اور مضحکہ الگ اڑے۔ خیر میں اسی سوچ میں تھی کہ رضیہ کی ہنسی سنائی دی۔ میں چونک پڑی۔ اس نے چھت شگاف قہقہہ لگایا۔ شاید اس نے سارا منظر پاس دیکھ لیا تھا۔ میرے پاس آئی اور مجھ سے کہنے لگی۔ باجی آپ نے ناحق اتنی پریشانی اٹھائی۔ محلے والوں کو امداد کے لئے پکار لیا ہوتا۔ وہی بیچارے مدد کو آن پہنچتے۔ میں نے ملتجی نگاہیں اس پر ڈالیں، عاجزی سے کہا۔ ذرا ٹڈے کو پھینک دو نا باہر۔ وہ مچھردان کی طرف اس بہادرانہ انداز سے جاتی دکھائی دی جس طرح ایک مجرد سپاہی دشمن کی فوج کے مقابلہ کے لئے جاتا ہے۔ اس نے بڑی آسانی سے اس بے ڈھنگے پرندے کو اپنی انگلیوں میں دبوچا اور صحن میں آ کر پوری طاقت سے اوپر اوچھال دیا۔ بہر حال رات گذر گئی۔ صبح سب نے رات والا دلچسپ حادثہ سنا۔ کافی سے زیادہ مذاق اڑایا۔ ہم کر ہی کیا سکتے تھے حقیقت تھی۔ خاموش ہو رہے۔ یہی کہہ کر چپ ہو رہے "جواب جاہلاں باشد خموشی"۔

ہم مکتب بس میں جایا کرتے ہیں۔ ایک گوشہ بس میں منتخب کر رکھا ہے جس پر ہم ہمیشہ قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہٹ دھرمی سے قابض ہو جاتا ہے تو خدا جانے کیوں آپ ہی آپ اس کو ہم پر رحم آ جاتا ہے۔ وہ کوئی اور جگہ بیٹھ جاتا ہے مجھے اس کونے سے بڑا انس ہو گیا ہے۔ کسی اور جگہ کل ہی نہیں پڑتی۔ ہاں تو میں اسی قدیم جگہ بیٹھی اور لڑکیوں سے گپ شپ ہانک رہی تھی۔ یکایک کان کے پاس پھر پھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کیا دیکھا۔ بس مت پوچھئے۔ کمبخت ٹڈا میرے بازو جلوہ افروز تھا۔ میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے جھٹ سے درمیانی نشست پھلانگی اور دوسری سیٹ پر جا بیٹھی۔ اہل بس مجھ پر خنداں تھے۔

لیکن میں بت کی طرح مبہوت تھی۔ بس تیزی سے گذر رہی تھی۔ کمزور ٹڈا لوہے کی جالی سے باہر نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ شریر عفت نے درمیانی سیٹ سے ہاتھ بڑھایا اور اس کو پکڑ لیا۔ میرے رہے سہے اوسان جلتے رہے میں گھبرا رہی تھی۔ پسینے میں ڈوبی جا رہی تھی چہرے سے انتشار ہویدا تھا۔ وہ مجھے دکھا رہی تھی۔ وہی ٹڈے کی منحوس شکل کو جس سے میری روح پھڑکنے لگتی ہے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ شرافت سے باہر پھینک دو۔ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ وہ بھلا ماننے والی کہاں، شیطان کی خالہ۔ کبھی ہاتھ مع ٹڈے کے بڑھاتی۔ کبھی بدن پر پھینکنے کی دھمکی دیتی۔ غرض کوئی پندرہ منٹ تک میرا ناک میں دم کر دیا۔ نیم بیہوشی طاری ہو رہی تھی۔ کاش میں آج نہ آتی۔ کاش بدنما ٹڈے کو سوار ہوتے وقت دیکھ لیا ہوتا۔ اس نے بڑی مشکل سے دوسری لڑکیوں کے کہنے پر۔ اس غریب کی جان پر رحم کرنے کی درخواست کرنے پر شوخ عفت نے ٹڈا پھینکا۔ جان میں جان آئی۔ حواس ٹھکانے ہوئے۔ میں نے غصہ سے عفت کو دیکھا۔ خفگی کے آثار چہرے پر نمایاں کر لیئے۔ لیکن اس نے سارا بھانڈا دوسری لڑکیوں میں پھوڑ دیا۔ جو مجھے اکثر چھیڑا کرتی ہیں۔ آخر سُن ہی لی آپ نے میری کمزوری۔ خیر آج سے میں نے اسے دُور کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ امید کہ ایک دو ماہ میں عفت اور رضیہ کی طرح ٹڈے پکڑا کروں گی کیونکہ ’’مشق انسان کو کامل بناتی ہے‘‘ اگر واقعی ہم نے مشق جاری رکھی تو انشاءاللہ دلیر ٹڈوں کی گرفتاری میں بہت جلد کامیاب ہو جائیں گے۔ کیوں ہے نا ٹھیک ـــــ ؟؟؟

رفعیہ سلطانہ بی۔ اے ابتدائی

کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے　　　بڑا پُر درد ہے میرا فسانہ

آپ مجھ سے میری آپ بیتی سننا چاہتے ہیں۔ ایک غریب حیوان بھلا اس کی آپ بیتی کیا ہو سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ پیدا ہوا۔ مشقت کیا۔ دکھ بھوگا اور مر گیا۔ ہمارے نزدیک زندگی کا مفہوم کمانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پیٹ بھر چارہ مل جائے پھر آپ کتنا ہی کام لیجئے۔ ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ یہ ہے ہماری زندگی اور زندگی کی معراج نہ ہم میں آپ جیسی اعلیٰ عقلی ذہنی قابلیتیں اور نہ ہی ایسے ذرائع ہیں۔ کیوں نہ آپ اشرف المخلوقات ہیں نا۔ خدا کے نائب جو ٹھہرے۔ آپ کو ہمارے مطیع کرنے کے کیسے کیسے ہتھکنڈے یاد ہیں۔ اف۔ کاش خداوند مجھے

بھی عقل دیتا۔

سوچتا ہوں۔ع

"حیواں بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی"

لیکن نہیں۔میں نے یہ غلط کہا۔میں دیکھتا ہوں۔آپ انسانوں کے دل مطمئن نہیں۔آپ کے سینوں میں پامال شدہ تمنائیں، حسرتیں اور آرزو کی خلشیں کروٹیں لیتی ہیں۔آپ کی بیتی بیتی نہیں۔شکست دل کی صدا ہے اور ہم۔ہم بیچارے حیوان۔ہم کیا جانیں۔آپ کی مہذب دنیا کی جھوٹی عیاریاں۔ہمارے سینوں میں دل ہیں کہاں جو آرزوئیں اور حسرتیں پیدا ہوں۔اچھا ہی ہوا جو خدا نے ہمیں دماغ کے ساتھ دل سے بھی محروم رکھا۔اس سے آپ یہ مت سمجھے کہ ہم میں احساسات اور جذبات نہیں۔ہم میں یہ موجود ہیں۔لیکن اس کی نوعیت بالکل الگ ہے ہمارے جذبات بالکل اصلی اور نیچرل ہیں۔ہم شدت تکلیف سے چلا اٹھتے ہیں۔خوشی میں آکر ہنہنانے لگتے ہیں۔ لیکن آپ جیسا اپنے جذبات کو چھپانے پر قادر نہیں۔ہم کو تصنع اور بناوٹ چھو تک نہ گئے۔ہمیں بھی اپنے آقا سے انس ہوتا ہے اور اس پر جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔گو حیوان ہیں۔لیکن اپنی مادہ اور بچوں سے انس ہوتا ہے۔البتہ ہم اس محبت کو اپنے لئے زنجیر نہیں بنا لیتے۔بلکہ بن کی ہوا کے مانند آزاد رکھتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے اسے بات میں بات نکل گئی اور میں انسان و حیوان کے بنیادی فرق گنوانے بیٹھ گیا۔اب میری اصلی بپتا سنئے۔پیشتر اس کے کہ میں اپنی بیتی شروع کروں۔بہتر ہوگا میرے آبا و اجداد کا مختصر حال بیان کردوں۔ میرے آبا و اجداد خالص کی عرب کی پیداوار تھے۔شہنشاہ بابر کے ہمراہ ہندوستان آئے آپ تو تاریخ پڑھتے ہیں نامعلوم ہی ہوگا کہ پہلے زمانہ میں جب آپ کی موٹریں اور ہوائی جہاز وغیرہ نہیں تھے۔ہم ناچیزوں کی کتنی قدر تھی۔بڑی بڑی جنگوں میں کامیابیاں ہماری ہی مرہون منت ہوتی تھیں۔یاد ہے آپ کو پہلے زمانے کی لڑائیاں ۔؟ ذرا تاریخ اٹھایئے معلوم ہو جائے گا کہ راجہ پورس کے کوہ پیکر ہاتھیوں کو کس نے شکست دی۔ہم ہی خاکساروں نے۔ہم ہی نے سکندر کا نام اتنا بلند کیا۔مگر سکندر محسن کش نہ تھا۔اس نے ہماری خدمات کا معاوضہ اس طرح دیا کہ ایک شہر ہمارے ایک بھائی کے نام پر آباد کر دیا (سکندر نے ہندوستان میں اپنے ایک عزیز گھوڑے "بیوسے فلس" کے نام پر ایک شہر آباد کیا تھا)

غرض کیا بتاؤں کسی نے شاید ہمارے لئے ہی کہا کہ ؎

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے ۔۔۔ پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

اور

تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے۔

"ہر عروجے را زوالے" قدرت کا اٹل اصول ہے۔ اس کے بعد ہماری قسمتوں نے پلٹا کھایا۔ نہ پہلے کے قدر دان رہے اور نہ ویسی قدر دانی۔ ان سیاہ سیاہ ہیبت ناک آوازوں والی موٹروں اور ریلوں نے ہمارا بازار سرد کر دیا۔ میری پیدائش اسی زمانہ میں ہوئی۔ میں نے ایک امیر آدمی کے گھر میں جنم لیا۔ جہاں میری ہی نسل کے اور بہت سے عمدہ گھوڑے تھے۔ میری پرورش کیوں ناشکری کروں ناز و نعم ہی میں ہوئی۔ کیا بتاؤں جب میں نے اس دنیائے رنگ و بو میں قدم رکھا میری کیا حالت ہوئی۔ سبزہ، پھول، سورج کی کرنوں کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔

میرا بچپن جیسا کہ قاعدہ ہے بڑے آرام و آسائش سے بسر ہوا۔ بچپن کا زمانہ ہوتا ہی بےفکری کا ہے خواہ وہ انسان کا ہو یا حیوان کا، مزے میں چارہ کھاتا اور کھلے میدان میں اپنے ہم عمر گھوڑوں سے کلیلیں کرتا پھرتا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ مستقبل کن تکالیف کا حامل ہوگا، کون جانتا تھا کہ قدرت میری اس بےفکری کا مذاق اڑا رہی ہے، اور

میری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

دن گذرتے گئے اور میں ایک جوان گھوڑا بن گیا۔ میرے جیون کے سہانے سپنے ایک بھیانک خواب میں بدل گئے۔ میرے آقا کے بیٹے نے مجھے اپنی سواری کیلئے منتخب کیا۔ یہ بڑا تنومند قوی ہیکل نوجوان تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ کل مجھ پر زین کسی جانے والی ہے تو اپنے سلب آزادی کا بڑا قلق ہوا۔ اس دم سے میرے سینے میں مسرت اور خوشی کی سوتیں خشک ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے ناکہ مجبوری اور ظلم انسان کو انتقام پر مائل کر دیتا ہے۔ میرے بھی سینے میں انتقامی جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ میں نے سرکشی کی ٹھانی اور عزم مصمم کر لیا کہ کبھی اپنی آزادی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔

دوسرے دن صبح سائیس مجھے ایک وسیع جگہ لے گیا۔ میں نے دولتیاں لگانی شروع کیں۔ سائیس نے اپنی مدد کو اور دو تین آدمی بلالئے۔ غرض بڑی مشکل سے مجھ پر زین کسی گئی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد یکایک مجھ میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور میں نے اپنے مالک کو گرا دیا۔ مگر اس کا انجام بہت برا ہوا۔ میرے آقا کا بیٹا کئی دن تک فریش رہا اور بستر سے نہ اوٹھ سکا۔ مجھ پر قسم قسم کے تشدد کئے گئے۔ پہلا ظلم دانا بند ہو گیا دوسرے چارے میں تخفیف ہو گئی اور کانٹے دار لگام میرے لئے تجویز کی گئی۔ نہ صرف اس پر اکتفا کیا گیا بلکہ بجائے سواری

کے ٹانگے میں جوت دیا گیا۔ میں قسمت پر شاکر ہو کر خاموش بیٹھ رہا۔ کیا بتاؤں ٹانگے میں جوت جانے کا حال مجھے صبح سے شام تک ایک منٹ کیلئے بھی آرام نصیب نہ تھا۔ میرا ہانکنے والا۔ اپنے مالک کے کرایے کرنے کے بعد اپنے لئے بھی کچھ کرایے کر لیتا۔ کبھی کبھی مجھے منوں وزن اٹھانا پڑتا۔ اف کیا بتاؤں اس وقت میری کیا حالت ہوئی خیر مرد جس وقت ٹانگے میں سوار ہوتے کبھی دو تین سے زیادہ نہ بیٹھتے۔ لیکن عورتوں کا مت پوچھئے۔ بیک وقت چار، چار، پانچ، پانچ اور بعض اوقات چھ چھ خواتین مجھ پر رونق افروز ہوتی ہیں۔ کیوں نہ ہوں صنف نازک جو ٹھیریں۔ کسی نے ان کے متعلق بالکل سچ کہا ہے کہ ربڑ کی گڑیاں ہیں جو اتنی سی جگہ میں سما جاسکتی ہیں لیکن کیا معلوم کہ مجھے کتنی تکلیف ہوتی۔ خیر یہ تکلیف برداشت بھی کر لیتا۔ اگر مجھے غذا اچھی ملتی۔ دانے چارے کا عمدہ انتظام ہوتا۔ لیکن اس زمانہ میں ہمیں کون پوچھنے والا تھا۔ متمول اور متوسط لوگ موٹروں کے دلدادہ تھے۔ غریب آخر غریب تھے۔ وہ بیچارے اپنا پیٹ مشکل سے پالتے ہیں۔ ہماری کیا خاطرداری کر سکتے۔

میں صبر و شکر سے دن گذارنے لگا۔ اور روز بارگاہ خداوندی میں اپنے دن پھرنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ کبھی سوچتا کیوں نہ خدا نے مجھے اُس زمانہ میں پیدا کیا جب ہماری قسمت عروج پر تھی۔ یا اب بھی کم از کم عرب میں پیدا کیا ہوتا۔ جہاں ہماری قدردانی کیجاتی ہے۔ آخر میری خاموش دعائیں بارگاہ خداوندی میں مستجاب ہوگئیں اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ موٹروں کا چلنا بالکل کم ہو گیا۔ بس اب کیا تھا۔ سب کے سب پھر ہماری طرف جھک پڑے۔ کسی نے کہا ہے نا کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے۔ اور اب تو کیا بتاؤں کہ کیا حالت ہے۔ گو دم بھر کی فرصت نہیں ملتی لیکن قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ اللہ کرے خدا نے جیسے میرے دن پھیرے آپ کے بھی ایسے ہی پھیر دے۔

امتحان

ساحرہ

امتحان میں کچھ عجیب تاثیر ہے جس کا نام سنتے ہی ہر ایک سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ خواہ بعد میں اثرات مختلف ہوں۔ کلاس میں خواہ کتنا ہی شور کیوں نہ ہو رہا ہو مگر جیسے ہی ٹیچر نے امتحان کی خبر سنادی بس معلوم ہوگا لڑکیوں کو سانپ سونگھ گیا ہے جیسے یا کسی قریب ترین عزیز کی موت کی خبر سن پائی ہے ہر ایک کے چہرے سے پریشانی ہویدا ہوگی۔ طرح طرح کے منھ بن رہے ہوں گے۔ کوئی صاحبہ سست سی بیٹھی کسی سبق کا دکھڑا رو رہی ہوں گی

کہ "اللہ بھلا یہ حساب کس عقلمند نے کورس میں رکھا ہوگا اور کچھ نتیجہ بھی تو نہیں سوائے دماغ پاشی کے۔ پھر ہسٹری۔ میرے خدا۔ جان پر آتی ہے جیسے۔ بھلا یہ گڑے مردے اکھیڑنے سے فائدہ؟ کی ہوگی بادشاہت مغلوں نے لڑے ہونگے راجپوت۔ مرے ہوں گے فلاں لوگ۔ آخر ہمیں اس کھوج سے فائدہ؟" کوئی محترمہ دو چار لڑکیوں کا لئے بیٹھی بڑے مدبرانہ انداز میں اپنے تجربات سنا رہی ہونگی۔ کسی کو کچھ نہ سوجھا تو کتاب لے کر یوں بیٹھ گئیں جیسے ابھی سب کچھ یاد کرکے فوراً ہی امتحان دیدینگی اور زیادہ تر لڑکیاں تو بہت کچھ یاد رکھتے ہوئے بھی منہ بسور کر کہیں گی "اللہ ہمارا تو دماغ ہی عجب کند ہے کچھ یاد ہی نہیں ہوتا۔ قسم خدا کی ہمیں تو ایک لفظ بھی نہیں یاد" حالانکہ محترمہ سے کسی نے پوچھا نہ ہوگا زبردستی قسمیں کھانے لگیں۔ گویا کوئی انھیں سولی پر چڑھائے دے رہا ہے۔ اور بعض تو ہر چیز سے بے پروا اپنی گپ شپ میں ہی مصروف رہیں گی۔ غرض عجیب ہنگامہ سا رہتا ہے امتحان کی خبر کوسن کر ——

اب امتحان کی تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ مختلف لڑکیاں مختلف طریقوں پر تیاریاں کرتی ہیں بعضوں نے خوراک بھی کم کردی ہے عجیب گم سم سی نظر آتی ہیں اور بعضوں نے خوراک بڑھا دی ہے۔ خوب کھاتی ہیں مگر پڑھتی کچھ نہیں۔ کوئی صاحبہ بیٹھی ہسٹری کی کتاب سے سر پھوڑ رہی ہوں گی۔ ایک باب پڑھکر کتاب بند کرکے کچھ دہرانا چاہتی ہیں تو نتیجہ صفر۔ جھنجھلاکر کتاب پٹک دیتی ہیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر دوبارہ پڑھنا شروع کرتی ہیں۔ کوئی بیچاری حساب کی کتاب سامنے رکھے پنسل انگلیوں میں دبائے اپنا دماغ لڑا رہی ہیں۔ لیکن لاحاصل! بعض لڑکیاں تو امتحان کی بدولت خوب مزے کرتی ہیں۔ گھر کے ہر کام سے پندرہ بیس دن کے لئے بائیکاٹ کرلیتی ہیں اور اپنے کمرے میں بیٹھی ہمہ قسم کے تروتازہ میووں سے جو امی نے تاکید کے ساتھ کمرے میں رکھوا دیئے ہونگے دماغی فرحت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ اور رات کو بیچاری امی سر پر تیل دبا دیتی ہیں اور قریب ہی تپائی پر اسٹو رکھا رہتا ہے۔ رات کو جب تک جی چاہتا ہے اور جتنی پیالیاں چاہتی ہیں مزے میں بنا بنا کر چاے پیتی ہیں۔ چاہے پڑھتی ایک لفظ نہ ہوں۔ غرض امتحان کے نام سے خوب مزے اڑائے جاتے ہیں۔ اب اگر پاس ہوگئیں تو بات بنگئی اور فیل ہوگئیں تو خوب منہ بنا بنا کر روئیں گی۔ کبھی کسی ٹیچر پر غصہ اتاریں گی تو کبھی کسی کو برا کہیں گی۔ اور امی بیٹی کے منہ بسورنے پر قسمت کو کوس کوس کر سمجھائیں گی "نہ رو بیٹی قسمت میں فیل ہونا تھا ورنہ محنت تو تم نے جان توڑ کر کی تھی۔ رات کو رات نہ سمجھا دن کو دن۔ مگر قسمت بری ہو تو کوئی کیا کرے۔ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

ہم پر امتحان کا کیا اثر ہوتا ہے اور ہم کیسے امتحان دیتے ہیں۔ یہ بھی سن لیجئے۔ ابھی ابھی تو ہم نے امتحان دیا ہے ستائیس اگست کو ہم اپنی کلاس میں تھے۔ خوب ادھم مچا رہے تھے کہ خبر ملی۔ بائیس ستمبر سے امتحانات شروع ہیں۔ ساری لڑکیوں میں ہلچل مچ گئی۔ ہم بھی چونک پڑے "امتحان ہے" مگر پھر انگلیوں پر گن کر بولے "اونھ ابھی تو بہت دن ہیں" اور ایسا ہی اطمینان فیروزی سلمٰی اور زیبی کو رہا۔ ہم نے اس روز اسکول سے واپس ہوتے ہی گھر میں الٹی میٹم دیدیا کہ "اب ہم سے کسی کام کو نہ کہا جائے کیونکہ ہمارے امتحانات شروع ہونے والے ہیں" یہ حسب معمول ہم روز اسکول جاتے گپ بازی کرتے۔ ہنستے اور واپس آجاتے۔ ادھر دوسری لڑکیوں کا یہ حال ہر وقت بیٹھی بس پڑھا کرتیں۔ اور اکثر خیر خواہ لڑکیاں ہمیں بھی توجہ دلاتیں تو ہم کہتے۔ "اوہ ابھی تو بہت دن ہیں۔ ابھی سے یاد کرلیں گے تو پھر امتحانات تک بھول جائیں گے۔ اب امتحانات کو دس بارہ روز باقی رہ گئے تھے۔ ہمیں تین روز کی چھٹیاں ملیں۔ چھٹیوں بعد اسکول پہنچے تو کئی لڑکیوں نے استفسار کیا "کیوں بھئی تم نے کچھ پڑھا بھی ان چھٹیوں میں کہ نہیں" ہم نہایت سنجیدگی سے بولے "واہ کیوں نہیں۔ دو تین کتابیں پڑھیں"۔۔۔ "اچھا"۔ ؟ لڑکیوں نے تعجب سے پوچھا "تین دن میں اتنی کتابیں؟ کون کون سی کتابیں پڑھیں"۔۔۔ نہایت لاپروائی سے ہم نے جواب دیا" یہی شفیق الرحمٰن صاحب کی کرنیں۔ راجہ مہدی علی صاحب کی مرتبہ کتاب شمع حرم، اور ایک تیرتھ رام صاحب کا ترجمہ خونی ہیرا" اور آرسین لوپن کے کارنامے ۔۔۔ بس یہی چار کتابیں پڑھیں"۔۔۔ لڑکیوں نے تعجب سے مجھے دیکھا اور بعض خیر خواہ ہنس کر بولیں۔ اتنی لاپروانہ بنو ساحرہ۔ ایسے رہو گی تو کیسے بنے گا۔ کچھ تو پڑھو۔ اپنی کلاس کی کورس کی کتابیں ۔۔۔ دوسری کتابیں تو پھر بھی پڑھ سکتی ہو۔" ہم صرف ہنس دئے۔ ان دنوں میں ہمارے پروگرام بھی سن لیجئے۔ دن بھر تو اسکول میں گذرتا۔ رات کو خوب ٹھاٹھ سے چاد وغیرہ پی کر اپنے کمرے کی روشنی جلا کر کوچ پر دراز ہو گئے۔ اور کتابیں سرہانے سے پائینتی تک ہر طرف بکھیر لیں۔ کوئی بعض اچھی کتابیں مل گئیں کہانیوں وغیرہ کی تو وہ پڑھتے رہے۔ ورنہ کوئی دوسری کتاب منھ پر رکھکر خراٹے بھرتے رہتے۔ گیارہ بارہ بجے آنکھ کھلی تو روشنی گل کرکے اپنے بستر پر جا پہنچے۔ اب صبح کو اگر آٹھ بجے بھی اٹھے تو امی ایک لفظ نہ بولیں کیونکہ ان کے خیال میں میرے کمرے کی روشنی بارہ بجے تک جلتی۔ اسلئے میں بھی جاگتی رہی ہوں گی۔ بعض روز جلد نیند معلوم ہوئی تو سر پکڑ کر امی کے پاس گئے۔ امی سر میں بڑا درد ہو رہا ہے" امی بیچاری پریشان ہو کر کہیں گی۔ پھر تو آج ہرگز نہ جاگنا۔ جاؤ چپکے سے سو جاؤ۔ اور ہم جا کر سو گئے۔ لیکن بعض دفعہ منھ بنا کر بولے "نہیں امی اب

سوتے تو نہیں۔ کچھ دوا لگا دیجئے۔ پڑھنا ہے ہمیں۔ اگر فیل ہو گئے تو "۔ امی بولیں "خدا نہ کرے فیل کیوں ہو گی۔ انشاء اللہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گی جاؤ اب آج آرام کرو۔ کل سے پھر پڑھنا "۔ بس اتنا اصرار کافی ہے ہم جاکر سوجانے اور امی فرصت پاتے ہی آکر سر پر تیل دبائیں پھر آہستہ سے مسہری کے پردے گرا کر چلی جاتیں۔ بیچاری امی۔ کتنی اچھی ہیں۔ ہمارے کھانے کا تو ان دنوں میں خاص طور پر خیال رکھتیں۔ تازہ پھلوں کی پلیٹ ہر وقت میز پر موجود رہتی

اِدھر رمضان شروع ہوا اُدھر امتحان۔ دو دن پہلے سے ہم نے خوب محنت شروع کی تھی مگر دو دن میں بھلا کیا ہوتا ہے۔ خیر۔ پہلا پرچہ انگلش کا تھا۔ تھا بس یونہی سا۔ لیکن روزے کی وجہ سے ہمارے حواس ہی درست نہ تھے پتہ نہیں پرچے میں کتنے کھانے کی چیزوں کے نام ہم نے لکھ دئے۔ دوسرے روز ہسٹری اور حساب کا امتحان تھا۔ ہم نے افطار اور سحر دونوں وقت دسترخوان پر متعدد بار کہا کہ "اللہ ہماری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ کل بڑے مشکل پرچے ہیں اور روزہ کی وجہ سے تو کچھ کر ہی نہیں سکتے"۔ مگر جیسے سب نے کان میں روئی بھر لی تھی۔ کسی نے بھی نہ کہا "دو چار روزے چھوڑ دو"۔ خود ہی جھنجھلا کر چپ ہو رہے۔ حساب کا پرچہ تو خوب کیا مگر ہسٹری کا پرچہ دیکھکر ایک لامبی سانس لی اور ہنسنا شروع کیا۔ ایسا عجیب پرچہ تھا کہ کیا کہیں جو چیزیں معمولی سمجھ کر یاد کرنے میں ہم نے نظر انداز کر دی تھیں وہی سب لکھنا تھا۔ اوروں کی طرح مشکل سوال دیکھکر نہ ہم غش کھا کر گر پڑے نہ ہمارا سر چکرایا۔ نہ آنکھوں تلے اندھیرا چھایا۔ نہ ہاتھ لرزے نہ چہرہ فق ہوا اور نہ ہمیں پرچے کے الفاظ چلتے پھرتے نظر آئے۔ بلکہ چپ چاپ بیٹھے مسکراتے رہے۔ دُور بیٹھی ہوئی فیروزی بھی مسکرا رہی تھی۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ بھی نہیں کر سکتیں۔ اسلئے آدھ گھنٹہ بعد آٹھ دس سطریں اپنے دماغ سے تراش کر ہال کے باہر چلے آئے۔ اس کے بعد باقی پرچے تو اچھے ہی کرتے رہے۔ امتحانات ختم ہونے کے چوتھے روز سب نمبر معلوم ہوئے۔ سب چیزوں کے اچھے نمبر تھے صرف اچھے نہیں بلکہ بہت اچھے مگر ہسٹری میں ـــــ؟ اب جانے دیجئے۔ نمبروں کا یہاں کیا ذکر مجھے تو صرف اتنا سنانا تھا کہ ہم امتحان کیسے دیتے ہیں۔!

ـــــــــ(×××)ـــــــــ

بلندی و پستی

ساجدہ۔ احمد محی الدین

نہ عروج ہے نہ نزول ہے یہ خیال و وہم فضول ہے ۔ جو بلندیاں ہیں نشیب میں وہی پستیاں ہیں فراز میں

دنیا میں بلندیاں بھی ہیں اور پستیاں بھی۔ نشیب بھی ہے فراز بھی۔ مشکلات بھی ہیں اور آسانیاں بھی۔

زندگی کا کونسا پہلو ہے جہاں نشیب و فراز بلندی و پستی نہیں۔ حیات انسانی کا کونسا مقام ہے جہاں چڑھاؤ اور اتار نہیں۔ گویا زندگی ایک عظیم الشان پہاڑ ہے جو ایک ہی وقت میں چڑھاؤ اور اتار رکھتا ہے۔ زندگی آزمائشوں مصیبتوں کا چڑھاؤ اور مسرت و انبساط، کامیابی و کامرانی کے اتار رکھتی ہے لیکن اے پہاڑ پر چڑھنے والو! کیا چڑھاؤ بلندی نہیں ہے؟ اور اگر بلندی ہے تو کیا وہاں مشکل کے سوا آسانی تکلیفوں کے بجائے خوشی مل سکتی ہے؟ ہر چڑھاؤ بلندی ہے اور ہر بلندی اپنے اندر امتحان مصیبت اور کلفت رکھتی ہے تو معلوم ہوا کہ جو شخص مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر اور مصیبتوں سے دوچار ہوئے بغیر بلندی چاہتا ہے وہ پاگل ہے۔ کیونکہ چڑھاؤ پر تم کو آسانی کیسے میسر آسکتی ہے۔ کیا پہاڑ کا اتار پستی نہیں ہے؟ اور کیا یہ پستی اپنے اندر آسانیاں نہیں رکھتی تو معلوم ہوا کہ ہر آسانی پستی ہے اور ہر بلندی مشکل پسند بننے پر مل سکتی ہے۔ آسانیوں کا تلاش کرنے والا دوسرے معنوں میں پستی کا طالب ہے اور مشکل پسند دوسرے معنوں میں بلندی اور رفعت کا اہل ہے۔ تم کہوگے زندگی کا مقصد خوشی ہے۔ اور اس کا حصول ضروری ہے اور مسرت کا آستانہ آسانیوں کے ذریعہ ملتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کا مقصد مسرت کا حصول ہے مگر کتنے یہ کہتے ہوئے مرگئے کہ اے مسرت ہمیں تیرا آستانہ نہیں ملتا۔ یہ غلط ہے کہ مسرت کا آستانہ سکون و اطمینان کے بغیر نہیں مل سکتا۔ مسرت و خوشی کسی مقام پر موجود نہیں ہے۔ تم پہاڑ پر اگر شوق سے چڑھتے ہو تو کیا وہ باعث مسرت نہیں ہے؟ اور پھر یہ مسرت کیا پہاڑ کی مشکلات سہے بغیر مل رہی ہے اگر نہیں تو کہنے دو کہ مسرت وخوشی، سکون و اطمینان تیغ امتحان و خنجر آزمائش کی دھار کے نیچے ملتے ہیں مسرت و انبساط بلندی و رفعت کے طلبگارو! مشکل پسند بنو۔ مسرت کا آستانہ مشکلات کی راہ سے گذرنے پر ملتا ہے۔

یہ مجھ سے سن تو رازِ نہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں　　　کہاں کے راہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُرخطر نہیں ہے

قرض کی لعنت

صغرا عبدالسبحان

جب کوئی ایسا شخص جو واقعی نادار و مفلس ہو قرض مانگے تو برا نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کے متعلق ایک ہمدردی سی پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ایسے لوگ جو رہتے تو بڑے ٹھیک ٹھاک سے ہوں۔ گو آمدنی کم ہی سہی پر گھر پہ دو چار ملازم اور ایک سواری اللہ اگر ذاتی نہ ہو تو کرایہ کی موٹر سینما تک کیلئے حاضر۔ ایک ریڈیو دل بہلائی کیلئے

موجود ۔ مہینے میں دو تین سینما دیکھنا فرض ٹھیرا ہاں تو جب یہ لوگ با وجود اس قدر بشان و شوکت کے قرضہ کیلئے دست طلب دراز کرتے ہیں تو واقعی ان سے ایک نفرت سی ہو جاتی ہے ۔ بھلا بتائیے تو سہی اس قدر آن اور بان کی ضرورت ہی کیا؟ جتنی چادر ہو اتنا پیر پھیلاؤ ۔ مشہور مثل ہے ۔ پھر قرضہ لینا بھی شاید ان کی شان میں داخل ہے دیکھا جائے تو زیادہ تر ہم عورتیں ہی قرض کی ذمہ دار ہوتی ہیں ۔ میاں کی آمدنی جتنی ہے اس سے دوگنی قیمت کی ساڑیاں بیوی کے پاس موجود ۔ اور میاں کا یہ حال کہ قرض لینے کی فکر میں سرگرداں ۔ بیٹے کے سہرے کے پھول دیکھنے اور پوتے پوتیاں کھلانے کی آرزو میں بہو لا بٹھایا ۔ دوسرے سال دادی بننے کی آرزو تو پوری ہوگئی مگر خرچ میں اضافہ ہوتا گیا ۔ دولہا میاں ابھی طفل مکتب ہی بنے بیٹھے تھے کہ خیر سے ابا جان بھی کہلانے لگے تعلیم اگر جاری رکھی تو اخراجات بڑھتے نظر آئے ۔ مجبوراً دوسروں کے سامنے دست طلب بڑھانا اور اپنی کہانی سنانی پڑی ۔ گو اب ایسا بہت کم ہوتا ہے مگر اب بھی آپ کو ایسی کافی مثالیں ملیں گی ۔ ہمارے ایجاد کردہ رسومات فیشن کا نت نئے بڑھتے ہوئے اخراجات دیوالہ نکالنے کے لئے کافی ہیں ۔ بچے کی بسم اللہ ، سالگرہ ، روزہ کشائی وغیرہ منانے کی ہمیں ہی تمنا ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ ان تقریبوں پر ہم ایک دوسرے ذریعے سے اپنے اخراجات کی بھرتی کر لیتے ہیں ۔ با الفاظ دیگر مہمانوں کے ٹیکس یعنی تحفے ۔ مگر فرمائیے کہ دعوت کے دھوم دھڑکے بسم اللہ کے اخراجات کس کے سر رہے ؟ اسی طرح شادی کے رسوم جس میں جہیز کی فہرست ایسی ہے جو روز بروز طوالت ہی اختیار کرتی جا رہی ہے (معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ پہلے آپ نے ہی اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے گوش گذار کیا کہ شادی کا مقصد صرف بیوی حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ مال و دولت حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع کوئی اور نہیں جتنا بھی اس کے ذریعہ مل سکے کم ہے ۔ آپ نے ہی اپنی بہوؤں اور اپنی بھاوجوں کو طعنے دے دیکر مردوں کو اس فن میں ماہر کیا ۔ آپ کے منہ سے ہی مردوں نے سنا کہ فلاں کی بیٹی اتنا جہیز لائی ہے اور فلاں کی بیوی کوہ قاف کی پریوں کے مماثل ہے ۔ اس کے بعد کیا ہوا ؟ لڑکے سمجھنے لگے کہ وہ شادی ہی کیا جس سے مال و زر میں کچھ اضافہ نہ ہو ، اور وہ بیوی ہی کیسی جو خوبصورت نہ ہو ۔ اور اب ــــ اب آپ کے لڑکے خود آپ کا کام انجام دینے لگے ۔ اب ان سب باتوں میں ان کو آپ کی مدد کی ضرورت نہ رہی ۔ غور کیجئے کتنا تلخ تجربہ ہے ؟ بہت ممکن ہے کہ آپ میں سے ایسی بھی ہوں جو ان سب باتوں کے خلاف ہوں مگر اب معاملہ آپ کے قابو سے باہر ہے ۔ ہاں تو ہم عورتیں ہی اس کی ذمہ دار ہوئیں کہ مردوں کو قرض لینے پر مجبور کریں ۔ اب صورت حال کچھ اور ہے اور اس کو بتلانے کے لئے کوئی دوسرا موضوع ہوگا اس لئے آئیے پھر اس طرف متوجہ ہوں کہ ہم کیا کر سکتی ہیں جس سے ہمارے

سروں سے یہ الزام دور ہو سکے۔ اس کی دو چار صورتیں ہیں۔ مثلاً
(۱) کسی طرح کے رسوم انجام نہ دینے کا عہد کرنا۔ (۲) اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی شادی کے وقت جہیز کا مطالبہ نہ کرنا بلکہ یہ دلہن کے والدین کی مرضی پر چھوڑ دینا اور اسی طرح شادی کے بعد اس میں کسی طرح کی نی نہ نکالنا (۳) اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو ہر ممکن طریقے سے یقین دلانا کہ شادی کے ذریعہ بیوی حاصل کی جاتی ہے مال۔ دولت نہیں (۴) میاں کی آمدنی سے خرچ کو ایک پیسہ بھی نہیں بڑھانا بلکہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرنا۔
جب آپ اپنے اخراجات گھٹائیں گی تو میاں کو بھی اس کا خیال ہوگا۔ یہ دوسری صورت ہے کہ وہ حد سے زیادہ فضول خرچ ہوں اور ان کے اخراجات گھٹانا آپ کے اختیار سے باہر ہو۔ ایسی حالت میں آپ مجبور ہونگی اور میاں اپنے بچنے کے لئے مجبور ہوں گے کہ قرضے کی لعنت محض ان کی ذات ہی ہے۔

(گذشتہ مہینہ میں یہ بہت بڑی بھول رہی کہ محترمہ صغرا عبد السبحان کا شکریہ ادا نہ کیا گیا حالانکہ ابتدائے شہاب سے آپ کی جتنی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں شاید ہی کسی اور کی ہوں پھر لطف یہ کہ اظہار تشکر کو آپ پسند نہیں کرتیں لیکن ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔) مرتب

فیشن پرستی اور پردہ

رافعہ جمیلۃ النسا بنت یزدانی (ہنگولی)

اسلامی خواتین کی اصلاح کے لئے بیسیوں پرچوں میں لاتعداد مضامین شائع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مگر کیا کسی نے سُنا۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ مغربی فیشن پہلے بڑے بڑے گھرانوں کی عورتوں نے قبول کیا۔ پھر انھیں کے نقش قدم پر ہر کس و ناکس چلنے لگا۔ ایک لباس ہی کو لیجئے۔ پہلے زمانہ میں گھٹنوں سے نیچے خوب ڈھیلے ڈھالے کرتے پہنے جاتے تھے لیکن فیشن پرستی اور اندھی تقلید کی بدولت اون میں کمی آتی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد کرتے کی جگہ قمیص نے لے لی۔ اوّل اوّل تو قمیص پوری آستین کے پہنے جاتے تھے لیکن فیشن کی تنگ نظری سے قمیصوں کی درازدستی دیکھی نہ گئی اور کہنیوں تک اوس کے ہاتھ کاٹ لئے۔ رفتہ رفتہ فیشن نے کرتے اور بنڈے قمیص دونوں کو خیرباد کہکر اون کی جگہ جمپر کو لا کھڑا کیا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا کرتے۔ قمیص اور جمپر سے ستر پوشی تو تھی جو باعث زینت بھی تھی۔ مگر خدا سمجھے اس فیشن کو کہ اس نے اس پر بس نہ کرکے اور پیر پھیلائے اور شریف بیبیوں کے لئے نیم عریانی

کی صورت اختیار کی یعنی بیبیوں کے جسم سے ان سب کو اتار پھینکا اور ان کی جگہ بلوز استعمال کرنے لگا جس میں اوپر کے حصہ کی خوشنمائی قایم رہی نہ اصل جسم کی ستر پوشی۔ بلوز کے لئے اگر یہ کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے کہ اس نے باوجود اپنی بیدست و پائی کے کرتا۔ قمیص اور جمپر کو نیچا دکھایا۔ اور خود سینہ پر مونگ دلنے لگا۔ شریف بیبیوں کو اگرچہ شانوں تک ہاتھوں کا کھلا رکھنا اچھا معلوم نہ ہوا مگر کیا کرتیں فیشن سے مجبور تھیں۔ اسی کو سینہ سے لگایا بس پھر کیا تھا فیشن نے شریف بیبیوں کے کانوں میں پھونک دیا کہ ہاتھوں کی عریانی اور گلے اور گریبان کی نیم عریانی ہی باعث زینت اور موجب ازدیاد حسن ہے۔

رفتہ رفتہ بیبیاں جمپر کی طرح بلوز سے بھی مانوس ہوگئیں، اور ایسی مانوس ہوئیں کہ بس ہر محفل میں اوسی کی نمائش ہونے لگی اور اوسی کی تعریف کے گیت گانے لگیں۔ بھلا اس قلب ذہنیت کا کیا ٹھکانا جہاں عریانی بھی باعث صد زینت ہو۔ عربی کی مثل تو تھی ''اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ'' انسان کی زیبائش لباس سے ہے۔ مگر فیشن نے انسان کی کایا پلٹ دی۔ دیکھی آپ نے فیشن کی کرامت۔

فیشن نے خدائی احکام کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ خدائی احکام تو یہ تھے کہ عورت کا کل جسم عورت ہے یعنی ہر حصہ چھپانے کے قابل ہے مگر فیشن پرست بیبیوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ یَاللعَجَبْ۔ اسی طرح ساری پہننا ہندؤں اور پارسیوں کے لئے مخصوص تھا اور مسلمانوں میں معیوب۔ مگر اب کیا ہے۔ جس گھر میں دیکھئے ساری کا جلوہ نظر آئیگا اور قابل فخر سمجھا جائے گا۔

ساری کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز جاتا رہا۔ اگر کسی جلسہ یا پارٹی میں چند مستورات ساری میں ملبوس نظر آئیں تو ان میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق کرنا دشوار ہوگا۔ اور اگر سب کا لباس مختلف ہو تو فوراً ہندو مسلم۔ عیسائی کا پتہ چل جائے گا۔ اس بات کی تصدیق کے لئے ذیل کا ایک واقعہ پیش کرتی ہوں جو مجھے ایک دن لیڈی ہارڈنگ ہسپتال دہلی میں پیش آیا۔ ایک دن ہم چند عورتیں مل کر ہسپتال گئے۔ وہاں دہلی کی تمام عورتیں دوپٹہ اور شلوار پہنے تھیں۔ اتنے میں ایک نوجوان مسلمان لڑکی ساری پہن کر آئی۔ سب مسلمان عورتیں یہ سمجھیں کہ یہ شاید ہندو ہے اس لئے وہ سب اوس سے کھچی کھچی رہیں۔ مگر اوس لڑکی نے دانستہ یا نادانستہ ہم سب سے بہت بے تکلفی اور اسلامی تہذیب و شائستگی سے باتیں کیں جس سے ہم کو اوس کا مسلمان ہونا معلوم ہوا پھر ہم نے اوس سے اپنی کشیدگی کی وجہ کہدی اس پر وہ بیچاری شرمائی اور معافی چاہی جس سے ہم سب بھی خفیف ہوئے۔

اسی طرح پردہ کا حال ہے۔ ہماری بہنیں کہیں تفریح کو یا سینما جاتی ہیں تو برقع کو ضروری نہیں سمجھتیں ٹھیر کردار

ساریاں پہنتی ہیں اور چمن اور باغوں میں گلگشت کرتی پھرتی رہتی ہیں۔ ادہر مرد تاک جھانک سے نہیں چوکتے۔ مگر ہم مردوں کو کیا کہیں۔ خود پردہ نہ کرنا اور ہر جگہ آزادی سے پھرنا مردوں کو دعوت نظارہ دینا ہے اور جو برقع پہنتی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ ان کا برقع خوشرنگ اور خوبصورت ہو۔ یہ مرض وبا کی طرح مسلمان بہنوں میں پھیل رہا ہے برقع پردہ کے لئے ہوتا ہے۔ اسلئے برقع ایسا ہونا چاہیئے جس سے پورا جسم ڈھک جائے۔ یعنی پہنے کا پٹی کوٹ والا یعنی اوپر کا ہاف حصہ۔ اور نچلا حصہ پیٹی کوٹ ذرا زیادہ گھوم دار ہونا چاہیئے۔ اگر کسی کو رنگین پسند ہو تو خاکی یا سرمئی وغیرہ غیر شوخ بنالیں۔ ستم یہ ہے کہ بعض بہنیں شوخ رنگ کا استعمال کرتی ہیں اور لطف یہ کہ برقع پر کشیدہ کاری کا بہترین کام کیا ہوتا ہے جو خواہ مخواہ جاذب نظر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فیشن کا برقع اونچا ہوتا ہے کہ سینڈل یا جوتا بالکل باہر نظر آتا ہے۔ دوسرے برقع کے نیچے سے خوبصورت ساری کی خوشنما بارڈر صاف طور پر دکھائی دیجائے۔ برقع ایسا ہونا چاہیئے جس پر ہر کس وناکس کی نظر نہ پڑے۔ اس لئے اسلامی بہنوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے انوکھے اور شاندار اور شوخ رنگ برقع نہ پہنیں۔ اس کا رواج جب ہی ہوسکتا ہے کہ جب متمول گھرانے کی عورتیں سادگی اختیار کریں اور سادہ برقع استعمال کریں۔ چونکہ مضمون طویل ہوگیا ہے اسلئے اب بھی بہت سی باتیں ترک کرنا پڑیں

بتقریب کتخدائی ناز اصغر بلگرامی

وحیدہ نسیم

مبارک ہوں اے ناز رنگیں فضائیں
مسرت فضا چھارہی ہیں گھٹائیں

کھلے دونوں جانب سے گل آرزو کے
صبا نے بھریں جھولیاں رنگ و بو سے

نرالا ہے کچھ آج انداز ہستی!
بجا ہے نئے طرز سے ساز ہستی!

مبارک کہ آیا بصد شادمانی
نئے دور میں ساغر زندگانی

وہ ہیں دُرّ اعجاز یہ دُرِّ اصغر
گندھے ایک رشتہ میں دونوں ہیں آکر

زمین پر ہیں غنچے فلک پر ستارے
یہ ہنس ہنس کے کرتے ہیں تم کو اشارے

مبارک تمھیں ناز الفت کسی کی!
مبارک ہو تم کو رفاقت کسی کی

گلوں کی طرح مسکراتی رہو تم ترانے مسرت کے گاتی رہو تم
سخن آج غنچوں کے لب پر ہے جاری چلی باغ حیدر میں باد بہاری
جہاں میں سدا خرم و شاد رہنا مسرت کے سایئے میں آباد رہنا
نسیم اپنے لب پر بھی ہیں یہ ترانے
مبارک مسرت کے ہوں شادیانے

افسانوی خط

رشید فاطمہ

شہناز - آخر تم نے روحی کی گذشتہ زندگی کے متعلق دریافت کرہی لیا - ابتک میں اس کی پرحسرت داستان حیات کو نوک قلم پر لانے سے گریز کرتی رہی محض اس خیال سے کہ خواہ مخواہ اس کی داستان غم سُنا کر تمھاری دنیائے مسرت کو کیوں کر آہوں سے معمور کروں - مگر میں یہ دیکھتی ہوں کہ تم اسی پر مصر ہو اور مجھ سے وہ کچھ لکھوانا چاہتی ہو جو اس گھڑی تک میرے دل کی انتہاہ گہرائیوں میں پوشیدہ رہا ہے - جیسے تمھارے سامنے بیان کرتے ہوئے اس وقت بھی گھبراہٹ محسوس کر رہی ہوں مگر جب تمھارے متواتر خطوط کی آمد اور تمھارا اصرار حد سے تجاوز کر گیا تو مجبور ہو گئی - تم سن کر کیا کرو گی - یہ سچ ہے کہ تم اور وہ بہت گہرے دوست تھے اور ہم جماعت بھی - باوجود اس کے روحی کو اتنی فرصت زمانے نے نہ دی کہ وہ تم کو اپنے وہ واقعات (جس سے ایک افسانہ بن سکتا ہے) بتائے - وہ زمانہ کی بندشوں میں جکڑ دی گئی - آخرکار تم اپنی ہی ضد پوری کر کے رہیں - لو اب سنو -

اس زمانہ کو یاد کرو - جب تم اور روحی دلی دوست تھے - اسکول کی ساری لڑکیاں رشک آمیز نگاہوں سے تم دونوں کو دیکھا کرتیں - تم دونوں اسی میں مگن دنیا سے بے پروا الگ اپنی ننھی منی دنیا بسا رکھی تھی - روحی سے بڑھکر زندہ دل لڑکی اسکول بھر میں نہ تھی - اس کا وہ شائستہ مذاق دلچسپ گفتگو ہر اجنبی کا دل موہ لیتی تھی ہر وقت افسانوی باتیں اس کا خاص شغل رہتا اور کتابوں سے تو اس کو ایک خاص اُنس تھا - وہ جب کتابوں کا مطالعہ کرتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا میں غرق ہو گئی ہے - (باقی)

محمودیہ پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ سے شائع ہوا۔

شہاب

جلد ۱۱ بہمن سنہ ۱۳۵۲ ف م ڈسمبر سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۳

(مراقبہ)

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (عہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

غزل

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

آج ساقی سے کہوں گا یہی میخانے میں
جتنی بوتل میں ہے بھر دے مرے پیمانے میں

کیا بلائیں اسے اے قلب حزیں جانے دے
کہیں ڈر جائے نہ آکر مرے غم خانے میں

میرے ہمراہ رہی گرمیٔ رفتار تری
نظر آئے شجر سوختہ ویرانے میں

گوشہ گیری سے تخیل کو ملا کب آرام
کبھی کعبے میں کبھی پہنچے صنم خانے میں

مٹ گئیں خواہشیں لیکن نہ مٹا حسن طلب
جذب ہوتی ہے مرے نام کی پیمانے میں

کب وہ سنتے ہیں مری رام کہانی مجھ سے
لطف آتا ہے انہیں غیر کے افسانے میں

شعلہ حسن جہاں تاب کا اعجاز ہے یہ
ورنہ کب شوخیٔ پرواز تھی پروانے میں

ناز پرکاریٔ آزر کی حقیقت کھلتی
کاش ہوتی تری تصویر صنم خانے میں

حسن کی عشوہ گری عشق کا افسونِ نیاز
یہی دو باب نئے ہیں مرے افسانے میں

اضطرابِ دلِ پُرخون کا نہ پوچھو احوال
برق اک کوند رہی ہے مرے پیمانے میں

کس سے امید کریں خلق و مروت کی عزیزؔ
خوئے اسلاف یگانے میں نہ بیگانے میں

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری پر ایک طائرانہ نظر

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

اب یہ سب کو معلوم ہے کہ گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار سلطان محمد قلی جس نے ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک گولکنڈہ میں حکمرانی کا ڈنکا بجایا، اردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اس کو خوش قسمتی سے جنگ و جدل سے تقریباً فرصت مل گئی اور اطمینان و فارغ البالی سے امن و امان کے ساتھ بتیس برس حکمرانی کرنے کا موقع ملا۔

وہ علم دوست، علم پرور، علماء پرور، علماء و فضلا کا قدر دان تھا، اصحاب علم و فکر اور اہل کمال اس کے عہد میں فکر معاش سے مستغنی ہو کر علم کی خدمت میں مصروف و منہمک رہے، وہ شعر و سخن کا دلدادہ، شعرا اور ادیبوں کا سرپرست تھا، اس کا دربار باکمالوں سے بھرا ہوا رہتا تھا اس کے زمانہ میں دکنی شاعری کو بڑا عروج ہوا بیسیوں شاعروں نے ملک سخن میں نام آوری حاصل کی اور داد سخنوری دی، وہ خود زبردست شاعر تھا، اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سلطان نے دکنی زبان میں پچاس ہزار شعر کہے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک بڑا حصہ اس وقت تلف ہو چکا ہے۔

حال میں نواب سالار جنگ بہادر (حیدر آباد) کی سرپرستی میں سلطان کا دکنی کلیات شائع ہوا ہے، اگرچہ اس کلیات میں اصناف سخن سے قصیدے، مرثیے، غزلیں، رباعیات اور نظمیں سب کچھ موجود ہیں، لیکن کوئی مثنوی (بجز ایک چند شعر کی مثنوی کے) نہیں ہے، حالانکہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے طویل مثنویاں بھی لکھیں تھیں۔ سلطان کا مکمل کلیات جو کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں موجود تھا اور اب خاص اعلیٰحضرت حضور نظام کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس میں مثنویوں کے علاوہ بہت سارا ایسا کلام تھا جو شائع شدہ کلیات میں نہیں یا نامکمل ہے، لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر زور نے جو مذکورہ بالا کلیات شائع کیا ہے قابل قدر اور لائق ستائش ہے اس موقع پر ہم کلیات مذکور سے استفادہ کر کے سلطان کی نظموں کے متعلق کچھ صراحت کرتے ہیں، امید ہے کہ موجب دلچسپی ہوگا۔

منظر نگاری جدید اردو شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ قدیم اردو شاعری میں اس موضوع پر نظمیں نہیں ملتیں، البتہ انیس اور دبیر نے اپنے مرثیوں میں جستہ جستہ اس عنوان پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ منظر نگاری کا عنوان نہایت وسیع ہے۔ اس میں مختلف امور پر خیال کیا جا سکتا ہے، مثلاً وقت، موسم، مقام، صبح و شام، بہار، بارش، دھوپ، بسنت، آفتاب، چاند، ستارے، دریا، سمندر، پہاڑ، جنگل، باغ، قصر و ایوان، تیتری، کویل، اشنان، تیرتھ، دیوالی، عید، سالگرہ، غرض منظر نگاری کا عنوان اتنا وسیع اور بے پایاں ہے کہ اس میں کئی

ہر شئی داخل ہو سکتی ہے۔

سلطان محمد قلی کے کلیات میں منظر نگاری کے متعلق جو نظمیں ملتی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

عید کے عنوان پر سلطان کے قصیدوں کے علاوہ (۶۳) نظمیں ہیں یہ نظمیں کسی ایک یا دو عیدوں سے متعلق نہیں بلکہ عید رمضان، بقرعید، عید میلاد نبیؐ۔ عید بعثت نبیؐ۔ عید مولود علیؑ۔ عید غدیر، عید سوری، اور شب برات وغیرہ پر لکھی گئی ہیں۔

عید کی طرح سلطان نے نوروز اور بسنت پر بھی کئی ایک نظموں میں اظہار خیال کیا ہے، اس کی ایسی نظموں کی تعداد چودہ ہے، سالگرہ کے متعلق سلطان نے دس نظمیں لکھی ہیں، شادی، بیاہ اور اس کے رسوم کے متعلق آٹھ نظمیں ہیں، شاہی لوازمات پر اس نے چھ نظمیں لکھی ہیں کھیل کے عنوان پر اس کی تین نظمیں ملتی ہیں، ایک چوگان کے متعلق ہے، دوسری کبڈی پر لکھی گئی ہے اور تیسری پھوکڑی پر ہے جو زنانہ کھیل ہے۔ برسات اور مرگ پر سلطان نے سولہ نظمیں کہی ہیں، خدا داد محل، سجن محل، حیدر محل اعلیٰ محل، محل کوہ طور اور قطب مندر پر اس نے اپنی نظموں میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس طرح ایکسو چھبیس (۱۲۶) نظموں میں سلطان نے منظر نگاری کی ہے۔ اس موقع پر ان تمام نظموں کے متعلق صراحت طوالت کا موجب ہے اس لئے صرف موسم بارش اور بسنت کی نظموں کے متعلق کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔

رُباعی

ساقی اک جام ارغوانی ساقی
پانی انگور کا پاک پانی ساقی
دنیا میں ملے تو زندگانی سمجھوں
جنت میں ملے تو نوجوانی ساقی

شہید یار جنگ۔

قبل اس کے ہم ان نظموں کے متعلق صراحت کریں اولاً یہ بھی واضح رہے کہ سلطان محمد قلی فطرتی طور پر رند اور شاہد باز تھا، وہ ہمیشہ نغمہ و طرب کا قدردان اور شاہد و ساقی پسند، عیش و عشرت میں مشغول رہا کیا، ساقیان مہوش گلبدن حرموں کے ساتھ اس کی زندگی کے دن بسر ہوئے۔ اپنے بچپن سے لے کر مرنے تک رند اور شاہد باز بنا رہا، اس کے قصر اور ایوان خوبصورتی کی نمائش گاہیں تھیں۔ جن میں ہر ملک اور ہر مذہب کی پری وش اور حور تمثال مہ جبین جمع تھیں، اس ماحول کا یہ نتیجہ تھا کہ سلطان کی کوئی نظم خواہ وہ کسی عنوان پر ہو حسن و عشق کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ صرف غزلوں میں ہی اپنی معشوقوں کے غمزہ و کرشمہ، ناز و انداز کا تذکرہ نہیں کرتا

بلکہ نظموں میں بھی ان کے تذکرہ کئے بغیر اس کو چین نہیں ملتا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سلطان نے پچاس ہزار شعر دکنی میں موزوں کئے تھے، اور کوئی صنف سخن ایسا نہیں تھا جس پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو، عاشقانہ مضامین کے ساتھ ساتھ عارفانہ نکات، شاہی لوازمات اور دربار کی شان و شوکت اور طمطراق کے ساتھ محلات کی رنگینیاں، باغوں کی سرسبزی اور شادابی بھی اس کے قلم کی جولان گاہ بنی ہے، غرض ایسے ایسے موضوع پر اس نے قلم اٹھایا ہے، جس پر عام شاعروں کی نظر نہیں پڑتی، وہ اپنے کلام میں ایسی پتہ پتہ کی باتیں لکھ جاتا ہے کہ پڑھنے والے حیران رہ جائیں، اور حیرت ہوتی ہے کہ ایسے گہرے مشاہدات ایک بادشاہ سے کیونکر ممکن تھے، اس کے کلام میں اس وقت کی ایسی ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے ہماری تاریخیں خالی ہیں، کیونکہ ہمارے مورخ زیادہ تر شاہانہ جاہ و جلال اور کر و فر قلمبند کرنے کے عادی تھے، وہ درباری رعب داب، اور شاہی تزک و احتشام اور شاہانہ طمطراق کے باتوں پر اکتفا کرتے تھے، اس وقت کے معاشرتی حالات اور بادشاہ کی خانگی زندگی کے متعلق تاریخ کے صفحات کوئی مواد پیش نہیں کرتے، مگر سلطان محمد قلی نے خود اپنی زبان سے اس وقت کی بہت ساری باتیں محفوظ کردی ہیں، اس نے اپنی گھریلو زندگی اور جذباتی امور کا دل کھول کر بیان کیا ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں لکھا گیا ہے کہ سلطان کی مثنویاں اس وقت دست رس سے باہر ہیں، جو نظمیں ملی ہیں، ان میں موسم بارش اور بسنت کے متعلق (۲۳) نظمیں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم بارش کے آغاز یا مرگ کے دن سلطان بہت دھوم دھام سے ایک جشن کرتا تھا، شراب کے دور چلتے تھے، مطربان خوش نوا نغمہ طرازی کرتے، رقص سرود کے کمالات دکھائے جاتے، باغوں میں جھولے ڈالے جاتے۔ شاہی بیگمات بیر بہوٹی کے رنگ کے سرخ کپڑے زیب تن کرتے، مشک، زعفران، عبیر مل کر حسینان جہان جھولوں میں جھلا جھولتیں، شاہی قصر و ایوان میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھادی جاتی۔ غرض یہ تمام امور کسی تاریخ سے ہم کو معلوم نہیں ہوتے، بلکہ سلطان کی نظموں سے ان کی وضاحت ہوتی ہے۔

اسی طرح بسنت کے موقع پر قصر و ایوان اور باغوں میں پھولوں کے انبار جمع کردئے جاتے، حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا، اور دل کھول کر رنگ کھیلا جاتا، وہ بسنت کی آمد پر پھولوں نہیں سماتا اور پھر ان نظموں میں شہوانی جذبات کو جس طرح عریاں پیش کیا ہے وہ خاص اُسی کا حصہ ہے، وہ اپنے آپ کو ہر جگہ رند شاہد باز ظاہر کرتا ہے

یہ بسنت اور مرگ کی نظمیں بے ساختگی اور رنگینی میں اپنی آپ نظیر ہیں، وہ جس طرح عریاں اپنی زندگی کو پیش کیا ہے وہ کسی اور شاعر کی بس کی بات نہیں، اور نہ کوئی مورخ ایسی باتیں تاریخ کے صفحات پر پیش کر سکتا ہے۔

سلطان کی تشبیہیں اور استعارے لاجواب ہیں، اس نے ایسی ایسی تشبیہیں دی ہیں جو خاص اسی کا حصہ ہو کر رہ گئی ہیں، اس کی نظموں کو پڑھنے سے اس وقت کا سماں سامنے آجاتا ہے، اور اس وقت کی ایک تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے، وہ اپنے جذباتی نظموں اور عاشقانہ خیالات میں بھی رسولؐ کی مدح اور علیؑ کی ستائش کئے جاتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مزید صراحت کے بجائے چند نظموں کا خلاصہ پیش کیا جائے جس سے سلطان کی شاعری اور خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے اس کے تخیل کی پرواز خیالات کی وسعت اور جولانی، جذبات کی روانی اور فراوانی کا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بارش - ۱-} بارش کا موسم آیا، اور کلیوں کا راج شروع ہو گیا۔ کیونکہ اب ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔

مینھ کی بوندوں کا پیالہ ہاتھ میں لے لو، کیونکہ ہر مہ جبین بڑھ چڑھ کر سج دھج کر رہی ہے جسم ٹھنڈ کی وجہ سے لرز رہے ہیں اور جوبن کپکپا رہے ہیں، پیا کا چہرہ دیکھتے ہی چولی خود بخود پھٹی جا رہی ہے۔

نازنین کا چہرہ بجلی کی طرح چمکنے لگا۔ جب وہ شرم کے مارے آنچل اٹھا کر پھر چہرے پر ڈالنے لگی، اس کے بالوں میں پھول ایسے نظر آنے لگے جیسے آسمان پر تارے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عہد کی پدمنی ہے۔

چاروں طرف گرج کی آواز سنائی دیتی ہے اور مینھ برستا ہے، عشق کے ترانوں سے موروں نے چمنوں کو معمور کر دیا۔

اے قطب شاہ حضرت مصطفیٰؐ کے صدقے سے برسات آئی ہے، اس دن عشق اور عاشقی کے ساتھ حکومت کرو۔

۲ - مرگ کے بادل گرج رہے ہیں، اے سکھیو آؤ اور سنگار کرو، بارش کے قطرے آہستہ آہستہ گرنے لگے، تم اپنی اپنی چولی جھکالو، تاکہ تمھارے جوبن کی بہار نظر آئے۔

عطار نے ہواؤں کے جنگل میں پھولوں کے طبل کھول کر خوشبو کی مہکار اٹھا دی ہے۔ اس لئے تم پھر میرے دل میں چلے آؤ۔

جس طرح ڈالیوں پر سرخ پھول نکل آئے ہیں اسی طرح تم اپنے بازوؤں پر بازو بند کے پھندلوں کی بہار دکھاؤ۔

بادلوں کی وجہ سے آسمان اور زمین کا ایک رنگ ہو جانا بڑا اچھا منظر دکھائی دے رہا ہے، آج عیش کا دن ہے اس لئے اے سکھیو ملہار گاؤ۔ تم سب سر سے پاؤں تک پر تکلف اور چمکدار سرخ لباس پہن لو، جس طرح سورج شفق میں چمکتا ہے اسی طرح اے سکھیو تم میں سے ہر ایک چمکے۔

ہونٹوں کی یاقوتی پیالیوں سے شراب محبت بھر کے نئے بادشاہ محمدؐ کو بھی پلاؤ، ناچنے والیوں کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں سے شراب پلا کر مست بنا دو تاکہ وہ شاہی مندر کے صحن میں نٹوں کی طرح ناچنے لگیں۔

(۳) مرگ کے بادلوں کو گرجتا ہوا دیکھ کر دوشیزائیں چاروں طرف سے آئیں اور نوجوں کی طرح ایک جگہ جمع ہو گئیں اور اپنے زرق برق لباس سے زمین پر بجلیاں چمکانے لگیں۔

ان نئی نئی اور شوخ دوشیزاؤں نے اپنی چولیاں پانی کی بوندوں سے بھگالی ہیں، اور جھولوں میں بیٹھ کر جھول رہی ہیں۔

شراب عشق کے پیالوں، غمزہ کرنے والی آنکھوں کی چالوں اور جوانی کے ترنگوں سے مست ہو کر یہ دوشیزائیں آپس میں عیش منا رہی ہیں۔

ان چھبیلی تیلیوں جیسی دوشیزاؤں کے جوبن چولیوں کے بند سے آزاد ہو کر نکل پڑے ہیں، ان کے جسم سے شراب عشق اُبل رہی ہے، اور وہ اپنی آنکھوں سے فریفتہ بنا رہی ہیں۔

اپنے زرق برق لباس کی وجہ سے ہر لمحہ جگمگا رہی ہیں، رہ رہ کر بادشاہ کے گلے لگ رہی ہیں، اور چال میں ایسی ڈگمگا رہی ہیں جیسی کہ باولی لڑکیاں ہیں۔

ایک سے زیادہ دوسری چمک دمک دکھاتی ہیں جس کو دیکھ کر دنیا کے بڑے بڑے سیانے راہ بھٹک جائیں جب یہ چلبلی لڑکیاں مست خرام ہوتی ہیں تو ڈھلے ہوئے موتی بھی ان کو دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

نبیؐ کے صدقہ میں یہ پاک وصاف دوشیزائیں ناز و انداز کے ساتھ رات دن قطب شاہ کے ساتھ رہتی ہیں، اور اپنا من بھاتا سکھ حاصل کرتی ہیں۔

(۴) آسمان پر فرشتوں نے مرگ کے مہینے کو دعوت دی، اور اس خوشی میں سمندر کے موتیوں کو آسمان سے برسایا جن سے ہمارے صحن بھر گئے۔

زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھ لی اور آنگ میں کانچ کے رنگ کی چولی پہن لی، اور لعل یمن جیسی بیر بہوٹیاں تمام ملکوں میں نکل آئیں۔

ہر طرف ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں اور رنگ برنگ کے پرندے چمنوں میں مست ہو کر نغمے گا رہے ہیں۔

ہر جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کی لگنوں میں شبنمی تیل سے شمعیں جل رہی ہیں۔

اس تازگی اور طراوت کو دیکھکر موہنیاں اپنے خوش رنگ جسموں پر رنگ برنگ کے لباس پہنی، اپنے جوبن کی بہار دکھاتی ہوئی ناز و انداز کے ساتھ محوخرام ہیں۔

ان کے آب حیات جیسے صاف و شفاف پستانوں کے ساتھ سیاہ سرپستان ظلمات کی طرح لگی ہوئی ہیں، یا جو بن کے پاک وصاف آسمانوں پر دو کالے کالے بادل چڑھ آئے ہیں۔

ہوا کا نظارہ کرنے کے لئے مست سہلیوں نے شراب پی لی ہے، اور چنبیلی کے پھولوں میں بھنورے ملہار کے گیت گاتے پھر رہے ہیں، یہ مشک جیسے سیاہ بھنورے نہیں ہیں۔ جو پھولوں کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں، بلکہ چنبیلی جیسی نرمل ٹھوڑیوں کی کالی کالی تلیں ہیں۔

زرینے کے لباس میں سکھیاں سر سے پاؤں تک رزق برق نظر آرہی ہیں، اور ان کے گھنگروؤں اور پیجنوں نے میرے دل کو لبھاکر بجلی کی طرح بے تاب بنا دیا ہے۔

اب بسنت کے متعلق دو نظموں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اے پیارے! آؤ عشق کی بسنت کھیلیں، کیونکہ تم چاند ہو، اور میں تارا ہوں، میرا جسم خالص کندن کی طرح چمک رہا ہے اور میں سنگار کرکے اور ہر طرح کے چھند بند کے ساتھ تیار ہوں۔

ہم اور ہمارا ساجن اس طرح بسنت کا رنگ کھیلیں جیسے آسمان شفق کی وجہ سے رنگا رنگ ہوجاتا ہو۔ شفق کے رنگ کے پیچھے سے جس طرح تارے چمکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا سورج کی کرنوں جیسے زرکتاروں سے بنا ہوا لباس جھلکنے لگا۔

پیاری بسنت کو پیا کے قدموں سے مل کرلے آئی، اور کچھ اس طرح بسنت کھیلی کہ رنگ رنگ کو سنگار کا حال ہوگیا۔

اپنے جوبن کے حوض خانوں میں عشق کا رنگ بھر کر جسم کے رویش رویش میں بجلی کی رو دوڑا دیتی ہے۔

رنگ سے بھیگی ہوئی چولی میں سرپستاں رات کی نشانی بن کر سیاہ نظر آتی ہے اور اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ سورج (جیسے پستان) کے بیچ میں رات کو کیسی جگہ مل گئی۔

بسنتی رنگ کے جسموں اور کندنی گالوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیسر کی آگ کی بہار پھل پھول رہی ہے۔

نبیؐ کے صدقہ میں قطب شاہ نے ایسی دھوم دھام کی بسنت کھیلی کہ تینوں عالم رنگیلے ہو رہے ہیں۔

۲۔ بسنت بکر ہیک ساتھ مل کر عشرت کے پھولاں کی جھانٹ آیا، اور بسنت کا بکر ہیک ساتھ آ میری تمام

تمام رنگ بھری سہیلیوں کے دل کو بہت بھایا۔
اس کی خوشبو کی مہکاہٹ سے اس جگ میں بہار آگئی، بسنت اور بکرید کی وجہ سے عیش کے پھول باغ عالم میں چھا گئے۔
تمام جنگل آسمان کی طرح سبز ہو گئے جن پر ستاروں کی مانند پھول کھلنے لگے بسنت نے بکرید کے ساتھ زہرا کو
مجبور کر دیا کہ وہ منگل کے ساز پر گائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھلتی ہوئی کلیوں کے نازک ہونٹ کچھ بھید بیان کرنے
کیلئے ہل رہے ہیں، کیونکہ بسنت بکرید کے ساتھ اس لئے آیا ہے کہ دونوں مل کر بادشاہ کی تعریف بیان کریں۔
جب بادشاہ خوبصورت سکھیوں کے چہروں پر رنگ ملتا یا ڈالتا ہے تو ان کی آنکھوں کی تلیں ایسی جھلکتی
نظر آتی ہیں جیسے سورج نے رات میں ستاروں پر اپنی کرنیں ڈالی ہوں۔
ہماری بزم میں عشرت کے بادل اور آب حیات کی پھوار یا جھڑی برسنے لگتی ہے کیونکہ بسنت نے بکرید کے ساتھ
آکر میرے دل کے چمن میں سکھ کی آنپلیں اگائی ہیں۔
بسنت اور بکرید دونوں حضرت نبیؐ کی نظر کرم کی وجہ سے ایک جگہ مل کر آئے ہیں اور قطب زماں آنند اور سکھ
پا رہا ہے۔

کیفِ رنگیں

جناب تراب علی خاں صاحب باز (حیدرآبادی)

دل میں میرے جاناں کی تصویر نظر آئی
بنیادِ محبت کی تعمیر نظر آئی

ہم سات طبق ڈھونڈے ہم سات طبق چھانے
مٹی ہی ترے در کی اکسیر نظر آئی

پھر جوشِ جنوں اٹھا پھر ہو گئے دیوانے
پھر خواب میں مجنوں کی تصویر نظر آئی

پروانہ کا جلنا کیا پروانہ کا مرنا کیا
کیوں شمع مگر ہم کو دلگیر نظر آئی

پھر دستِ نگاریں سے اُس نے مجھے خط لکھا
پھر آج مقدر کی تحریر نظر آئی

پھر کاکلِ پیچاں میں دل اپنا نظر آیا
پھر خواب میں لوہے کی زنجیر نظر آئی

روتے ہوئے بستر سے کیوں باز اُٹھے ہیں آپ
کیا خوابِ عدو کی پھر تعبیر نظر آئی

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

نظم مندرجہ ذیل بیسویں صدی کے ایک ذی علم فاضل شاعر کی تصنیف ہے۔ حیدرآباد کے کسی ادبی رسالہ میں عرصہ ہوا تحت عنوان "بیسویں صدی" شائع ہو چکی۔ اس کو پڑھ کر میرے دل و دماغ میں شکوک و شبہات کا جو غلبہ ہوا اوس کے اظہار میں الفاظ قاصر ہیں۔ حیران ہوں اس کو اپنی کج فہمی سمجھوں یا مصنف کی غلطی۔ اس نظم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ تشبیہات بکثرت استعمال کئے گئے ہیں مگر اس بات کا بہت ہی کم لحاظ رکھا گیا کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں حسی۔ عقلی۔ اضافی۔ یا اعتباری کسی قسم سے بھی وجہ مشبہ کی گنجائش پائی جاتی ہے یا نہیں علیٰ ہذا مجاز و استعارہ سے تو لزوم و سببیت اور علاقہ تشبیہہ پر مطلق توجہ نہیں فرمائی گئی کنایہ سے تو جواز معنی ملزوم کا قرینہ نہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاعری ایک نہایت نازک اور اہم فن ہے۔ شعر کی تعریف میں علمائے مشرق نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں مگر ایک بنیادی اصول مشرق و مغرب میں مشترک پایا جاتا ہے علمائے مشرق فرماتے ہیں الشعر کلام ینقبض بہ النفس و ینبسط علمائے مغرب کہتے ہیں اعلیٰ تخلیات نفسی جذبات اور حسیات کو اس حسن و خوبی سے نظم کرنا جو دل اور کانوں کو اپیل کرے وہ شعر ہے۔ ظاہر ہے کہ تخیل اور حسن بیان ہی سے نفس انسانی میں انقباض و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس معیار پر زیر نظر نظم کی جانچ اور میرے شکوک و شبہات کی صحت و سقم کا اندازہ ارباب بصیرت فرمائینگے میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا شعر کے معنی و مطلب پر چنداں غور نہیں کرتا کیونکہ وہ لاحاصل ہے سرسری نظر میں جو شبہات پیدا ہو رہے ہیں انہیں پر بحث کروں گا۔

شوخ۔ چنچل۔ بے ادب۔ گستاخ۔ تیز بے نیاز۔ آزاد۔ اک روح گریز

" روح گریز" نہ اسم فاعل ترکیبی ہے نہ ہو سکتا ہے کیونکہ بحالت اسم فاعل ترکیبی اضافت نہیں آتی غرض باضافت یا بلا اضافت دونوں طرح یہ بے معنی ہے۔

بھاگتی ہے محفل اوہام سے کھیلتی ہے اپنے صبح و شام سے

" اوہام" جمع ہے وہم کی۔ وہم کی محفل نہیں ہوتی البتہ وہم پرستوں کی محفل ہو سکتی ہے۔ صبح اور شام دونوں تانیث ہیں مروجہ رسم الخط کے خلاف " اپنی" کے عوض " اپنے" ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو بہر حال یہ لفظ بھرتی کا ہے اس امر کا اظہار بھی خالی از لطف نہیں کہ " بھاگتی اور کھیلتی" کا فاعل بیسویں صدی ہے۔

اک رعونت اک خوشی اک بانکپن بزم رندان سرکشی کی انجمن

"بیسویں صدی اک رعونت ہے اک بانکپن ہے" کیا اردو میں یہ جملہ صحیح اور با معنی سمجھا جاسکتا ہے؟ سرکشوں کی انجمن تو ہو سکتی ہے مگر "سرکشی کی انجمن" کسے کہتے ہیں۔

زلزلہ۔طوفان۔بھونچال اور آگ رینگتا ہو جیسے اک زہریلا ناگ

"رینگتا ہو" سے یہ مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ مصرعہ اولیٰ میں فاعل کی چال کا کچھ ذکر آیا ہے حالانکہ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں اور نہ مصرعہ اولیٰ کے الفاظ بیسویں صدی کے لئے تشبیہہ یا صفت ہو سکتے ہیں۔

خوف سے لرزاں نگاہوں سے ایاغ پھونک سے بجھتے ہوئے دل کے چراغ

"نگاہوں سے ایاغ" مہمل ہے۔کتابت کی غلطی فرض کرکے "نگاہوں کے ایاغ" پڑھئے جب بھی کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے "ایاغ" کے معنی ہیں پیالہ نگاہ کے لئے پیالہ نہ تشبیہہ ہے نہ صفت۔ "دل کے چراغ" کیا چیز ہے۔

موت کو رنگین شعلوں میں چھپائے برق کو شیشہ کے سینہ میں دبائے

شعلہ کی صفت رنگین فارسی یا اردو میں مستعمل نہیں۔موت کو شعلہ میں چھپانا بے معنی ہے۔شیشہ میں اتارنا اردو میں کنایہ ہے مسخر کرنے سے لیکن شیشہ کے سینہ میں دبانا مہمل ہے۔

شادماں روح عناصر دیکھ کر مست زہر آلود ساغر دیکھ کر

"روح عناصر اور زہر آلود ساغر" کس چیز سے عبارت ہے۔زہر پی کر مرجانا تو سنا مگر زہر پی کر مست ہو جانا بیسویں صدی کا کرشمہ ہے۔

شعبدہ گر خون موجودات کی پینے والی تلخیٔ آفات کی

"خون موجودات کی شعبدہ گر ہے" بے معنی جملہ ہے۔تلخیٔ آفات نہ شراب نہ شربت پھر اوس کا پینا کیا معنی اور بیسویں صدی کو اس سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔

ایک روشن آگ اک کالا دھواں ایک شور ہولناک آسمان

بیسویں صدی کی شعبدہ گری کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔"شور ہولناک آسمان" یعنی؟ آسمان تو بذات خود ہولناک یا غیر ہولناک شور نہیں کیا کرتا۔

ایک ٹیڑھی چال اک ٹیڑھی نگاہ جھوٹ اور سچ کا سنہری اشتباہ

یہ ٹیڑھی سیدھی تو ہماری سمجھ میں نہ آئی مگر اشتباہ کو سنہری اور دو پہلی سے کیا واسطہ اشتباہ [illegible]

سنہرا کہیں گے یہ لفظ مونث کے ساتھ سنہری اور مذکر کے ساتھ سنہرا مستعمل ہے۔

مصلحت اور غور سے نا آشنا   با ادب محفل میں اونچا قہقہہ

" مصلحت سے نا آشنا " صحیح مگر " غور سے نا آشنا " مہمل ہے۔ " با ادب محفل " کیسے قرار دیا گیا اور اس سے کیا مراد ہے۔

قہقہہ خود بلند آواز سے ہنسنے کو کہتے ہیں لہذا " اونچا قہقہہ صحیح نہیں۔

خشک پتے سوکھی ڈالی کی زبان   نغمہ غم بلبل بے آشیان

دلکش آواز کو نغمہ کہتے ہیں۔ کیا غم زدوں کی آہ و بکا بھی دلکش ہوا کرتی ہے جو اوسے نغمہ غم کہا جائے۔

چیل اور کودن کا غم کھاتی ہوئی   رقص قمری سے گذر جاتی ہوئی

قمری کی نالہ کشی تو مشہور ہے مگر اب معلوم ہوا قمری ناچتی بھی ہے۔

علم کی مشعل کھنڈر میں لے چلے   یا کبھی نور سحر میں لے چلے

" علم کی مشعل " لے چلنے کا فاعل کون ہے۔ بیسویں صدی واحد مونث اور افعال جمع مذکر یہ کیا ماجرا ہے۔

" نور سحر " کے مقابلہ کا لفظ ظلمت شب تھا نہ کہ کھنڈر۔ کھنڈر ویران اور شکستہ مکان کو کہتے ہیں اس لفظ کو اگر جہل کیواسطے استعارہ یا کنایہ فرض کیجئے تو نور سحر علم کے واسطے استعارہ ہوگا نور سحر میں علم کی مشعل لیجانے پر وہی پرانی کہاوت صادق آتی ہے دھوپوں میں شال روشنی میں مشال (مشعل)

چاند کو ٹھوکر سے شرماتی ہوئی   پستیوں کو اوج پر لاتی ہوئی

یہ وہی چاند ہوگا جس کو " قمر " بھی کہتے ہیں۔ شاید اسی شرم کے مارے وہ " شفق کی پیٹھ کے پیچھے منہ چھپاتا ہے "

ایک بھوت آوارہ گورستان میں   ایک روح شوق کوہستان میں

" بیسویں صدی " بھی کیا کیا روپ بدلتی ہے۔ " روح شوق " کیا بلا ہے اور کوہستان سے اوس کو کیا واسطہ ہے۔

" روح شوق " بھی کوئی بھوت کی قسم ہوگی اسی لئے ایک بھوت گورستان میں دوسرا کوہستان میں آوارہ پھرتا ہے۔

اک گنہ اک بے نیازی ایک بھول   آیتہ فی النار کی شان نزول

گنہ۔ بے نیازی۔ بھول۔ بیسویں صدی کے لئے صفت ہے یا تشبیہ ہم تو کچھ سمجھ نہ سکے۔ " آیت کی شان نزول " غلط آیت کا شان نزول کہنا چاہیئے۔ نزول تذکیر ہے۔ لفظ آیت کو آیتہ لکھنا بھی صحیح نہیں۔

ایک کھرپی ایک کمبل اک کدال   ذوق آزادی کی روح بے مثال

ہنسنے کا تو یہ موقع نہیں۔ کیا بیسوین صدی میں کسان نہیں ہونے ؟ ذوق آزادی کی بے مثال روح کھرپی

کمیل اور کدال" ہی تو ہے،

رعب دولت خون کھولاتا ہوا نازہستی آگ برساتا ہوا

شاعر کا مطلب غالباً یہ ہے کہ بیسویں صدی کے دولت مندوں کی دولت کا رعب کسان کا خون کھولاتا ہے رعب کے معنی ہیں خوف یا ڈر" خون کھولنا" کنایہ ہے غیظ وغضب سے۔ ڈر اور خوف کی حالت میں غیظ وغضب باقی نہیں رہتا خوف کے مارے تو خون ہی خشک ہو جاتا ہے پس مصرعہ اولیٰ معناً صحیح نہیں۔" ناز ہستی" اور اوس کا آگ برسانا بھی مہمل ہے۔

آنکھ کے ڈوروں میں خون انتقام ہیچ نظروں میں خداؤں کے غلام

اور باتوں سے قطع نظر" خداؤں کے غلام" کہہ کر مصنف نے سخت غلطی کی۔ خدا ترجمہ ہے الہ کا فارسی میں اس لفظ کی کوئی جمع ہی نہیں۔ سوا وحدہ لا شریک لہ کے کسی دوسرے کے واسطے یہ لفظ بغیر امالہ واضافت استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔

سرزمین آسمان سے اک ٹھٹول ایک حرف شوخ اک گستاخ بول

کرہ ارضی کے علاوہ کوئی اور قطعہ زمین ہوگا جسے شاید" سرزمین آسمان" کہتے ہیں۔ "حرف شوخ" تو مہمل ہے ؟

لذت وہم وگمان کے سامنے خالق کون ومکان کے سامنے

" وہم وگمان کی لذت" اور پھر اس" لذت کے سامنے" خدا جانے وہ کونسا ناقابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ یہ وہی ٹھٹول" "حرف شوخ" اور" گستاخ بول" تو نہیں"؟ مصرعہ اولی بڑا مزیدار ہے۔

برق ہے ہر خرمن خاموش پر نازفرمائی ہے عقل وہوش پر

" خرمن" بے زبان بھی ہے اور بے حس وحرکت بھی ہے پھر اوسے" خاموش" کیوں نہ کہیں کس کی" عقل وہوش" پر بیسویں صدی" نازفرمائی" ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہے ؟

کیا بتاؤں اوس کا کیا پیغام ہے کیا بتاؤں اوس کا کیا انجام ہے

ابھی نصف صدی باقی اور انجام دور ہے خدا کرے اس کا" انجام اور پیغام" مصنف ہی سنا سکیں تاکہ آنے والی نسلیں بھی کچھ لطف حاصل کریں ؛

———(✻)———

تکمیل عہد

جناب غلام جیلانی صاحب بی۔اے

"معاف کرنا علیم! ـــ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں! ـــ دل کھول کر کہنا چاہتا ہوں! ـــ تکلفات کے پردے اٹھا کر کہنا چاہتا ہوں!!! ـــ تصنع و بناوٹ کو دور کر کے کہنا چاہتا ہوں!!!! ـــ"

علیم بدستور خاموش رہا ـــ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ حمید کی موجودگی سے بھی ناواقف ہے۔ غالباً حمید نے بھی یہی محسوس کیا ـــ اور وہ بھی خاموش ہو گیا ـــ علیم کی خاموشی سے بیخودی عیاں تھی ـ لیکن حمید کی خاموشی میں ایک کرب ایک درد ـــ ایک انتظار جلوہ گر تھا ـــ یکایک علیم کی نظریں حمید کے چہرے پر جم گئیں ـــ گویا وہ حمید کے دل کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش میں تھا ـــ یہاں تک کہ دونوں کا تار نگاہ ایک ہو گیا ـــ اور پھر علیم کی نظریں زمین پر گڑ گئیں ـــ گویا اس نے حمید کی صداقت کو پالیا ـــ اور اب اس کے تیور رشک وشبہ کی بجائے ندامت کا پتہ دے رہے تھے۔ اب بھی دونوں خاموش تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ علیم خاموشی کے اس طلسم کو توڑ دینے کے لئے بیتاب ہے ـــ اسی بیتابی کے عالم میں اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ پھر سگریٹ گلدان میں پھینک دیا ـــ اس کے چہرے پر اب ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ـــ وہ طنزیہ سنجیدگی غائب ہو گئی جو اس سے پہلے موجود تھی ـــ یکایک اس کے لب ہلنے لگے۔ گویا وہ کچھ کہنے پر آمادہ ہے۔ اور پھر بدقت وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"تم کچھ دل کھول کر کہنا چاہتے ہو!!؟"

"ہاں دل کھول کر کہنا چاہتا ہوں ـــ اس سے ہمدردی جتانا مقصود نہیں ـــ اظہار خلوص بھی میرا مدعا نہیں ـــ تمہیں اس بات پر بھی مجبور نہیں کرتا کہ مجھ کو اپنا ہمدرد سمجھو، مونس و غمخوار سمجھو ـــ نہیں ـــ ہرگز نہیں ـــ میں تمہارے غم کا شریک ہو ہی نہیں سکتا ـــ میری دنیا رنگین دنیا ہے ـــ میری کھیتی پر ابر کرم مہربان رہا ہے۔ میں تمہارا رقیب ٹھہر سکتا ہوں۔ غمخوار نہیں ـــ چاہو تو مجھ کو اپنا دشمن بھی تصور کر سکتے ہو ـــ"

علیم ایک ایک جملہ کو سنتا گیا ـــ حمید کو روکنا چاہتا تھا۔ روک نہ سکا ـــ جذبات کا طوفان امنڈ چلا آ رہا تھا ـــ وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا ـــ

"حمید!!"

علیم دوبارہ خاموش ہو گیا ـــ اور حمید بھی رک گیا ـــ بمشکل علیم نے جذبات پر قابو پالیا ـــ اور کہا۔

"حمید! مجھے معاف کردو! ــــ اب وہ کہو جو کہنا چاہتے تھے ــــ"

"ہاں کہنے ہی آیا ہوں ـ کہوں گا ــــ ضرور کہوں گا ــــ سنو ــــ مجھ کو معلوم ہے کہ تمہارا لڑکپن کس طرح گذرا ــــ اس وقت جبکہ تمہارے کندھوں کے لئے کسی کا دست نازک بھی بارگراں ثابت ہو سکتا تھا تم پر ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ ــــ ایک طوفان ٹوٹ پڑا ــــ تمہاری دنیا بدل گئی ــــ تم بے سہارا ہو گئے ــــ یہ سب کچھ ہو گیا لیکن ـ تم خود نہیں بدلے ـ تمہاری زندگی اسی معیار پر قایم رہی ـ تمہاری آمدنی گھٹ کر صفر ہو گئی ـ لیکن تمہارے خرچ میں ذری بھی کمی نہ ہوئی ــــ تمہیں دیکھ کر لوگ کہتے ہیں ــــ رسی جل چکی ہے ــــ ابھی بل باقی ہے ــــ لیکن کب تک ـ میں خود بھی یہی محسوس کرتا تھا ــــ تمہارے حرکات و انداز سے انانیت اور پریشان دماغی عیاں تھی ــــ لیکن ــــ"

"ہاں یہی میری بھول تھی ــــ انانیت اور پریشان دماغی ہی نے مجھ کو تباہ کیا ـ مجھ کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا جس طرف ہوا چل رہی تھی ــــ مجھ کو وہیں پہنچ جانا چاہئے تھا ــــ"

"نہیں ہرگز نہیں ــــ وہ تمہاری بھول نہ تھی ــــ دنیا کی بھول تھی ــــ وہ انانیت اور پریشان دماغی نہ تھی خودی اور خودداری تھی ــــ تم نے مصائب و آلام کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہ کیا ــــ بلکہ مردانگی سے ان کا مقابلہ کیا ــــ اور اُن پر قابو پالیا ــــ تم نے اُن سے گھبرا کر گردش افلاک اور کج رو انجم کی شکایت نہیں کی بلکہ راز حیات دریافت کر لیا ــــ"

"حمید! کیا تم یہی کہنا چاہتے تھے ــــ"

"نہیں اور بھی کچھ ہے ــــ تم نے ایک شاہراہ تعمیر کی ــــ پہلے تم کو دنیا کیا سمجھتی تھی ــــ سنو ــــ نازوں کے پلے ہیں ـ سر پر سے سایہ اوٹھ چکا ہے ـ ماشاء اللہ خود سر بھی ہیں ــــ بے لگام ہو جانا ضروری ہے تعلیم کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ــــ اب تو یہ ٹھاٹ کریں گے ـ ٹھاٹ ــــ بچا کچا سرمایہ لٹا دیں گے ــــ اور اس کے ساتھ ہی آبا و اجداد کی عزت بھی ــــ لیکن تم نے کمال کر دیا ــــ مجھے خوب یاد ہے کہ تم ہماری جماعت کے کمزور ترین طلبہ میں شمار کئے جاتے تھے ــــ اساتذہ کا خیال تھا کہ تم کاہل تھے غبی نہیں ــــ اسی لئے وہ ہمیشہ تمہیں نصیحت کیا کرتے تھے ـ لیکن تمہیں ان کی نصیحت کی کوئی پروا نہ تھی ــــ اس سانحہ کے بعد بھی تمہاری ظاہری حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ـ اس کے برخلاف ایسا ظاہر ہونے لگا کہ تم تعلیم سے اور بھی غافل ہوتے جا رہے ہو ــــ امتحان قریب تھا ـ جماعت کے اکثر لڑکے تم سے نفرت کرتے تھے ــــ اسلئے کہ تم مغرور تھے ـ خود مجھ کو بھی تمہارا غرور کھٹکتا تھا ــــ اور میں تم سے بات کرتے بھی جھجکتا تھا ـ کیونکہ تم کسی سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے ـ لیکن اس کے باوجود میں نے تمہیں تعلیم کی

طرف مائل کرنے کی ٹھان لی ۔۔۔ اور موقع ڈھونڈتا رہا ۔۔۔ غالباً تمھیں یاد ہوگا کہ ایک شام تم جہلقدی سے واپس ہو رہے تھے کہ میں مل گیا ۔۔۔"

" اور غالباً تمھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ میں نے تمھیں امتحان کی قریب اور تمھاری تعلیمی حالت کے متعلق گفتگو کرنا چاہا تھا"

" ہاں یہ بھی یاد ہے "

" ۔۔۔ لیکن تم نے میری بات کو سنی ان سنی کردی ۔۔۔ اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے مجھ کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا ۔۔۔ اور کہا تھا کہ کچھ دکھاتا ہے ۔۔۔"

" ہاں ! "

" میں چاہتا تو تھا کہ انکار کردوں ۔۔۔ اور گھر جاکر اپنے پروگرام کے متعلق امتحان کی تیاری میں لگ جاؤں۔ مگر خیال ہوا کہ شاید ۔۔۔ اسی دوران میں تمھیں راہ راست پر لا سکوں ۔ محض اسی خیال سے تمھارے ساتھ ہو گیا۔ ۔۔۔ تم نے گھر پہنچنے کے بعد بھی مجھ کو موقع نہ دیا ۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا ۔ ایڈیٹر کا خط دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ۔۔۔ تمھارے افسانے کی تعریف ۔۔۔ اور معاوضہ ۔۔۔ مجھ کو حیرت ہونے لگی ۔۔۔ اور ساتھ ہی افسانہ پڑھنے کی خواہش ہوئی ۔۔۔ افسانہ پڑھنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ ۔۔۔ میں گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو ۔۔۔ اس کے بعد راستہ تمام یہی سوچتا رہا کہ ۔۔۔ امتحان میں تمھارا کامیاب ہونا دشوار ہے ۔۔۔ تمھیں اب افسانہ نویسی کا شوق ہو چلا ہے ۔۔۔ اب تعلیم ہو چکی ۔۔۔ اس کے بعد امتحان شروع ہو گیا ۔۔۔ امتحان کے ختم ہونے پر میں تعطیلات گذارنے کے لئے چلا گیا ۔۔۔ سفر سے واپس ہوا تھا کہ نتیجہ شائع ہوا ۔ لازماً مجھ کو پہلے اپنے نام کی فکر ہوئی ۔۔۔ ڈھونڈا ۔ درجہ دوم کی فہرست میں میرا نام تھا ۔۔۔ اپنے بارے میں جب اطمینان ہو چکا تو ۔ اور دوستوں کے نام ڈھونڈنے لگا ۔ بعض کے نام موجود تھے ۔ اور بعض کے نہیں ۔ پھر مجھ کو خیال آیا کہ تمھارے نام کو بھی دیکھ لینا چاہیئے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ تمھارا کامیاب ہونا ناممکن ہے ۔ اور اگر اتفاقاً کامیاب بھی ہوئے تو درجہ سوم میں ہوگے ۔ اسی لئے میں کامیاب ہونے والوں کے نام پڑھتا گیا ۔ تمھارا نام نہ تھا ۔ یقین ہو گیا کہ تم ناکام رہے ۔ اس کے بعد تمھارا نام دماغ سے محو ہو گیا ۔ اور اب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ درجہ اول میں کون کون کامیاب ہیں ۔۔۔ یاور کرو میں کرسی پر اچھل گیا جب تمھارا نام دکھائی دیا ۔ حیرت ہونے لگی کہ آخر تمھارا نام درجہ اول میں کامیاب ہونے والوں کی فہرست میں کیسے آگیا ۔۔۔ اور وہ بھی سب سے اوپر ۔ فوراً تم سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی ۔۔۔ اور تمھارے یہاں چلا آیا ۔ یاد ہے اس وقت تم کیا کر رہے تھے ۔۔۔" " ہاں میں ایک افسانہ لکھ رہا تھا "

مگر حمید ـــــ یہ سب کہنے کا آخر مقصد کیا ہے ؟" حمید نے سنی ان سنی کر دی ۔

" اور تم نے میرے سوال کے جواب میں کہ افسانوں کا خبط پھر سوار ہے ـــــ پہلی مرتبہ اپنے راز سے آگاہ کیا ـــــ اور اس وقت مجھ کو معلوم ہوا کہ تم کس طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی بھی کرتے رہے ـــــ انتھک محنت کے بعد کس طرح تمہیں دونوں جگہ کامیابی ہوئی ـــــ یہ معلوم کرنے کے بعد میں نے تم سے آئندہ کے متعلق سوال کیا تھا ـــــ شاید تمہیں یاد ہوگا۔"

" ہاں یاد ہے !"

تمہارے ارادے سے مجھ کو بیحد خوشی ہوئی ـــــ اور اس بات کا رنج بھی ہوا کہ جب تم کو سمجھ چکا تو ـــــ تمہارا ساتھ چھوٹ گیا ـــــ کیونکہ والد صاحب نے میری تعلیم ختم کرا دینے کا فیصلہ کر دیا تھا ـــــ اور مجھ کو کاروبار میں شریک کر لیا گیا تھا ـــــ میں نے تمہیں اپنے مستقبل کا حال بتا کر تمہاری دوستی کی بھیک مانگی تھی ـــــ اور اسی وقت سے اصلی دوستی کی ابتدا ہوئی تھی ـــــ اُس کے بعد میں اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا اور تم کالج میں داخل ہو گئے ـــــ دائرۂ عمل بدل چکا تھا لیکن دوستی قایم تھی ـــــ اسی لئے اکثر ملاقات ہوتی رہی ـــــ اسی دوران میں تم نے ایف ۔ اے ـــــ اور بی ۔ اے دونوں امتحانوں میں امتیازی کامیابی حاصل کی ـــــ اور اس کے بعد تم میری رائے کو ٹھکراتے ہوئے ایم ۔ اے کرنے کی ٹھان لی ـــــ اور کامیاب بھی ہو گئے ـــــ اور پھر ملازمت بھی مل گئی ـــــ دنیا کو اپنا خیال بدلنا پڑا ـــــ تم کامیاب زندگی کی بہترین مثال تھے ـــــ تمہاری زندگی اب پوری طرح سدھر گئی تھی ـــــ تمہیں تمہاری گم کردہ فراغت اور آسودگی مل گئی تھی ـــــ"

" آسودگی ! فراغت !!"

" ہاں آسودگی بھی ملی اور فراغت بھی ـــــ مگر صرف چند دنوں کیلئے ـــــ بہت جلد تمہیں پھر غم سے سابقہ پڑا ـــــ تم نے محبت کی ـــــ ہاں تمہیں محبت کرنے کا حق تھا ـــــ سلمیٰ محبت کرنے ہی کی چیز تھی ۔"

علیم کے جذبات یکایک بھڑک اٹھے ـــــ وہ چلا اٹھا ۔

" حمید بند کر و یہ بکواس ـــــ آہ مجھ کو دھوکا ہوا ـــــ میں اب کچھ نہیں سن سکتا ـــــ نکل جاؤ یہاں سے ـــــ ورنہ ـــــ"

" نہیں ـــــ تمہیں سننا ہی پڑیگا ـــــ مجھے معلوم ہے تم پر کیا گذر رہی ہے ـــــ مگر علیم میں عہد کر چکا ہوں۔"

" کس بات کا ؟"

" بعد میں معلوم ہوگا ـــــ سنو ـــــ اپنے آپ پر جبر کر کے سنو ـــــ سلمیٰ تمہاری بیحد عزت کرتی ہے ـــــ

اور اس سے زیادہ وہ تمھاری کامیاب محبت کی قدر کرتی ہے "

"کامیاب محبت !؟"

" ہاں کامیاب محبت ! ـــــ سنو ـــــ تم بخوبی جانتے ہو کہ محبت صرف ایک ہی مرتبہ کیجا سکتی ہے ـــــ اور اسی لئے سلمیٰ تمھاری عزت کرنے کے باوجود ـــــ تمھاری محبت کی قدر کرنے کے باوجود تمھاری نہ ہوسکی " اور اسی کا نام کامیاب محبت ہے کیا !؟

" نہیں وہ اس کے بعد کی چیز ہے ـــــ سلمیٰ میں انکاری جواب دینے کی بھی ہمت نہ تھی ـــــ اور نہ وہ تمھیں دھوکا دینا چاہتی تھی ـــــ اصولاً اس کو صاف صاف کہدینا چاہئے تھا کہ وہ پہلے سے کسی کی محبت میں گرفتار ہے ـــــ لیکن ـــــ وہ خاموش رہی ـــــ اور تم بھی خاموش رہے ـــــ یہ سمجھکر کہ اس کو اچھی طرح سوچ لینے کا موقع ملجائے ـــــ اسی دوران میں ہماری شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی ۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ تھی ـــــ جدائی کے دن گن گن کر کاٹنے لگا ـــــ دعوتی رقعے چھپوالیا ـــــ رقعات کی تقسیم قبل از وقت تھی ـــــ اس لئے انہیں سلمیٰ کے پاس بھجوادیا تاکہ وہ بھی انہیں دیکھ لے ـــــ سلمیٰ انہیں دیکھکر بیحد خوش ہوئی ـــــ بنڈل سے ایک رقعہ نکال کر اپنے ہاں رکھ لیا ـــــ کس لئے ؟ ـــــ یہ مجھ کو معلوم نہ تھا ـــــ کاش معلوم ہوتا ـــــ سلمیٰ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا ـــــ مگر ایک لڑکی ـــــ سلمیٰ کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہ تھی ـــــ دوسرے ہی دن یہ خبر پھیلی کہ تم رخصت لے چکے ہو ـــــ اور اُسی دن شام کی گاڑی سے کشمیر جارہے ہو ـــــ سلمیٰ میرے ہاں دوڑی آئی ـــــ آنکھ میں آنسو تھے ـــــ صورت پر ہوائیاں اڑرہی تھیں ـــــ آتے ہی اس نے کہا ـــــ انہیں روک لو ـــــ جانے نہ دو ـــــ میں پریشان تھا کہ آلہٰی یہ کیا معمہ ہے ـــــ سوال کیا ـــــ کس کو روک لوں ـــــ کہاں نہ جانے دوں ـــــ وہ کہنے لگی ـــــ علیم کو ـــــ وہ کشمیر جارہے ہیں ـــــ دریافت کیا کہوں ـــــ اس کے بعد سلمیٰ نے بتایا کہ تمھیں بھی اس سے محبت تھی ـــــ تم نے اظہار محبت بھی کیا تھا ـــــ اور پھر دو طرفہ خاموشی کے بعد ـــــ رقعہ کا روانہ کرنا ـــــ غرض سب کچھ سمجھ میں آگیا ـــــ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ سلمیٰ نے دوبارہ کہا ـــــ کسی طرح بھی انہیں روک لو ـــــ میری دانست میں تمھیں روکنا مناسب نہ تھا ۔

ـــــ اور اگر میں روکتا بھی تو تم نہ رکتے ـــــ کیوں ٹھیک تھا نا میرا خیال ؟ ـــــ "

" ہاں ! اس وقت دنیا کی کوئی قوت مجھے اپنے ارادوں سے باز نہ رکھ سکتی تھی "

" یہی میں نے سلمیٰ کو سمجھادیا ـــــ وہ سمجھ بھی گئی ـــــ لیکن وہ اس چیز کو بھول نہ سکی ـــــ اس کے بعد تمھارا تار ملا ـــــ عین نکاح کے بعد ـــــ تار دیکھکر مجھے بیحد مسرت ہوئی ـــــ اور چاہتا تھا کہ سلمیٰ کے ہاں بھیج دوں ـــــ لیکن ـــــ یکایک مجھ کو خیال بدلنا پڑا ـــــ تار میرے نام کا تھا ـــــ مبارکباد مجھ کو ـــــ اور صرف مجھکو دیگئی تھی ـــــ

شاید سلمیٰ کا خیال اس طرف نہ جاتا ــــ لیکن پھر بھی مجھ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ تار ابھی نہ دکھلاؤں ــــ تمہارا مقصد غالباً یہ نہ تھا "

"شاید؟"

"اس کے بعد میں تم سے خائف رہنے لگا ــــ ڈر تھا کہ کہیں میری زندگی تلخ نہ ہو جائے ــــ ایک مہینہ گذر گیا ــــ ڈر دور ہوتا گیا ــــ اور میں تمہاری عظمت کا قایل ہونے لگا ــــ اور اس چیز میں سلمیٰ مجھ سے بھی آگے تھی ــــ اس کے بعد تمہارا افسانہ چھپا ــــ وہی افسانہ جس کا عنوان تھا ــــ

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو   وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو

اس افسانہ نے تمہیں اوج ثریا پر پہنچا دیا ــــ تمہارے ہر افسانہ میں ایک خاص چیز ہوتی ہے ــــ اور وہ تمہاری شخصیت ــــ غالباً کولرج نے جو بات ملٹن کے اشخاص قصہ کے متعلق کہی ہے ــــ وہ تمہارے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے ــــ اس کے بعد سے تم میری نظروں میں ــــ اور مجھ سے زیادہ سلمیٰ کی نظروں میں ــــ موت سے زیادہ پرستش کے قابل ہو گئے ــــ ہاں علیم اس افسانہ کا مسودہ تو محفوظ ہے نا "

"نہیں!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"میرے ہاں نہیں ہے ــــ"

"تمہیں بتانا ہوگا کہ وہ کیا ہوا "

"مجھے یاد نہیں "

"علیم! مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے ــــ مگر میں تم سے سننا چاہتا ہوں "

"جب تمہیں معلوم ہے تو پھر بتانے کی کیا ضرورت ہے "

"ضرورت ہے ــــ یقینی ضرورت ہے ــــ پوری تفصیل کی ضرورت ہے "

"کیوں کیا میری سوانح حیات لکھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں فی الحال تو نہیں ــــ اشتعہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا "

"پھر اس ضد کا مقصد "

"ضد ہی سمجھ لو ــــ مگر جلد کہو ــــ مجھے بعد میں بہت کچھ کہنا ہے ــــ

"پھر کہہ ڈالو"

"نہیں ــــ یہ سنے بغیر کہہ نہیں سکتا ــــ اور کہے بغیر یہاں سے جا بھی نہیں سکتا"ـــ

"کشمیر سے آنے کے بعد ایک دن ایک اجنبی لڑکی کا خط ملا ـــ وہ مجھ سے افسانہ کا مسودہ طلب کرتی تھی ـــ نقل نہیں ــــ اور لکھا تھا کہ معاوضہ دینے کے لئے بھی تیار ہے ــــ خیال تو ہوا کہ جواب نہ دوں ــــ لیکن میری نظروں میں ایسا کرنا صرف بد اخلاقی ہی نہیں ــــ جرم بھی ہے ــــ اسی لئے لکھ مارا ــــ معاوضہ پانسو روپیہ ہوگا ــــ حمید! تم سمجھ سکتے ہو۔ میں نے یہ جواب ٹالنے کی غرض سے دیا تھا ــــ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دوسرے ہی دن ڈاکیہ نے ایک لفافہ دیا ــــ لفافہ انشور کیا گیا تھا ــــ اور اس میں پانسو روپیہ کے نوٹ تھے ــــ اور اس کے ساتھ خط بھی تھا ــــ لکھا تھا ــــ مسودہ فوراً روانہ کر دیجئے ــــ"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرتا ــــ رقم اسی طریقہ سے واپس کر دی ــــ اور ساتھ ہی مسودہ بھی ــــ مگر آج تک یہ نہ معلوم کر سکا کہ وہ لڑکی کون تھی ــــ اور اس کو مسودہ سے کیا غرض تھی ــــ"

"جاننا چاہتے ہو؟"

"معلوم ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں!"

"اچھا سنو! ــــ افسانہ دیکھنے کے بعد خیال ہوا کہ تمہاری اصلی تحریر کو محفوظ کر لینا چاہیئے ــــ اسی مقصد سے ایڈیٹر کو خط لکھا ــــ جواب میں ایک ٹائپ کیا ہوا افسانہ آیا ــــ مایوسی ہوئی ــــ سلمیٰ نے کہا تم سے مانگ لو ــــ مگر مجھے یہ رائے پسند نہ آئی ــــ اس کے بعد سلمیٰ نے دوسری تجویز پیش کی ــــ اور اسی پر عمل کیا گیا"

"گویا ــــ وہ لڑکی فرضی تھی؟"

"نہیں لڑکی بھی فرضی نہ تھی ــــ وہ سلمیٰ کی چھوٹی بہن تھی ــــ"

"لیکن پتہ تو"

"پتہ اصلی ہوتا تو مسودہ نہ ملتا ــــ کیوں ٹھیک ہے نا"

"شاید!"

"تم کشمیر سے آگئے ــــ تم سے رسمی ملاقات بھی ہوتی رہی ــــ بظاہر تم سب کچھ بھول چکے تھے ــــ تم دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو چکے تھے ــــ اور شاید منہمک رہتے اگر ــــ"

" حمید! میں یہ نہ کرتا تو کیا کرتا — ضمیر فروشی مجھ سے ہرگز نہ ہو سکتی تھی "

" ہاں علیم تم نے جو کچھ کیا وہی بہتر تھا — اگر تم ملازمت کی خاطر اپنے دل کی آواز پر دھیان نہ دیتے تو پھر تمہاری وہ عزت باقی نہ رہتی "

" عزت! عزت کیا چیز ہے — اس زمانہ میں دولت ہی عزت ہے "

" نہیں — اس زمانہ میں بھی عزت خود دولت ہے — سلمیٰ اس واقعہ کو سن کر اوچھل پڑی — دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں گئی — تمہاری تصویر کو دیوار سے آتارا — چوکھٹے سے جدا کیا — اور قلم لے کر اس پر کچھ لکھنے لگی — میں دور ہی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ وہ تصویر لئے آئی — تحریر دیکھا — سنو گے اس نے کیا لکھا — " جذبۂ خودی! زندہ باد " — پھر وہ میری طرف پلٹی اور کہا — اب کیا ہوگا؟ — اس سوال نے خود اس کو بھی پریشان کر دیا — وہ بار بار یہی کہنے لگی — اب کیا ہوگا؟ — اس کی حالت نے مجھے اور بھی پریشان کر دیا — لیکن مجھے تمہاری زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقفیت تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم خود کوئی نہ کوئی راہ نکال لوگے — اور اسی وجہ سے میں نے سلمیٰ کو بھی تسلی دی — پچھلے واقعات سنائے — وہ خوش ہوگئی — مطمئن ہوگئی — لیکن کل رات ہم دونوں سینما سے واپس آرہے تھے کہ تم ملے — کہاں ملے — سنو تم شراب خانے سے نکل رہے تھے — ہاتھ میں وسکی کی بوتل تھی — یہ دیکھنا تھا کہ سلمیٰ کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی — مجھ پر بھی سکتہ کا عالم طاری ہو گیا — میں نے موٹر روک لی — اور تمہیں دیکھنے لگا — تم آہستہ آہستہ گھر کی طرف جارہے تھے — تمہاری چال سے ظاہر تھا کہ نشہ میں ہو — سلمیٰ نے چاہا کہ تمہیں ساتھ لے لے — لیکن تم نشہ میں تھے — ایسا کرنا مناسب نہ تھا — اس لئے تم کو اپنے حال پر چھوڑ کر ہم گھر پہنچ گئے — سلمیٰ رات بھر جاگتی رہی — گھڑی گھڑی وہ سوال کرتی رہی کہ اب کیا کرنا چاہیئے — "

" کل رات تم — تم دونوں نے مجھے دیکھ لیا — "

یہ کہکر علیم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا — اس کی صورت ڈراؤنی ہوگئی — اس کے چہرے پر خوفناک ارادوں کی جھلک نمودار ہوگئی —

" علیم! — علیم مجھ کو اور بھی کچھ کہنا ہے — "

علیم حمید کی بات سنے بغیر اپنے آپ سے کہنے لگا — " اب کیا کرنا چاہیئے — ہاں — ٹھیک ہے — "

" علیم! — علیم!! "

چونک " حمید ــــ مجھ کو اب تنہا چھوڑ دو "

نہیں ــــ علیم ہوش میں آؤ ــــ سنو ــــ خدا را سنو ــــ مجھ کو اپنے عہد کی تکمیل سے محروم نہ رکھو ــ"

اب علیم خاموش ہو گیا ــــ اس کا چہرہ بھی دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آ رہا تھا ــــ گویا وہ حمید کی بات سننے پر آمادہ ہو رہا تھا ــــ

" علیم میں خود بھی رات بھر یہی سوچتا رہا ــــ کہ تمہاری زندگی کو کس طرح دوبارہ سنوارا جائے ــــ"

" وہ سنور چکی "

" نہیں علیم ــــ تم یہ کیا کہہ رہے ہو ــــ کچھ تو سنو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں " ــــ

" سُن تو رہا ہوں ۔ ــــ"

" اس طرح نہیں غور سے سنو ــــ میرے سامنے دو چیزیں تھیں ــــ ایک تو یہ کہ تمہیں شراب پینے سے کس طرح روکا جائے ــــ دوسری یہ کہ اب تمہیں کیا کرنا چاہئیے ــــ بہت دیر بعد ایک ترکیب سمجھ میں آئی ــــ سلمیٰ سے کہا ــــ سلمیٰ کو ترکیب پسند تھی ــــ لیکن ــــ غالباً مجھ کو اُس پر عمل کرنے کے قابل نہ سمجھا ــــ اسی لئے اُس نے جھوٹی تسلی سے تعبیر کیا ــــ اور اسی لئے مجھ کو عہد کرنا پڑا ــــ اور اب اُس پر عمل کرنا ضروری ہے ــــ اور تم کو میرا ساتھ دینا پڑیگا ــــ"

" میں ــــ تمہارا ساتھ ! ــــ"

" ہاں تم ! ــــ پوری بات تو سنو ــــ سب سے پہلے تمہیں شراب ترک کرنا ہوگا ــــ"

" شراب !"

" ہاں شراب !"

" اچھا پھر ! "

" نہیں پہلے وعدہ کرو کہ اب شراب کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا "

" ٹھیک "

" علیم ــــ عہد کی تکمیل عہد ہی سے ہو سکتی ہے "

" ہاں ــــ میں پہلے ہی عہد کر چکا ہوں "

" کب ؟"

" ابھی کچھ دیر پہلے "

" کیا سچ کہہ رہے ہو "

" ہاں! سچ کہہ رہا ہوں "

" اچھا چلو ——— اب دوسری چیز سنو ——— تمھیں اب کچھ کرنا چاہیئے ——— "

" اس کا بھی تصفیہ ہو چکا ہے "

" میں بھی تو سنوں "

" میں نہیں بتا سکتا ——— نہیں کسی کو نہیں ——— خود اپنے آپ کو بھی نہیں ——— "

" علیم میں تمھارا مطلب سمجھ رہا ہوں ——— ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا "

" کیوں نہیں؟ "

" میں نہیں چاہتا ہوں ——— "

" میں تو چاہتا ہوں "

" سلمٰی بھی نہیں چاہتی " ———

" اس سے کیا ہوتا ہے؟ "

" علیم! ——— کیا تم سلمٰی کی زندگی خراب کر دینا چاہتے ہو ——— کیا تمھیں اپنے الفاظ یاد نہیں ——— وہی الفاظ جو تمھارے افسانہ کی جان تھے ——— "

" افسانہ! ——— افسانہ ہی ہوتا ہے "

" نہیں اُن الفاظ کا کام افسانہ کی تکمیل ہی نہ تھا ——— اُن کا کام تمھاری شخصیت کی تمثیل تھا ——— وہ تمھارے حقیقی احساسات کے ترجمان تھے ——— نہیں تم اس سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے ——— وہی الفاظ تھے جن کی بدولت سلمٰی تمھیں انسان کامل سمجھنے لگی ——— وہی الفاظ تھے جن کو پڑھ کر سلمٰی کو تسلیم کرنا پڑا کہ تمھاری محبت ——— کامیاب محبت ہے ——— یقیناً تم خود اونہیں بھول نہیں سکتے ——— مگر پھر بھی سنو ——— مجھ سے سنو ———

" ہاں یہ میری بھول تھی ——— بار بار ——— وصل یاد سے بھی بڑی چیز ——— میں نے اس کو کھو دیا ——— لیکن اس کی یاد سے محروم نہیں ——— اب اسی کے سہارے زندگی گذار سکتا ہوں ——— یقیناً ——— یہی زندگی کامیاب زندگی ہوگی ——— وہ اب تمام عمر میرے خیالات کا مرکز رہے گی۔

وہ میری کشتی کی ناخدا ہے ــــ اُسی نے مجھ کو رازِ حیات سے واقف کیا ہے ــــ اُسی نے میری رہبری کی ہے ــــ آئندہ بھی وہی میری رہبری کر سکتی ہے ــــ یقیناً ــــ اب میں صرف ایک ہی راستہ پر چل سکتا ہوں ــــ صرف اسی راستہ پر ــــ جس پر چلنے کی وہ اجازت دے ــــ"

"بتاؤ ــــ کیا یہ الفاظ محض افسانوی کردار کے الفاظ تھے ــــ بتاؤ کیا یہ الفاظ خود تمھارے ہی احساسات کے ترجمان نہ تھے ــــ علیم جواب دو ــــ"

علیم سب کچھ سُنتا رہا ــــ لیکن کچھ جواب نہ دے سکا ۔

"علیم یہ بھی سن لو ــــ اور پھر اس کے بعد جواب دینا ــــ سنو میں نے کیا عہد کیا ہے ــــ تمھیں ان الفاظ پر پابند کر دوں گا ــــ اور اگر یہ نہ کر سکا تو ــــ پھر سلمیٰ کو صورت نہ دکھاؤں گا ــــ بتاؤ کیا تم یہی چاہتے ہو۔ ــــ ہاں یہ بھی سن لو ــــ عہد کے الفاظ خود سلمیٰ ہی کے پیش کردہ ہیں ــــ

ــــ علیم جواب دو ــــ"

"آہ! ــــ کل شام ــــ میں نے پہلی مرتبہ ــــ اپنے رہبر ــــ اپنے دل کی آواز کے خلاف ــــ نہیں اب میں رہبر کو کھو چکا ــــ"

"رہبر کو تم کھو چکے تھے ــــ لیکن رہبر نے تمھیں پا لیا ہے ــــ اب تم مجبور رہو ــــ"

"نہیں! ــــ"

"تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ میں ناکام رہا ــــ نہیں علیم ــــ سوچو ــــ تمھیں میری زندگی تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں ــــ تم سلمیٰ کی زندگی تباہ نہیں کر سکتے ــــ"

"آہ ــــ اب میں کچھ نہیں کر سکتا"

"نہیں علیم سنو ــــ میرے کہے پر عمل کرو ــــ نہیں سلمیٰ کے کہنے پر ــــ"

حمید یہ کہکر جواب کا منتظر رہا ــــ لیکن علیم خاموش رہا ــــ یوں ہی پانچ منٹ گذر گئے اس کے بعد حمید ہی نے مہرِ سکوت توڑی ۔

"ظالم جب یہ نہیں کر سکتا تو جا ــــ سلمیٰ سے کہدے کہ میں ناکام رہا ــــ میں اپنے عہد پر قایم ہوں ــــ میں اب اس کے سامنے نہیں جا سکتا ــــ وہ موٹر میں انتظار کر رہی ــــ انتظار ــــ آہ ــــ پیامِ مرگ کا انتظار ــــ"

حمید کی آواز بھر آئی — اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں — اس پر ایک مجنونانہ غنودگی چھاگئی اُس کا سر ایک بازو لٹک گیا — اور علیم اوس کو گھورتا رہا — نہ معلوم یہ دونوں اس حالت میں کتنی دیر تک رہے — یکایک علیم کی حالت میں فرق نمودار ہوا — وہ گہری سوچ سے بیدار ہوچکا تھا — اب اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ — اس نے حمید کو دیکھا — وہ اب بھی اُسی حالت میں تھا — ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگیا ہے — علیم اپنی جگہ پر سے اوٹھا — حمید کے قریب گیا — اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"حمید! اٹھو! — اپنی کامیابی کا استقبال کرو —"

حمید کی آنکھیں کھل گئیں — وہ علیم کو گھورنے لگا — گویا کہ اس کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ تھا۔

علیم نے دوبارہ کہا —

"ہاں حمید — تم ناکام نہیں رہے —"

اب بھی حمید کچھ سمجھ نہ سکا — وہ بدستور علیم کو گھورتا رہا۔

"حمید! — اٹھو — جلدی کرو — کیا تم انتظار ہی میں رکھنا چاہتے ہو — جاؤ — اپنی کامیابی کی خبر سناؤ — اٹھو —"

"کیا میں جاسکتا ہوں! — سلمیٰ کے سامنے!!"

"ہاں!!"

دردِ محبت

جناب آل رضا صاحب

مجھے تو جان سے بڑھ کر یہ "دردِ الفت" ہے
کہ تیرے حسنِ ستمگار کی "امانت" ہے

لیا ہے پیار سے حسنِ قبول کے قربان
اب اس کے آگے میرا دل ہے میری قسمت ہے

ملا ہے تیرے تصدق میں "حاصلِ ہستی"
نچوڑ جذبۂ الفت کا یہ محبت ہے

وہاں پہنچ کے محبت کا لطف آتا ہے!
جہاں جو شکل محبت کی ہے محبت ہے

جوابِ ترکِ ادب ہے سوال کے صدقے!
غلام ہوکے یہ کیوں کر کہوں محبت ہے

مزے کا درد مقدر سے ہاتھ آتا ہے!
رضاؔ یہ زندگیٔ عشق ایک نعمت ہے

پیشکردہ۔ فاطمہ لیاقت منشی فاضل بلگرام

نغمۂ زندگی

جناب سید محی الدین احمد صاحب (عثمانیہ)

آسمان سے چاندنی پگھل پگھل کر نشیب کی طرف بہنے لگی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ نور کی روشنی میں نہا رہا تھا۔ دنیا ایک فردوسی تبسم میں تبدیل ہو چکی تھی۔ خاموشی، سکوت، موت کا سا سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ موسم بہار کی سرد ہوائیں ابر نیساں کے ننھے ننھے قطروں کا ہار گوندھ کر اپنی شفاف چادر میں چھپائے ہوئے آہستہ آہستہ خوبصورت پھولوں اور پودوں کو سنپاتی پھر رہی تھیں۔ کلیوں کی چٹک اور پھولوں کی مہک چارسو بکھری ہوئی تھی۔ روپہری چاندی اکڑتی، اتراتی، بل کھاتی، چٹانوں سے ٹکراتی، سبزے کو پیار کرتی، سنگ ریزوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی، معلوم نہیں کس نورانی سرزمین کی طرف بہہ رہی تھی۔ کائنات کی رعنائیاں اور جھلکیاں اس فردوسی آئینہ میں سیماب کی طرح لرز رہی تھیں، ندی کے دونوں جانب گھنا جنگل تھا، زمین پر سبزہ ہی سبزہ اگا ہوا تھا۔ ہوائیں شرماتی، ہنستی، کھیلتی ہوئی چل رہی تھیں، درختوں کی چھوٹی چھوٹی ڈالیاں ایک دوسرے سے گلے مل کر بہار کی آمد پر مبارکباد دے رہی تھیں۔ کلیاں ہنس پڑیں، پھول فرش زمین پر بکھر گئے اور ان کی نکہت سارے چمن میں آوارہ پھرنے لگی۔

دور بہت دور ــــ سے ملکوتی نغمہ کی آواز آہستہ آہستہ آنے لگی۔ ہوائیں رک گئیں، پھول اور کلیوں نے چپ سادھ لیا۔ ٹہنیاں ساکن و صامت کھڑی ہو گئیں۔ پتوں نے آواز کی طرف اپنے کان کھڑے کر دئے۔ نغمہ آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔

میں اودی اودی پہاڑیوں کی سمت لئے ہوئے جا رہا تھا۔ پہاڑوں کی ہیبت ناک بلندی اور خوفناک عظمت مجھے اپنی زبان میں دنیا کی بے ثباتی کا درس دے رہی تھیں۔ میں کھڑا غور سے سن رہا تھا۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں زندگی اور اس کی حماقتوں کے عجیب و غریب راز پنہاں تھے، میں آگے بڑھا اور چاہتا تھا کہ ان رازوں کو بے نقاب کروں۔ چاند میری اس حماقت پر ہنستا ہوا بادلوں کے ہلکے ہلکے پردوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ دنیا ایک پھیکے تبسم میں تبدیل ہو گئی۔ پانی بلندی سے قہقہہ لگاتا ہوا نیچے میرے قدموں تلے چھلک گیا اور اس کی ننھی ننھی بوندیں میرے وجود پر چھا گئیں۔ لیکن میں ان حقائق کی گتھی کو سلجھانے کے لئے اور زندگی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے وہیں کھڑا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ نغمہ ــــ شیریں میٹھا، لیکن درد بھرا ہواؤں کی لہروں کو چیرتا ہوا میرے کان کے پردوں سے ٹکرانے لگا اور چپکے چپکے میرے دل نے محسوس کیا

سُن " زندگی کے نغمہ کو "۔
دور ـــــ بہت دور ایک سنہری کشتی پانی کی سیمابی لہروں میں بہہ رہی تھی حسین و جمیل ملکہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس میں جلوہ افگن تھی اور وہ کشتی میری اور صرف میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ چاند سے بھی زیادہ روشن اور پھول سے بھی زیادہ شگفتہ تھا۔ بال رات کی سیاہی سے بھی زیادہ گھنے اور کالے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی، کان میں الماس کے قیمتی بُندے لٹک رہے تھے۔ پیشانی پر یاقوتی ٹیکہ بندھا ہوا تھا۔ وہ ہلکے سے آسمانی لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے نازک ہاتھوں میں سنہری چوڑیاں تھیں اور نقرئی چپو اس کی گرفت میں مضبوط تھے جس سے وہ اپنی ناؤ کھے رہی تھی، ہاتھوں کی مسلسل گردش سے ایک دلچسپ راگنی چوڑیوں کی جھنکار سے پیدا ہوکر اس نغمہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہی تھی، وہ اپنے وجود سے بے خبر، عالم خیال میں موسیقی کے دریا بہا رہی تھی اس کی آمد کے ساتھ ساتھ پانی کی لہریں اٹھ اٹھ کر اس کی کشتی کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ ہوائیں چاند کی سنہری کرنوں میں پھولوں کی نکہت کا ہار گوندھ کر اس کے گلے میں پہنا رہی تھیں۔ سویا ہوا سبزہ بلند ہوکر اپنے آپ کو اس حسن کے حسین پیکر پر سے نثار کر دینا چاہتا تھا۔

اس کی کشتی میرے قریب سے گذری۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں پستی سے بلندیوں کی طرف اٹھتا جا رہا ہوں، میری نظروں نے کہا کہ میں نے اس شاہد علم و ادب کا اس سے پیشتر بھی مشاہدہ کیا ہے؟ اور جس کے نغمے میں آ جنگ حیران و سرگرداں رہا اس کی نگاہیں نیچے زمین پر جھک گئیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی خیال کے پیچھے بھٹک رہی ہے۔ نغمہ کے بند ہوتے ہی ہوائیں پہاڑوں سے ٹکرانے لگیں۔ آبشار چیخنے چلانے اور اپنا سر پھوڑنے لگا۔ درخت رنج اور غصہ سے کانپ اوٹھے۔ ٹہنیاں زمین پر آنسو بہانے لگیں۔ میں اس حسن کو دیکھ کر بے چین سا ہو گیا، آہ، اس کے دیدار کیلئے میں نے کتنی راتیں جاگ جاگ کر کاٹ دی۔ اور کتنے دن رو رو کر بتا دے۔ ایک دلدوز آہ میری روح کی گہرائیوں سے نکل کر اس لامحدود فضا میں تحلیل ہو گئی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میرے ان آنسوؤں سے ساکن پانی میں ایک دلفریب تلاطم پیدا ہو گیا۔ اس کی کشتی اس بھنور میں چکر کھانے لگی۔ آخر کار اس نے اپنی اشک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا " آہ تو نے میری خاموشی اور تنہائی میں کیوں خلل ڈالا۔ میں نے اس مکر و فریب کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس سنسان جنگل کی تنہائی میں آ گئی۔ تاکہ میں ان غموں اور دکھوں کی دنیا سے دور ـــــ بہت دور اس فرحت گاہ کے دلچسپ لمحات میں اپنی باقی زندگی گذار دوں، لیکن تم نے مجھے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔

میں نے اپنی گلوگیر آواز میں کہا " اے علم کی دیوی میں نے تیری خاطر ہر مصیبت کا مقابلہ کیا۔ چاہتا تھا کہ تجھے حاصل کر کے ہی رہوں۔ میں نے تجھے علم کے دبستانوں میں چھان مارا۔ عیش و عشرت کی رنگین محفلوں میں تیری جستجو کی۔ جنگ کے میدان میں تیرے شگفتہ چہرہ کو دیکھنے کیلئے میں نے آسمان سے بم برسائے۔ شہر و بستیاں ویران کئے۔ انسانی زندگیوں کو خاک و خون میں لوٹتا پوٹتا دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ تیری خاطر اس جہان کے سارے طبق کٹ دوں۔ لیکن آہ میرا قیاس کس قدر غلط نکلا۔ میں ظلم و ستم کے ہتھیار لئے تیری کھوج میں تھا اور تو یہاں خراماں خراماں پانی کی سطح پر زندگی اور دلچسپی کی رنگینیاں بکھرتی اور انسانی حماقتوں پر مسکراتی ہوتی بہہ رہی ہے۔

ایک سنہرا تبسم اس کے ہلکے گلابی چہرہ پر چھا گیا۔ کچھ دیر تک وہ میری طرف غور سے دیکھتی رہی۔ قہقہے کے بہم مرغولے ہواؤں کی لپٹ میں سما کر اوپر کی طرف پرواز کرنے لگے۔ وہ بے پنہاں قہقہوں کے عالم میں مجھ سے گویا ہوئی۔ " اے نادان تو کتنا خودغرض اور کتنا ظالم ہے، تو نے میری خاطر اپنوں کو دکھ دیا۔ مجھ سے انسانیت کے راز معلوم کرنے کی بجائے بہیمیت اور حیوانیت کے راستہ پر گامزن رہا۔ کاش! کہ تو میرے لافانی عطیہ سے زندگی کے اصلی راز سیکھ سکتا۔"

بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے دبی ہوئی آواز میں میں نے کہا " دیوی مجھے معاف کرنا جنون کی حالت میں معلوم نہیں میں کہاں سے کہاں بھٹک گیا۔ مجھے اپنے کئے ہوئے پر پشیمانی ہو رہی ہے۔ دیوی للہ مجھے معاف کردو۔" میری اس اضطرابی کیف سے وہ بے چین ہوگئی۔ ناصحانہ پیرایہ میں مجھ سے کہنے لگی سن، " جو کوئی بھی مجھ سے محبت کرتا ہے میں اس کے قریب ہی رہتی ہوں۔ مجھے دیکھنے کے لئے من کی آنکھیں پیدا کر، اگر تو کوشش کرے تو مجھے ہمیشہ اپنے قریب ہی پائے گا۔ میں ان دکھی انسانوں کے ساتھ سایہ کی طرح رہتی ہوں۔ جن کی صبح غم اور تکلیفوں سے شروع ہوتی ہے اور رات درد و بے چینی میں بسر ہوتی ہے۔ میں ان فانی پیکروں کے روپ میں جلوہ افگن رہتی ہوں۔ جن کی عریانیت، موت اور تکلیفوں کو دعوت دیتے ہوئے ہمت و استقلال کی سمت مردانہ وار دوڑتی ہے۔ میں ان سرخ، سپید براق نما جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی حویلیوں سے دور ـــ کوسوں دور ـــ جہاں عیش و نشاط کی ساری دلچسپیاں اور رنگینیاں پڑی انگڑائیاں لیتی ہیں، جہاں بلورین پیالے شراب ارغوانی سے چھلک رہے ہوں۔ جن کے ہونٹ ہمیشہ ان جاموں سے ہمکنار رہے ہوں، جن کا جسم شراب کے نشہ میں جھوم رہا ہو، جن کی روح خواب و خیال کی دنیا میں بھٹک رہی ہو اور جن کے طاقتور ہاتھ مظلوموں کی سوکھی روٹی کی طرف بے اختیار اٹھ رہے ہوں ـــ میں ایسی جہنمی

زندگیوں سے دور ـــــ بہت دور ـــــ ان جھونپڑیوں میں بیکسوں کے ساتھ ان کے رنج و راحت میں برابر کی شریک رہتی ہوں "

اگر تجھے میرا مشاہدہ کرنا ہے تو یہ کائنات کی کتاب کھول، تو، تو مجھے ہر شئی اور ہر ذرہ میں پوشیدہ دیکھیگا۔ اپنے آپ میں وہ قوت اور وہ تاثیر پیدا کر کہ میں خود تیری طرف بڑھنے کے لئے مجبور ہو جاؤں۔ ان عظیم الشان پہاڑوں کی طرح اپنے نفس کو مضبوط اور خیالات کو قوی تر بنا۔ پھولوں کی طرح خوش و خرم رہ، اپنے باطن کو جھلکتے ہوئے چشمہ کی طرح صاف و شفاف بنا تاکہ حقیقت اس میں کانپتی ہوئی نظر آئے۔ جھومتے ہوئے درختوں سے ہمت و استقلال کا سبق سیکھ اور حادثات کے تھپیڑوں کا مردانہ وار مقابلہ کر، نور کی روشنی کی طرح دوست و دشمن کا امتیاز کئے بغیر اپنی نیکی اور محبت بکھیر دے۔

وہ یہ کہہ رہی تھی اور سنہری کشتی آہستہ آہستہ نشیب کی طرف بہہ رہی تھی۔ مجھے ان سنہری خیالات کے راز معلوم ہو گئے جن کیلئے میری روح آجتک بے چین تھی۔ یہ وہ راز تھے جو زندگی کی لہروں میں پنہاں تھے اس کی کشتی افق کے قریب تیر رہی تھی اور میں وہیں کھڑا اس کو دیکھ رہا تھا۔

آزادی آزاد

جناب سید محمد حسن صاحب آزاد حیدرآباد

ہر ایک سے اگرچہ بہتر نہیں ہوں میں	شکر خدا ہر ایک سے کہتر نہیں ہوں میں
کیوں آفتاب سے ڈروں شپر نہیں ہوں میں	چمکوں اندھیری رات میں اختر نہیں ہوں میں
اک در کا ہو گیا ہوں نہ چھوڑوں گا میں اسے	اس کا ہزار شکر کہ در در نہیں ہوں میں
ہر چند میں غریب ہوں آفت زدہ سہی	فیشن زدہ نہیں کوئی مسٹر نہیں ہوں میں
ہوں یار شاطر آج ہیں دنیائے انس میں!	روئے زمین قلب پہ دو بھر نہیں ہوں میں
اللہ کا شکر دردسری ختم ہو چکی!	کیوں دردسر ہو مجھ کو کوئی سر نہیں ہوں میں
یہ میری شاعری ہے حقیقت میں شاعری	کیا شاعری میں ثانی اکبر نہیں ہوں میں
لیکر وظیفہ ہو گیا آزاد اب تو میں	پھر کیوں دبوں کسی کے نوکر نہیں ہوں میں

آزاد پنشنر ہوئے دو شاہ کو دعا!
وہ دن بھی آئے کہتے ہو نوکر نہیں ہوں میں

خراجِ بے اعتنائی

جناب محمد احمد علی صاحب

مریضہ نے نقاہت سے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اُس کے پیروں کی جانب آرام کرسی پر اس کا "ظالم" شوہر آرام کر رہا تھا اس کی طویل بیماری کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے مجازی خدا کو اتنے قریب پائی۔ میز پر لیمپ تیزی سے جل رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے پرشکوہ چہرے کی طرف ڈرتی ڈرتی نظریں پھیرلی۔ اسکے خشک مرجھائے ہوئے لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا، اس وقت جس طرح وہ ڈرتی ڈرتی اپنے شوہر کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ آج سے دو ہی سال پہلے اسی طرح وہ نقاب عروسی کی جھلملیوں میں سے پہلی مرتبہ اُس کے چہرہ کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کتنا فرق تھا ان نظروں میں ―― ! ماضی کے دھندلے نقوش۔ اُس کا سرمایہ حیات متحرک تصویروں کی طرح اس کے تصور میں نمایاں ہونے لگے۔ شاہدہ لباس عروسی میں ملبوس حجلۂ عروسی میں دبی ہوئی سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کا ننھا معصوم دل نامعلوم خوف اور مسرت و انبساط کے ملے جلے احساسات سے دھڑک رہا تھا۔ دروازہ کی جانب سے ہلکی سی آواز آئی وہ متجسسانہ دروازہ کی طرف نظر اٹھائی ―― فوراً اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں اور سمندر پر تیرتی ہوئی سیپی کی طرح آہستہ سے بند ہوگئیں۔

"اپنی محترم بیوی کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے یہ سعادتمند شوہر" شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا، آواز غیر مانوس بھی لیکن تھی کتنی نغمہ ریز۔ اُس نے اپنے جسم میں مسرت سے تھرتھراہٹ سی محسوس کی اور غیر اختیاری طور پر اور جھک گئی۔

"فرماتے ہیں یہ حکمائے ماورائے ہند" کہ انسان کا گٹھڑی بن جانا مضر ہے صحت کے لئے"، شمیم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا وہ اس کے قریب تر بیٹھ گیا۔ شرم سے وہ اور سمٹ گئی۔ "محترمہ شاہدہ بیگم صاحب زوجہ شمیم صاحب" شمیم نے کہا "حکم ہے تمہارے شوہر نامدار کا کہ ختم ہو یہ شرم و حجاب کیونکہ وہ مشتاق ہیں دیدار کے!" کتنی مسرت محسوس کر رہی تھی اس وقت۔ اس کو ڈر تھا کہ اس کا شوہر کرخت طبیعت کا نہ ہو لیکن وہ اس قلیل عرصہ میں اندازہ کر چکی تھی کہ اس کا شوہر شگفتہ طبیعت کا مالک ہے عورت بہت جلد فیصلہ کر لیتی ہے "معلوم ہو گیا کہ یوں نہیں مانیں گی آپ" شمیم نے چیلنج دیا "حالانکہ ناظرین نے نہیں بتلایا تھا کہ ہماری بیوی بہت سیدھی سادھی ہیں ―خیر معلوم شد ―" شمیم نے اس کا گھونگٹ کھینچ ڈالا۔ وہ اپنی ہنسی کو چھپانے کے لئے چہرہ کو ہاتھوں سے ڈھانکنا چاہتی تھی لیکن اس کے دونوں نازک ہاتھ بھی تو شمیم کے دست آہنی میں گرفتار تھے۔ گھونگٹ جا چکا تھا ― ایک نہیں پڑا۔ لیکن زبردست رازدان ――!

"تمہاری یہ بند آنکھیں اور حسین ساکت چہرہ" وہ کہنے لگا "کسی مصور کیلئے سرمایہ حیات اور حیات لبوں پر

مسکراہٹ اور ان آنکھوں میں شوخیاں ہوں تو —— " وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

مسرت کی تیز لہر اس کے قلب کی گہرائیوں سے نکلی اور باوجود سخت کوشش ضبط کے لبوں پر ہلکی سی جنبش پیدا کئے بغیر نہ رہ سکی عورت خواہ کتنی ہی بدصورت ہو مرد سے تعریف سُن کر مسرت سے پھولے نہیں سماتی ۔ اِ شاہدہ تو حقیقت میں خوبصورت تھی۔ حدود تعریف سے پرے۔

شمیم نے مختلف طریقوں سے شاہدہ کو ہنسنے اور آنکھیں وا کرنے پر مجبور کیا لیکن نتیجہ "جھپکتی" ہوئی آنکھوں اور مدھم "ہمیں" کے سوا کچھ نہ نکلا۔

"یونہی سہی" شمیم نے لہجہ کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا "ابھی جا کر سب سے کہے دیتا ہوں کہ مجھے ایسے مرمریں مجسمہ کی ضرورت نہیں جس کی آنکھیں بند اور جس کی زبان گویائی سے محروم ۔ شرم ۔ (سخت لہجہ میں) شرم کی بھی حد ہونی چاہئیے ۔ بیہودہ شرم ۔ لیکن کیا فائدہ تم سے کہنے کا؟" وہ ابھی خوشگوار لمحات سے لطف اندوز ہی ہو رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ خوف سے کانپنے لگی وہ قدموں کی آواز سُن کر سمجھی کہ شمیم کمرہ سے جا رہا ہے بدحواسی سے اوس نے آنکھیں کھول دیں ۔ شمیم کسی ڈرل کے شوقین طالب علم کی طرح "لفٹ رائٹ" کر رہا تھا ۔

دونوں کی نظریں ملیں شمیم کی اس مضحکہ خیز حالت پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی کتنی معصوم تھی وہ ہنسی ——

وہ منزل حیات کی طرف "ساز و نغمہ" کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ کیف و مستی کے عالم گامزن تھے کہ ایک سال کے قلیل عرصہ ہی میں شمیم میں تغیر نمایاں ہونے لگا ۔ اس کی نازبرداریاں صدائے جرس کی طرح پہلے گرمجوش اور جلدی ہی سردمہری کی صورت اختیار کر لیں ۔ پہلے پرشور ۔ تھوڑے وقفہ بعد کامل سکوت ——!

شاہدہ جو اپنی اس فردوسی حیات سے پوری طرح اکتساب فرحت کرنے تک نہ پائی تھی کہ شمیم کی بے اعتنائیوں کا شکار ہو گئی تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے فطری حق کی شریک ایک اور ہستی بھی ہے ۔

" اگر وہ دوسری بیاہ کر لاتے اُسے کوئی دکھ نہ ہوتا اگر وہ اس سے کہتا تو وہ خود کوشش کرتی وہ نہیں چاہتی کہ اس کے شوہر کی تنہائیوں کی شریک "بنت معصیت" ہو "

وہ سوچ رہی تھی اس کے چہرہ سے تنفر و استہزا مترشح تھا وہ کسی اندرونی جذبہ کے تحت رونے لگی ۔ کتنا پرفریب خیال تھا ——کتنا خود فریب ! جب کوئی بات امکان سے باہر ہو تو فطرت انسان کئی طرح سے خود فریب استدلالوں سے ممکن العمل سمجھنے کی کوشش کرتی ہے ——! یہی حالت شاہدہ کی تھی ۔ کیا وہ بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتی ہے کہ اس کا دل "دوسری" کے خیال ہی سے دھڑکنے نہیں لگتا تھا ——!!!

بہرحال اس کا شمیم اس کے ہاتھوں سے جا چکا تھا وہ اپنے اس دور ابتلا کو تسلیم و رضا کے ساتھ سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کی سرگوشیوں میں گم کر چکی تھی ایک جینے سے وہ علیل تھی ۔ موت و حیات کی اس کشمکش کے دوران میں اس کا بیوفا شوہر کبھی کبھی دن میں دروازہ سے ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر چلا جاتا ۔ نگاہ غلط انداز —— شریک حیات کی تیمارداری ——!

اس کی نظریں اب تک شوہر کے چہرہ پر جمی ہوئی تھی۔ یکایک اس کو ایسے محسوس ہوا کہ اس کے شوہر کا چہرہ غمگین ہے۔ اور اس پر حسرت و مایوسی چھائی ہوئی ہے اس کی نظر کا فتور نہ ہو۔ "آج وہ "باہر" کیوں نہیں گئے"۔ وہ انگوٹھے سے اپنے ہموار دانتوں پر ہلکی ہلکی ضربیں لگاتی ہوئی فلسفیانہ انداز میں سوچنے لگی "میری حالت پر ترس تو نہیں آگیا"۔ دل خوش کن خیال وہ کہتے ہیں نا" شاعر محبت کی نورانی چمک" اس وقت اس کی تھکی ہوئی آنکھوں سے نکل نکل کر اپنے خوابیدہ شوہر کی بلائیں لے رہی تھی۔ اور وہ ایک ہلکی سی کشمکش کے بعد بستر سے اٹھنے میں کامیاب ہوگئی۔ پلنگ سے اتر کر وہ کمبل سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے شوہر پر ڈالنا چاہتی تھی کہ نقاہت و کمزوری کے باعث لڑکھڑا کر اس کے سینے پر گر پڑی شمیم چونک کر آنکھیں کھول دیا۔ اپنے سینہ پر شاہدہ کو اور بدن پر کمبل کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ شاہدہ چاہ رہی تھی کہ وہ یوں ہی اس کے کشادہ سینہ پر پڑی رہے شمیم اس کے نازک جسم کو اپنے قوی بازوؤں میں لے کر آہستہ سے پلنگ پر لٹادیا اور خود اس کے سر کی طرف بیٹھ کر جبین پر سے بالوں کو ہٹا رہا تھا۔ اور شاہدہ یوں یکدم گر جانے پر دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی تھی اور اسی کے راحت بیز اثر سے اس کی آنکھیں بند تھیں شمیم نے جھک کر آہستگی سے اس کی جبین پر اپنے کانپتے ہوئے لبوں کو ثبت کر دیا اور دو قطرے اشک کے اس کی مردانہ آنکھوں سے بہہ کر شاہدہ کے رخساروں پر گر پڑے۔

غزل

جناب سید سلطان محی الدین صاحب سیفؔ

ہمت ہے، ارادہ ہے، پرجوش اگر دل ہے　　آسان جو نہیں ہوتی وہ کونسی مشکل ہے

تاروں میں چمک کیسی پھولوں میں مہک کیسی　　اس پرتو رنگیں سے سب رونق محفل ہے

اب تک تو یہ مشکل تھی کیونکر وہ نقاب الٹے　　اس نے جو نقاب الٹا اب دیکھنا مشکل ہے

یہ راز کھلا ہم پر دنیا کی کشاکش سے　　ہشیار ہے وہ سب سے دانستہ جو غافل ہے

اللہ رکھے قایم ہے ضعف کا یہ عالم
ہر گام پہ رکتا ہوں ہر گام پہ منزل ہے

ناہید

جلد ۶ — بہمن ۱۳۵۲ ف م ڈسمبر ۱۹۴۲ عیسوی — نمبر ۳

۱ - تبصرہ آرائی - بتائیے کیا ہماری محفلوں میں ایسا نہیں ہوتا؟ بلکہ آتی ہیں تعزیت کو مگر ہونگی باہمی گھروں کے جھگڑوں کی داستانیں - یہ نہایت اصلاح طلب حالت ہے -

۲ - افسانوی خط - بسلسلہ گذشتہ ہے ختم پر آپ خیال آرائی فرمائیں -

۳ - مکتوبات جمیل - فاطمہ لیاقت حسین بلگرامی کا ہے ان کی تحریریں نہایت بلیغ ہوتی ہیں اور ہر لفظ سے فلاسفیت ٹپکتی رہتی ہے -

۴ - انسداد گداگری - سلطانہ عزیز کی دوسری کاوش ہے اور دلچسپ پیرایہ میں گداگری پر روشنی ڈالی ہے - اور اس کے اصلاحی پہلو بھی نمایاں کیئے گئے ہیں -

۵ - خواب پرستوں کی یادیں - پڑھئے تو یہ معلوم ہوگا کہ آپ بیداری سے خواب میں پہنچ گئے -

۶ - دیہات - میں دیہاتی زندگی کا نہایت معصومانہ نقشہ کھینچا ہے اور حقیقت کا اظہار ہے -

۷ - میاں بیوی، تو میاں بیوی ٹھیرے - اپنے تعلقات کو خوشگوار بنانا میاں بیوی کا کام ہے جہاں غیر کی دست اندازی محض بے سود -

'ب'

تبصرہ آرائی

صغرا عبد السبحان

ایک کام ہو تو کوئی گنائے۔ بھلا جس کے سپرد اتنا کچھ کام انجام دینا ہو اسے کہاں وقت جو کچھ کہہ سن سکے۔ خیر مختصراً آپ بھی سن لیجئے۔ ہمارے اَن گنت کاموں میں سب سے بڑی مصروفیت اور ساتھ ہی بڑی دلچسپ دوسروں کے حالات کی چھان بین کرنا ہے۔ ہم منتظر رہتے ہیں اور بہت بے چینی سے کہ کوئی ایسا واقعہ ہاتھ آئے جس پر ہم جی کھول کر تبصرہ آرائی کر سکیں۔ ماشاء اللہ سے ملنے والوں کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں کی تو بات ہے کہ رشیدہ (یہ ہماری ایک دوست ہیں اور کچھ دور قریب کی رشتہ دار بھی ہیں) کے بھائی کی شادی ہوئی۔ شادی کیا بس یہ سمجھ لیجئے کہ دو لہا میاں دلہن کے گھر گئے اور چپ چپاتے دلہن کو اپنے گھر لے آئے بھلا بتائیے تو کوئی کس طرح چپ رہ سکتا۔ تو بہ ایسی بھی شادی کیا کہ رشیدہ سگی بہن کو سہرہ بندھائی تک نہ نصیب ہوئی۔ رشیدہ کہنے لگی۔ "ہمارے پاس بہت اچھا قاعدہ ہے کسی رسم و رسومات کی پابندی نہیں ہوتی" یہ سب کہنے کی باتیں ہیں حالانکہ بی بنو کو سسرال والوں نے کچھ کم نکو نہ بنایا ہوگا۔ حامدہ کا پہلونٹی کا بچہ ہم سمجھتے تھے کہ ماں نے بہت دھوم دھڑکے سے چھٹی چھلہ دیا ہوگا مگر معلوم ہوا کہ بس بچے کے چند جوڑے کپڑوں پر ہی معاملہ ٹھنڈا ہوگیا۔ ناصر بیوی کو ساتھ لے کر ولائت گئے ہیں بس بہت ساری ڈگریاں لے کر واپس آئیں گے۔ میں نے ان کی بہن سے کہا "مبارک ! بھاوج تو چار سال کے بعد تمھیں پہچانیں گی بھی نہیں اور جو بھتیجے بھتیجی ہوں گے ان کو تو تمھاری باتیں بھی سمجھ میں نہ آئیں گی۔"
اور ایک صاحب ہیں وحید ادھوں نے تو اپنے بچے کو چھوئی موئی بنا لیا ہے۔ ہر بات وقت پر ہو اور ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ جیسے یہ سب کرنے سے وہ کبھی بیمار تھوڑی ہوگا۔ پرسوں ہی تو ایسا سخت بیمار پڑا کہ آدھا ہو کر رہ گیا میں نے سلمہ سے کہا کہ ایسے پابند الدین کا بچہ اور بیمار ہو جائے بڑے تعجب کی بات ہے۔ سلمہ جھلا سی گئی اور کہنے لگی ہمارا بچہ کوئی ما فوق الفطرت تو نہیں کہ کبھی بیمار نہ پڑے نہ ہم نے کبھی اس بات کا دعویٰ کیا تھا۔ فیروزہ کے یہاں گئی تھی یہ بیچاری تو اُن کا کاٹھ کی پتلی معلوم ہوتی ہے جو بات پوچھو اس کا جواب مل جائے گا اور بس دنیا اور دنیا والوں سے تو اسے کوئی سروکار ہی نہیں۔ کچھ کہو تو وعظ سننے بیٹھ جاتی ہے کہتی ہے آخر آپ کیا چاہتی ہیں۔ میں پڑھتی ہوں، لکھتی ہوں، ہنستی بولتی ہوں، گھر کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ ہاں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کے حالات اور معاملات میں خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑاؤں اور درد سر مول لوں۔ سب کے بیچ میں ٹپکنا کسی

مضحکہ اڑانا یہ انسانیت نہیں ہے تو بہ ہے ان کے وعظ بیان سے تو دماغ چکرانے لگتا ہے۔ موقع ملنے پر ہم بھی اسے خوب بناتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم برا کرتے ہیں یا بھلا ؟

مکتوبات جمیل

فریب خوردہ بہار کے نام

فاطمہ لیاقت

مہر محبت پیاری بہن ! افق محبت پر ہمیشہ تاباں رہو۔ یاد فرمائی کا شکریہ اور صد ہزار۔ چونکہ صبر آزما عرصہ دراز تک تم نے بھول کر بھی یاد نہ کیا اس لئے میں یہ کہکر خاموش ہوگئی تھی۔ ع "عمرت دراز باد فراموش کار من" کہ دفعۃً "تمھارے نامۂ محبت نے دین و دل روشن کرکے اس خیال کی تردید کردی۔ ع "کرم کردی الہیٰ زندہ باشی"

کل پھر دوسرا صحیفہ الفت ملا۔ "شد کر مہائے تو چندانکہ کر مہائے تو"۔ اس سے قبل آپ کا کوئی نامۂ کرم نہ ملا۔ ورنہ میں اس درجہ کج اخلاق تو نہ تھی کہ جواب نہ دیتی۔

تمھارا "قصہ غم" اور داستان حرماں نصیبی سن کر دلی افسوس ہوا۔ ہائے یہ بھی دنیا کا ایک زبردست سانحہ ہے کہ "جس کیلئے" دنیا چھوڑ دیجائے۔ "وہی" اس کا نہ رہے بقول کسی دل جلے کے

سا ری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا میں نے دنیا چھوڑ دی جس کیلئے

تمھارا یہ کہنا کہ ع "داغم از یں کہ با تو چرا آشنا شدم" اور ان کا یہ حال کہ ان کو "شیوۂ کرم" کا ذرا بھی خیال اور نہ "ذوق ستم" ہی کا حوصلہ

ایں جور دیگر است کہ آزار عاشقاں چنداں نمی کنی کہ بہ بیداد خو کنند

تم کو اگر کسی "دشمن ارباب وفا" کیلئے جان ہی دینا ہے اس کے "تیر نیمکش" کا لطف ہی لینا ہے تو پھر شکوہ فضول اور اپنی آہ کی نارسائی کی شکایت لاحاصل۔ ع اے خوشا عمرے کہ صرف راہ استغنا شود۔

جیسا کہ ایک عالی حوصلہ شاعر مشورہ دیتا ہے ۔ ع نہ خورم زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد

تو تم کو اس کا مصداق ہونا چاہئے کہ

بلبل نیم کہ نالہ کنم دردسر دہم پروانہ ام کہ سوزم و دم بر نیاورم

اسی میں لطف اور کیف بھی ہے۔ اور اگر اس کی ہمت نہیں تو پھر جانے بھی دو اس "مفت کی درد سری" کو اس "قصہ غم" کو بھول جاؤ۔ اور رنجش بیجا کو فراموش کر کے دل سے مٹادو خاک پر بنے ہوئے نقوش کی طرح۔ لفظ "محبت" تو ڈکشنری کا ایک فرسودہ اور بے معنی لفظ ہے۔ یہ زمانہ وہ نہیں کہ فرہاد کسی کیلئے سر پھوڑتا پھرے نہ وہ وفا کہ شیریں اپنے آشفتہ سر کیلئے جان دیدے۔

اجی سرکار! بقول ایک خوش نگار ادیب کے محبت ایک "حماقت" ہے خواہ وہ قبل مسیح ہو یا بعد مسیح جیسا کہ ہمارا ایک معجز نگار فلسفی کہہ اوٹھتا ہے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خنداں ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اب تو محبت بھی دوسرے کھیلوں کی طرح ایک کھیل ہے اور تفریح کا سامان۔ جب تک جی لگا کھیلا اور جب گھبرا گیا تو شاعر کے مشورے۔ ع "دل را بزور از کف دلبر گرفتہ ایم"

پر عمل کیا — چلئے قصہ ختم آپ کو غم نہ کسی دوسرے کو افسوس۔

میری نازک مزاج حضور! کہتی ہوں گی کہ آئیں بڑی چارہ ساز اور ہمدرد بن کر — کچھ عقل میں فتور ہو گیا یا پاگل ہو گئیں آخر یہ ہوا کہ دفعتہً ناصح مشفق بن کر لگیں آشفتہ گوئی کے دریا بہانے لیکن بندی نواز میں باوجود آپ کی گالیوں اور خفگیوں کے پھر بھی کہوں گی کہ ع ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز است

یہ راستہ بہت پُر خار ہے قدم قدم پر دست مصیبت "جیب و دامن" کی دھجیاں اڑا دیں گے اور آپ وامق و قیس کی طرح عمل شوق دیدار کے پیچھے سرگرداں ہی رہیں گی۔

ظالم۔ بھلا تجھے یہ بھی کیا خبط ہوا ہے مجھے تیرے حال زار سے زیادہ تیری مجنونانہ عقل پر رحم آتا ہے۔ معبود تجھے عقل دے۔

اگر تم کو آشفتہ سری کا اتنا ہی شوق ہے اور خار زار محبت کی دشت پیمائی کا اس درجہ خبط سوار ہوا ہے تو پھر یہی کعبہ مقصود کیوں ہے؟ سر پھوڑنے کیلئے پہاڑ بہت صحرا نوردی کیلئے جنگلوں کی کیا کمی —؟ کیونکہ ان کو بھی تو کبھی بھی تمہاری جنون پسند حالت پر رحم آ نہیں سکتا۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

تم مجھ کو بوقت چائے نوشی خاص طور پر یاد کرتی ہو غنیمت ہے۔ ع بیا بیار بادہ کہ ایں ہم غنیمت است

تمہارا خط نہ آنے سے بھابی بھی بہت پریشان تھیں۔ خدا کے لئے ان کو تو خیریت لکھدیا کرو۔ ظلم کی یہ کوئی

نئی طرز ہے؟ کیا کشتۂ جفا بنانے میں تم کو بھی لطف آنے لگا ہے خدا کرے تم مع اپنی ستم ظریفیوں کی بعافیت ہو۔

افسانوی خط

رشید فاطمہ

بسلسلۂ گذشتہ

وہ ایک خوددار اور چلبلی طبیعت پائی تھی۔ جب تم اور وہ میٹرک پاس کر چکیں تو اس نے انٹر میں قدم رکھا۔ تم تو اس سے جدا ہو کر ازدواجی زندگی کی زنجیروں میں جکڑ گئیں اور پھر تم نے ایک زمانہ تک روحی کی کوئی خبر نہ لی۔

روحی ابھی انٹر میں ہی تھی کہ اس پر ایک ایسا روح فرسا واقعہ گذرا جو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کالج سے جب مکان لوٹ رہی تھی کہ اس کی کار ایک گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ ڈرائیور تو فوراً اس حادثہ کی تاب نہ لا کر دنیا سے کوچ کر گیا۔ نازک روحی بیہوش ہو گئی۔

یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ جب ذرا سی بات ہو جاتی ہے تو لوگوں کو مذاق ہاتھ آتا ہے یہ تو اتنا بڑا واقعہ تھا۔ سارے تماشائی تماشا دیکھنے کی غرض سے آ جمع ہوئے اور کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اس آفت ناگہانی کو اپنے کندھوں پر لیلے۔ اسی اثنا میں ایک کار تیزی سے چلی آئی اور ہجوم کو دیکھ کر رک گئی۔ کار سے دو نوجوان جن کی عمر تقریباً چوبیس پچیس برس کے لگ بھگ ہو گی اترے اور اس واقعہ کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ یہ دونوں نوجوان سج دھج سے کسی امیر گھرانے کے چشم و چراغ دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں خوبصورت تھے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے۔ بظاہر دونوں بھائی نظر آ رہے تھے۔ ہاں تو آگے سنو۔ تم تو کہتی ہوں گی کہ بس کسی بھلی شکل کو دیکھا۔ لگیں باتیں بنانے۔ اگر تم بھی ہوتیں تو بغیر تعریف کئے نہ رہتیں۔ اچھا اب سنو۔ یہ دونوں کار کے قریب آئے۔ اور بیہوش روحی کو باہر نکالا۔ ڈرائیور کی نبض دیکھی جو کہ بالکل ساکت ہو چکی تھی۔ اس کو اور روحی کو لے کر دواخانہ گئے۔ روحی کے دماغ پر سخت چوٹ آئی تھی۔ ہاتھ اور چہرے پر کچھ خراش۔ ہر ایک کی مرہم پٹی کی گئی۔ مگر باوجود کوشش کے ہوش میں نہ لا سکے۔ تب تو یہ نوجوان بہت گھبرائے آخر پتہ لگا کر ان میں کا ایک نوجوان روحی کے مکان پر پہنچا۔ تم تو روحی کا مکان جانتی ہی ہو کس قدر خوبصورت اور عالیشان محل ہے۔ اس نوجوان نے اپنے نام کا کارڈ جس پر

مسٹر عارف بی۔ اے لکھا تھا۔ اندر بھجوایا۔ اس وقت میں روحی کے مکان آئی ہوئی تھی۔ اتفاقاً نرگس (چھوکری نے کارڈ مجھے لاکر دیا۔ چونکہ پہلے میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا۔ اس لئے حیران ہوئی کہ کون صاحب ہیں۔ نرگس سے ہی سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ اس نے کہا۔ میں کیا جانوں بی بی ایک خوبصورت صاحب ہیں اور پریشان نظر آرہے ہیں میں نے جھنجھلا کر کہا۔ نرگس میں نے تجھ سے یہ کب پوچھا کہ خوبصورت ہیں یا بدصورت، میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ کون صاحب ہیں۔ کس کے لئے آئے ہیں۔

آخر کار میں بی اماں (روحی کی والدہ کو جو میری خالہ تھیں میں بی اماں کہا کرتی تھی) پاس دوڑی دوڑی گئی۔ اور ان کو یہ کارڈ دیا۔ چونکہ کارڈ سنہری تھا اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ اس لئے بی اماں نے کہا شمی (یہ مجھے محبت سے پکارتی تھیں) کس کا ہے کون آیا ہے۔ کیا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کوئی عارف صاحب ہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔ اے بھی آخر یہ تو بتا کس سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھر میں نے نرگس، سوسن، گلاب۔ چنبیلی کو پکارا۔ گلاب آئی۔ میں نے بہ غرض دریافت باہر بھیجا۔ اور یہ بھی کہا کہ ان کو دیوان خانے میں بٹھائے۔ گلاب دوڑتی ہوئی گھبرائی ہوئی آئی اور کہنے لگی بی بی وہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں اور بی بی روحی کے بارے میں کچھ کہنے آئے ہیں وہ آپ لوگوں سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سُن کر مجھے اور بی اماں کو فوراً روحی کا خیال آیا۔ جس کو عرصہ ہوا موٹر جا چکی تھی اور ہم نے خیال نہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ یوں بھی اکثر وقت دیر سے آتی تھی۔ اس لئے خیال نہ رہا۔ میں اور بی اماں گھبرا گئیں بی اماں تو تھیں پرانے خیال کی بھلا وہ کس طرح بات کرتیں اور میں تو ابھی لڑکی ہی تھی کس طرح جا سکتی۔ آخر کار بی اماں روحی کی خبر سُن کر بحد پریشانی کی حالت میں چلی گئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے چلی۔ دیکھا کہ ایک صاحب جن کے گھنگروالے بال۔ بلند پیشانی۔ گورا رنگ۔ پتلون کے جیب میں ہاتھ ڈالے بے چینی سے ٹہل رہے تھے اور بار بار دروازے کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر سے دستی سے پسینہ بھی پونچھ رہے تھے۔ ان کی صورت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت پریشان اور تھکے ہوئے ہیں۔

بی اماں نے گلاب سے کہا کہ کہنا میں آگئی ہوں جو کچھ کہنا ہے کہیں، گلاب نے کہا۔ صاحبزادے صاحب۔ بیگم صاحبہ تشریف لائی ہیں جو کچھ کہنا ہے جلد کہیں، تاکہ ہم سب کی پریشانی دور ہو۔ پہلے تو انھوں نے مودبانہ سلام کیا۔ پھر کہنے لگے کہ صاحبزادی صاحبہ شاید اسکول سے جب تشریف لا رہی تھیں تو کسی کی گاڑی کی ٹکر سے بیہوش ہوگئیں اتفاقاً میرا اور بھائی شاہد کا گذر اس طرف سے ہوا۔ ہم لوگ انہیں فوراً دواخانہ لیگئے مگر بحد سعی کے باوجود ہوش نہیں آیا۔ ڈرائیور تو مر چکا ہے۔ یہ سن کر بی اماں تو رونے لگیں۔ اور میں مبہوت ہوگئی پھر بھی کچھ تسلی و تشفی دینے کے بعد فوراً

دوڑی دوڑی خالو ابا کے آفس میں گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ موجود نہیں۔ ناکام واپس لوٹی اور پریشان تھی کہ کیا کریں کہ عارف صاحب نے کہا کہ کوئی ہرج نہ سمجھیں تو میری موٹر حاضر ہے آپ لوگ چل سکتے ہیں۔ میں نے اس کو ہی غنیمت جانا اور بی اماں کو سمجھا بجھا کر دواخانہ روانہ ہوئے۔ عارف صاحب موٹر چلا رہے تھے اور ہم دونوں اندر اللہ پیر منا رہے تھے۔ خدا خدا کرکے دواخانے کی عمارت دور سے نظر آنے لگی۔ ہم کو کچھ اطمینان ہو رہا تھا۔ آخر کار ہم بے چینی و بیقراری کے ساتھ دواخانے میں داخل ہوئے۔ نرگس کو لے کر اترے اور ان صاحب کے پیچھے پیچھے اس کمرہ میں داخل ہوئے جس میں روحی بیہوش پڑی تھی۔ چہرے اور ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور ایک صاحب سوٹ بوٹ سے سج دھج بہت ہی خوبصورت۔ ستوان ناک۔ بلند پیشانی۔ لامبا قد۔ سڈول جسم، صورت سے ذہانت اور شرافت عیاں تھی۔ روحی کی نبض دیکھ رہے تھے اور ان کی صورت سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان کی آنکھیں روحی کی صورت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور وہ اس وقت اس قدر محو تھے کہ ہم لوگوں کے آمد کی ان کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ دوسری طرف ڈاکٹر دل کا امتحان کر رہا تھا۔ میرا دل روحی کی یہ حالت دیکھکر بلیوں اچھل رہا تھا کہ عارف صاحب نے کہا۔ شاہد بھائی۔ آپ کی روحی کی طرف اشارا کرکے) والدہ صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ آپ ہٹ جائیے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ شاہد ایکدم چونکے اور بہت ہی حیرانی اور پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے بی اماں تو زار و قطار رو رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے کہ شاہد نے بہت ہی شیریں آواز سے کہا کہ اگر (روحی کی طرف اشارہ کرکے) گھر لیجائیں تو بہتر ہے۔ بی اماں نے پریشانی میں مجبوراً بات کرلی۔ اور کہنے لگیں۔ شاہد میاں۔ آپ کی جو سمجھ میں آئے کرو اور کسی طرح میری بچی کو ہوش میں لے آؤ۔ میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔ اللہ میری بچی کو اچھا کردے۔ یہ حالت دیکھکر میں دنگ تھی نہ میں کچھ کہہ سکتی تھی اور نہ خاموش رہ سکتی تھی۔

آخر کار ہم۔ شاہد اور عارف کے اشاروں پہ چلنے لگے چونکہ شاہد خود ایک بہترین ڈاکٹر تھے۔ اسلئے وہ دونوں بھی ساتھ تھے۔ گھر پہنچے تو خالو ابا موجود تھے اور یہ حالت دیکھکر بیحد پریشان کیونکہ تم جانتی ہی ہو کہ صرف روحی ہی ان کی سب کچھ ہے وہ ایک ہی تو ہے۔ غرض روحی کو ایک خوبصورت مسہری پر لٹایا گیا۔ اور بجلی کا پنکھا کھول دیا گیا بی اماں نے شاہد اور عارف کی ہمدردی کو خالو ابا سے بیان کیا جس سے خالو ابا پر بھی ان کی شرافت اور ہمدردی کا بیحد اثر کیا۔ خالو ابا نے باصرار انہیں روک لیا اور حکم دیا کہ فوراً چائے تیار کی جائے۔ شاہد ابتک برابر روحی کو ہوش میں لانے کی ہر ترکیب عمل میں لا رہے تھے۔ مگر بیسود۔ روحی کی وہی حالت تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا وہ اس وقت سفید شلوار اور ڈوپٹہ میں ملبوس بہت ہی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ (باقی)

خواب پرستوں کی یاد میں

نزہت سلطانہ

آغاز بہار کا دلربا موسم آپ جانئیے یوں بھی افسردہ اور بیمار طبیعتوں میں عجب طرح کی طرب انگیز لیکن روح فرسا کشمکش پیدا کر دیتا ہے جو قلب حزیں میں خار بن کر چپ چاپ کھٹکتی رہتی ہے۔ ایک کرب آمیز مایوسی ایک سرور انگیز بے تابی کا سنگم روح کی گہرائیوں میں ایسے ایسے دلکش اور دلفریب خوابوں کے رخ سے دامن ہٹا دیتا ہے جو دلوں میں سوئی ہوئی پر اسرار خواہشوں کو بیدار کر دیتے ہیں جن کا پورا ہونا ہی سرے سے ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی المناک ساعتوں میں آپ ہی بتائیے کوئی مجبور انسان سوائے آنسو بہانے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ موسم بہار کی ان جان نواز شاموں میں جب خوبصورت گلاب کے پودے بیشمار پھولوں سے لد گئے ہیں۔ جب نیلوفر کی کلیاں پتیوں کے دامن میں منہ چھپائے مسکراتی ہیں۔ جب کنول کی ریشمی پتیوں پر پانی کے چمکدار قطروں میں سنہری دھوپ جگمگاتی ہے۔

جب جھیل کی سطح سرخ و سفید پھولوں کی ریشمی چادر سے ڈھک جاتی ہے۔ جب بلبل کے زمزمے باغ کی روشوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ اور سنہری مکھیاں شہد کی تلاش میں دور دور نکل آتی ہیں اس وقت خود بخود ان سوئے ہوئے خواب پرستوں کی پرانی یاد دل کی گہرائیوں میں نئے انداز سے جاگ پڑتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے میری بیتاب روح آپ ہی آپ ان کنج لحد میں آرام کرنے والوں کی طرف پر کشش انداز میں کھچی چلی جا رہی ہے۔ جو فردوس کی پرسکون وادیوں میں اپنی سنہری مسرتوں کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھی ان کے قریب ہی خوبصورت سنگ مزار کے سایہ میں محو خواب راحت ہوں۔ جیسے میرے دل اور دماغ پر بھی کوئی پر اسرار بیخودی کوئی نامعلوم نشہ انگیز کیف چھایا جا رہا ہے۔ میرا بیمار جسم جیسے از خود کسی کنج مرقد کے بعید ترین گوشوں میں روپوش ہونے کے لئے بیقرار ہو رہا ہو لیکن آہ یہ طویل بیکار زندگی مجھے موت کے خونین فرشتہ کی طرح گاہ بگاہ آنکھیں دکھاتی ہے اور یہ معلوم ہونے لگتا ہے جیسے کوئی باریک۔ لیکن تیز تر نشتر غم میرے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی مسرتوں کو رفتہ رفتہ کاٹ رہا ہو کاٹتا چلا جا رہا ہو۔

یاس و ناامیدی کا گہرا اثر آپ سے آپ میری مرجھائی ہوئی روح پر چھا جاتا۔ افسردگی کی ایک روح

فرسا کیفیت مجھ پر غلبہ پا لیتی ہے۔ میرے غمگین تخیل کو صدہا نا معلوم اندیشے ایک عجیب طرح کا خوف انگیز انتشار اور عجیب وغریب توہمات گھیر لیتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے جیسے میری زندگی ساری کی ساری کوئی کرب ہے مسلسل یا کوئی درد ہے نا معلوم یا کوئی تصویر ہے مایوس ارمانوں کی کوئی افسانہ ہے افسردہ اور ناکام آرزوؤں کا۔ کوئی مزار ہے پامال تمناؤں کا۔ یا کوئی دھندلا سا عکس ہو میری مرحوم مسرتوں کا۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ زندگی کوئی گہرا ناسور ہے جو اندر ہی اندر میری روح کو کھوکلا کئے جا رہا ہو۔ میری حیات ناتمام کے شگفتہ غنچہ کا تازہ رس پی پی کر درد وکرب کی آبیاری میں مصروف ہو یاس انگیز خیالوں کے ہجوم میں یہ جینے کی آرزو کسی زہریلے ناگ کی طرح مجھے پھنکارتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بعض وقت میں محسوس کرنے لگتی ہوں۔ جیسے کوئی پراسرار لیکن نامعلوم قوت کسی تیز تر لیکن پرکشش اور ہولناک جذبات کے زیر اثر مجھے زندگی کے پُرخار راستوں پر کھینچے لئے جا رہی ہو۔ اور اچانک کہیں سے لاتعداد خار غم میرے سینہ میں چبھے جاتے ہوں۔ لیکن میں۔ چلی جا رہی ہوں ہنستی ہوئی مسکراتی ہوئی جبکہ میری روح خاکی نشیمن میں پھڑ پھڑا رہی ہو۔ میرا دل اندوہ کے گہرے سمندر میں ڈوب رہا ہو۔ اس وقت بھی میرے دل کے بوجھ کو بڑی خوشی سے میرے لبوں کا تبسم اٹھائے رہتا ہے۔

تاہم بعض وقت میرے استقلال کی کشتی گہرے طوفانوں میں ڈگمگا جاتی ہے اور میری خون زیر آنکھیں سکون کے سرمایہ پر بے طرح پانی پھیر دیتی ہیں۔ تب میں اپنا دامن بہت سے خوبصورت رنگین پھولوں سے بھر کر رفتار خیال کی سی آہستگی سے اپنے خواب پرست دوستوں کے خوشنما مزاروں کی طرف نکل آتی ہوں۔

فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے۔

"انسداد گداگری"

سلطانہ عزیز بی۔ اے سال اوّل (کلیہ اناث)

آج ہم کالج سے ایک طلاطم مسرت لئے ہوئے ساری فضا میں مسکراہٹ کی لہریں دوڑ رہی تھیں پر کیف ہوا نغمہ چھیڑتی۔ رقص وسرود کرتی گذر جاتی۔ ہر شئی شگفتہ و بشاش نظر آ رہی تھی۔۔۔

معبود! آج کس قدر مسرور ہوں۔ کتنا خوش ہوں۔ اف کس قدر کامیاب تقریر رہی۔ سامعین پر ایک رنگین سکوت طاری تھا۔ ایک حیرت انگیز خموشی ہویدا تھی۔ پروفیسرس کے لبوں پر تحسین آمیز تبسم مچل رہا تھا۔ متعجب ساتھی تحیر زا نگاہوں سے ہمت افزائی کر رہے تھے۔ استاد تقاریر کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ آج مجھے اپنی قوت گویائی پر ناز ہو چلا تھا۔ اپنے الفاظ پر تھوڑا سا گھمنڈ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی طرز گفتار پر احساس غرور پیدا ہو گیا تھا مگر اس عظیم کامیابی میں کسی اور کا حصہ تھا۔ کوئی اور اس سے تعلق رکھتا تھا۔ نوری بابا کا متین و سنجیدہ چہرہ فضائے چشم میں گھوم گیا۔ دلچسپ باتیں کانوں میں گونج گئیں۔ میری ابتدائی تقریریں استاد نوری کی منت پذیر ہیں۔ میرا طرز بیان ان کا مشکور ہے۔ میرے الفاظ ان کے ممنون ہیں (ٹن۔ٹن۔ٹن۔ٹن) گھنٹے کی غیر شاعرانہ سُر نے تخیلی کائنات سے چونکا دیا۔ اف چار بج گئے۔ مجیدی نے چار بجے بلایا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ پٹرول کی سکیم نے کس قدر آفت ڈھائی ہے۔ خدایا اتنی دور۔ اور سیکل پر۔ خیر تصور موٹر کئے ہوئے ہم سیکل پر سوار ہو گئے۔

حسین فضائیں۔ خوشگوار ہوائیں جراءت افزائی کر رہی تھیں۔ رنگیلے نوجوانوں کی شوخ ٹولیاں سیاہی مائل بھوری سڑکوں پر محو خرام تھیں۔ دو طرفہ گھنے درختوں کی سبزی طراوت بخش رہی تھی۔ ہم اطمینان سے سیکل نوازی کر رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اچھا خاصہ تنومند جوان کاسۂ گدائی لئے پولیس کے بندھنوں میں گرفتار چلا جا رہا ہے اس کی بیڑیوں کی کرخت آوازنے رونگٹے کھڑے کر دئے۔ دلچسپ شور و غل میں بے کیف ہیجان بپا ہو گیا۔ میرے دل سے ایک سوز و گداز میں لپٹی ہوئی آہ نکلی۔ آخر یہ ملازمت کیوں نہیں کرتا۔ کڑیل قسم کا انسان ہے مگر بیچارہ بھیک مانگتا ہے کس قدر تاسف کا مقام ہے۔ اے حمیت ہند کیا تجھ میں کبھی ایسا تلاطم و جوش نہ آئے گا جو تجھے افلاس کی بندشوں سے چھڑائے۔ اے کم۔ ور ذہنیت ہند کیا تجھ میں کبھی ایسا ہیجان و ولولہ نہ بپا ہو گا کہ جو تیرے جسد بے جان میں پھر سے روح حریت پھونک دے۔ ہندستانی معاشی ذرائع کس قدر محدود ہیں۔ ان بیکسوں کو کہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ صرف چند ایک کارخانے ہیں جس میں کتنے لوگ ملازم رکھے جائیں گے۔ ملکی خام اشیا کی برآمد ہو جاتی ہے۔ زمین اپنی قابلیت پیداوار میں کمی کر دیتی ہے۔ اناج کم پیدا ہوتا ہے۔ کھانے والوں کی افراط ہے۔ اشیائے خوردنی کی کمی۔ اس لئے غلہ زیادہ داموں سے فروخت ہوتا ہے۔ غریب طبقہ اپنی ضروریات زندگی کی شکل سے بھی تکمیل نہیں کر سکتا۔ کاشتکاروں کی تعلیم یافتہ اولادیں اپنے آبائی پیشہ کو باعث ننگ سمجھتی ہیں۔ ہر ایک کا نصب العین ملازمت سرکار ہے۔ اسی وجہ سے تجارت و زراعت کی گرماگرمی ماند پڑ گئی ہے۔ بے روزگاری کی باد سموم ہر طرف چلنے لگی ہے۔ آخر یہ بیچارے کہاں تک مصائب جھیلتے

کب تک ... ںوں مرتے۔ انھوں نے گداگری کو زندگی کا سہارا سمجھ لیا۔ میری نظریں ایک تسلسل کے ساتھ اس کا تعاقب
کر رہی تھیں ... وہ اوجھل ہو گیا۔ تخیلات بھی خنک ہواؤں کی رو میں بہہ گئے۔
...م بےحد سلونا تھا۔ سیکل سست رفتار سے پل عبور کر رہی تھی۔ اکّا دکّا موٹریں پونگا بجاتی ہوا کے
جھکڑ کی ... یزی سے گذر جاتیں۔ انسان کے ابتدائی عقلی کارنامے یعنی بے ڈھنگی سی بنڈیاں شور و غل کرتی ٹرٹر
ایک ہنگامہ ... بپا مچاتی آہستہ آہستہ متحرک تھیں۔ مجیدی کی ملاقات نے گرمایا۔ ہم نے پیڈل پر زور دینا شروع کیا
ہی تھا کہ ... الھڑ کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لپکی اور سائیکل پکڑ کر دوڑنے لگی اس سے
پہلے کہ ... یافت کرتا کہ تو ہے کون بلا۔ چاہتی کیا ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرا ہی دیا۔ غریب ہوں سرکار بھوکی
ہوں۔ ... ایک پیسہ۔ میں نے اظہار غصہ کرتے ہوئے کہا۔ پیسہ ویسہ نہیں۔ چلی جا۔ ورنہ میں سیکل کی رفتار
تیز کردوں ... تو اس کا ساتھ نہ دے سکیگی۔ وہ کسی طرح نہ مانتی۔ مسلسل سیکل تھامے دوڑ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا
وہ ملگجے ... پہنے ہوئے تھی۔ نکلتا ہوا قد۔ الجھے ہوئے بال، سانولی رنگت پر بکھر رہے تھے۔ میں نے سمجھاتے ہوئے
شرافت ... کہا۔ اس وقت پیسہ نہیں ہے تو چپکے سے چلی جا۔ وہ اب بھی دوڑ رہی تھی میں نے اس کو گھور کر دیکھا
معصوم ... دل کے اطراف پسینہ کے بڑے بڑے قطرے جمع ہو گئے تھے۔ بھولی سی صورت پر گرد کا بھوراپن نمایاں تھا
میں نے ... منہ کو پھیر لیا۔ اس کی نسائیت پر رحم آ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اکنّی ہاتھ لگی۔ وہی بادلِ ناخواستہ
اس کے ... کر دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ بےحد بشاش تھا۔ میرے
لبوں پر ... بے معنی تبسم کھیل رہا تھا۔

...ت کا یہ کس قدر ظلم ہے۔ ان بیچاروں کو بھیک دینے سے روکا جاتا ہے۔ تاکید کی جاتی ہے۔ اگر خیرات
بالکل ... دی جائے تو یہ غریب زندہ درگور ہو جائیں۔ ایک اصلاح یافتہ طریقہ انسداد گداگری کے لئے یہ
ہوسکتا ... مراد سے خیرات سالانہ وصول کر لی جائے۔ اور اس روپیہ سے ان کے لئے محتاج خانے یتیم ورانہ
تعلیم کے ... دارس کھولے جائیں۔ اپاہج فقیر چین سے روٹی کھائیں گے۔ گورنمنٹ کو بھی دعا دیں گے اور ہمیں بھی۔
اس طریقہ ... کار بند ہونے سے ایک اہم ترین فائدہ حاصل ہوگا۔ ایسے فقیر جو مہلک و خطرناک بیماریوں میں مبتلا
ہیں اور ان کی زندگی نہ صرف بیکار بلکہ نوع انسانی کے لئے مضر ہے۔ آرام سے زندگی گذار سکتے ہیں۔ عوام کی صحت
پر بھی برا ... نہیں پڑ سکتا۔ نوعمر بچے اور بچیوں کی تعلیم و تربیت بغیر کسی مزاحمت کے ہوسکتی ہے جو سڑکوں
پر حشرا... رض کی طرح غذا کی جستجو میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔ مجیدی کا گھر قریب ہو چلا تھا۔ صرف ایک

پار کرتی تھی۔ ایک سن رسیدہ نشیب و فراز کا مرقع دیوار کے قریب سے گذر رہا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑے افلاس ومعیبت کی گواہی دے رہے تھے۔ کمزور تھرتھراتے پاؤں زمانے کے شاعرانہ چالوں سے اظہار واقفیت کر رہے تھے۔ وہ گھبرا کر ادِھر اُدھر دیکھتا جاتا۔ گھڑی گھڑی چونک پڑتا۔ جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ میں نے اسکے چہرے پر نگاہ غائر ڈالی۔ شناسا سا چہرہ نظر آیا۔ پہچانی ہوئی صورت تھی۔ نوری بابا کی دھندلی سی شباہت ملتی تھی اس نے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں اس کے پاس سے چپکا گذر گیا۔ میرا نام کوئی پکار رہا تھا۔ میں رُکا۔ وہ مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ میں متعجب تھا۔ نقش بر دیوار تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ لیکن اتنی جراءت نہ تھی کہ اس کا نام لے سکوں۔ بڑی دقت سے زبان کی گرہیں کھلیں۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ نوری بابا یہ کیا حالت ہے۔ وہ نزدیک آگیا تھا۔ کہنے لگا کیا بتائیں صاحب ہمیں اپنی قابلیت پر اعتماد تھا۔ اپنی ڈگریوں پر بھروسا تھا جن سے ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں۔ بھلا فلک کج رفتار کی گردش کب چین سے بیٹھنے دیتی ہے ایک عرصہ تک امراء کے دروازوں کی جبین سائی کی۔ ہر ایک دفتر کے در کھٹکھٹائے۔ فطرت پر جبر کر کے خوشامد کی۔ مگر صاحب کیا کہیں۔ سہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ڈگری یافتہ نوجوان تلاش روزگار میں پڑے بھٹکتے ہیں۔ ان کی کہیں سمائی ہی نہیں ہوتی۔ جب ایک تعلیم یافتہ گروہ کی یہ حالت ہے تو بھلا نیم یافتہ اور ان پڑھ کی کیا حالت ہوگی۔ ہاں کسی نے خوب کہا تھا۔ ہر ایک کو اپنی جان بیحد عزیز ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے مصائب جھیلتا ہے۔ تکالیف برداشت کرتا ہے۔ فاقہ کشی کرتا ہے۔ لیکن مرنا پسند نہیں کرتا۔ موت کا منہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں اکثر کہا کرتا تھا کہ ذلت کے جینے سے عزت کی موت بہتر ہے۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھ میں زندگی کی ہوس باقی ہے مجھے اس غیر دلچسپ حیات سے محبت ہے جس نے ہزاروں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ آج صبح سے چھپتا پھرتا ہوں یہ پولس مانگنے سے روکتی ہے۔ میں نے بہ دقت تمام کہا۔ نوری بابا تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم میرے ہمدرد قدیم ہو۔ وہ نیم راضی سر جھکائے کھڑا تھا۔ تانگا آچکا تھا۔ اس کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ میں سیکل پر پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ نوری بابا کا مغموم مرجھایا ہوا چہرہ حسرت برسا رہا تھا۔ راہ معیشت محدود ہے۔ ملازمت کے چور راستے بند ہیں۔ جو شخص جس کام کی اہلیت یا قابلیت رکھتا ہو، اس سے وہی کام لینا چاہئے۔ انہیں نئے نئے ہنر سکھائے جائیں تاکہ دوسروں کی زندگی بھی بن جائے اور خود ملک کی صنعتی حالت کی خرابی بھی دُور ہو جائے۔ کسی ملک میں اس وقت تک گداگری کا انسداد نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ان کے لئے نئے میدان معیشت نہ فراہم کئے جائیں۔ امراء اور دولتمندوں کا یہ کام ہے کہ وہ ملک سے معیبت کے دُور

دور کرنے میں اپنے خزانوں کے منہ کھول دیں جیسا کہ آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ میں خوش تھا۔ کیونکہ مجھے ایک گم شدہ مونس مل گیا تھا ایک حقیقی غمخوار دستیاب ہو گیا تھا۔ جسے کھوئے ہوئے ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ وہ سنجیدہ تصویر عبرت بنا بیٹھا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دیہات

مسز عظمت عبدالقیوم خان

سرلا کی تعریفوں نے مجھے دیہات کی زندگی کا ضرور شایق کر دیا تھا مگر پھر جب میں شہر کی زندگی کی رنگا رنگ دلچسپیوں کو دیکھتی تو میرے خیالات بدل جاتے ہم دونوں بیٹھے گھنٹوں شہری اور دیہاتی زندگی پر بحث کرتے۔ میں شہر کی آسائشوں، پر کیف مصروفیتوں، دلچسپیوں، کلب، پارٹی، سوسائٹی، سنیما، سیر تفریح کو اس مبالغہ آمیزی سے بیان کرتی کہ سرلا کچھ دیر کیلئے مخالفت بند کر کے بڑے انہماک سے میری گفتگو سننے لگتی اور میں سمجھتی فتح میری ہوئی۔ میں نے اسے قائل کر دیا مگر وہ خود سرلا کی کیا قائل ہونے والی؟ جھلا کر کہہ اٹھتی ختم بھی کرو تم تو شروع ہو گئیں تمہار بیرسٹرانہ بحث سے میں گھبرا جاتی ہوں کسی چیز پر بحث شروع کرتی ہو تو گھنٹوں نہیں تھکتیں کاش تم مرد ہوتیں اور بیرسٹر بنتیں تم کیا جانو کہ گاؤں کی زندگی کس قدر پر سکون اور فرحت بخش ہوتی ہے۔ پرماتما جانے تم لوگ شہر کے بے پناہ ہنگاموں میں کیسے خوش رہتے ہیں کلب کی دلچسپیوں کا ذکر تو تم نے کیا لیکن آئے دن جو شکر رنجیاں اور بے لطفیاں پیدا ہوتی ہیں انہیں کیوں نظر انداز کر دیا؟ بہر حال میں یہ کہے بغیر نہ رہونگی کہ تمہاری پر آسائش زندگی سے ہماری سادہ زندگی کہیں بہتر ہے چند روز اگر تم دیہات میں رہو تو پھر شہر آنے کا کبھی ارادہ نہ کرو گی آخر کار میں اس کی منطق سے تنگ آ کر موضوع بحث ہی بدل دیتی۔ سرلا کے اور میرے پتا میں انتہا محبت ہے دونوں ایک دوسرے کو دوست نہیں بھائی سمجھتے ہیں سرلا کی عمر جب سات آٹھ سال کی ہوئی تو اس کے پتا کو اس کی تعلیم کی فکر ہوئی یہ تو ممکن نہ تھا کہ اس کی تعلیم کی خاطر وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر شہری زندگی اختیار کرتے لہذا انہوں نے طے کیا کہ کسی زنانہ بورڈنگ ہوس میں بورڈر کر دیں پتا جی کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے دوست سے خوب ہی گلہ کیا کہ میری موجودگی میں سرلا بورڈنگ میں کیوں رہے؟ ہمارے یہاں چھوڑ دو۔ وہ اور سروج ساتھ اسکول جایا کریں گے میں نے بھی خوش ہو کر منت کے لہجہ میں کہا چاچا جی سرلا بہن کو ہمارے یہاں چھوڑ دیجئے ہم دونوں ساتھ پڑھیں گے ساتھ کھیلیں گے۔ انہوں نے ہنس کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور سرلا کو لانے کا وعدہ کر کے چل دیئے۔ ایک ہفتہ بعد سرلا ہمارے گھر میں تھی میرا بازو کا کمرہ اس کو دیا گیا تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی طرح محبت سے رہتے۔ تعطیلات میں سرلا اپنے گاؤں چلی جاتی اور جاتے ہوئے ساتھ چلنے کیلئے مجھ پر بیجا اصرار کرتی لیکن میں کبھی اس کے ساتھ نہ جا سکی کئی سال گذر گئے۔ اس دفعہ تعطیلات سے کچھ دن پہلے ہی سے سرلا گاؤں چلنے کیلئے میرے سر پر سوار تھی اس نے ایک روز ترکیب کی کہ میرے والدین سے مجھے لیجانے کی اجازت حاصل کر لی۔ اب چوں و چرا کی کوئی گنجائش نہیں تھی قصہ مختصر ایک صبح ہم دونوں

ٹرین سے روانہ ہوئے۔ شہر سے بہت دور ایک اسٹیشن پر اترے۔ وہاں سرلا کے پتا بیل گاڑیوں کے ساتھ
ایک گاڑی میں میں اور سرلا بیٹھے دوسری میں اس کے پتا تیسری میں سامان اور نوکر — ہمارا چھوٹا سا
شام ہو رہی تھی چرواہے اپنے ریوڑ لئے واپسی کے گیت گا رہے تھے۔ تھکا ہارا سورج بھی اپنے ٹھکانے کی
رہا تھا۔ سامنے پہاڑیوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ حد نظر بنا ہوا تھا۔ کچی پیچدار سڑک بعض وقت یہ دھوکا
کو پہاڑ پر سے گذرنا ہوگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد کچھ آبادی معلوم ہونے لگی۔ چند جھونپڑیاں
چھوٹے چھوٹے مکان وغیرہ، میں نے سرلا سے دریافت کیا۔ کیا تمھارا مکان یہیں ہے۔ اس نے اپنے مخصوص
جواب دیا۔ کچھ فاصلہ پر — چند منٹ بعد ہم سرلا کے گھر پہنچے۔ یہ اور مکانات سے بہتر اور بڑا تھا۔ سرلا
ہماری منتظر تھیں۔ ہم دونوں نے پرنام کیا۔ اشیرباد دینے کے بعد انھوں نے کہا جاؤ لڑکیو ہاتھ منھ دھو
کرو، کھانا تیار ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر چاچی جی سے شہر کی باتیں ہوتی رہیں پھر سب
بجے سرلا نے مجھے یہ کہکر جگایا اٹھو چار بج چکے۔ ندی پر اشنان کرکے دیوی جی کی پوجا کو جانا ہے۔ اس
ناشتہ دینے والی نہیں۔ یہ شہر نہیں ہے کہ نرم گدوں پر سات بجے تک پڑے خراٹے لیا کریں۔ جب نوکر آ
کھنکھناتے کہ "میز تیار ہے" تو چونک کر اوٹھے۔ ناشتہ سے فارغ ہوئے، بغیر اشنان کئے ایک نفیس ساڑی
میں بیٹھ کر کالج روانہ ہوئے۔ رانی جی! یہ دیہات ہے دیہات!! غریبوں کے بسنے کی جگہ — یہاں
خیال رکھا جاتا ہے۔ خلاف عادت تین گھنٹے پہلے بیدار ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے جھلا کر کہا تنگ
واقعی تم دیہاتی بڑے بدتمیز ہوتے ہیں۔ ہمارے شہر میں مہمان کے آرام کو مقدم سمجھا جاتا ہے یہ عجیب بات ہے
مہمان کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا جائے۔ تو یہ — اس نے رازدارانہ انداز میں کہا پرماتما کے لئے اٹھو۔ یہ
جانے دے کر کیا ماتاجی سے پٹواؤ گی۔ خیر سرلا کے اصرار پر میں بادل ناخواستہ اوٹھ بیٹھی۔ ہم دونوں
یہ بالکل سچ ہے کہ اس روز سویرے ندی پر نہانے میں جو لطف آیا ایسا گرم حماموں میں شاور باتھ
نہ ہوا تھا۔ ندی کی پرتیر لہروں کا ہلکا تموج اور بھیگے جسم پر ہوا کے خنک تھپیڑے عجب جان نواز تھے۔
پتوں کو بہتا دیکھکر بچپن کا وہ کھیل یاد آیا جب ہم کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ بنا کر باتھ ٹب میں چلایا کرتے
ہم گھر آئے تو دیکھا کہ چاچی جی پوجا کا تھال جوڑے ہماری منتظر ہیں۔ ہم تینوں دیول کی طرف روانہ
تو باتوں ہی باتوں میں طے ہوگیا۔ دیول کے چھوٹے سے دروازے پر پہنچ کر میں نے سرلا کو غور سے دیکھا۔
گیسو کھولے پیشانی پر تلک لگائے اور سفید ململ کی ساڑی پہنے وہ خود دیوی معلوم ہو رہی تھی عقیدت

چہرے کو منور کر دیا تھا۔ اس طرح مندر میں اس کو کھڑی دیکھکر یوں معلوم ہو رہا تھا۔

"ایک موتی کی دیوی ہے کہ مندر میں کھڑی ہے"

پوجا سے فارغ ہو کر جب گھر لوٹے تو میں اپنے عقاید میں نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ سچ ہے عبادت کے بعد انسان کو جو سکون قلب حاصل ہوتا ہے اس کا اظہار الفاظ میں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ جب تک گاؤں میں رہے روزآنہ صبح ندی کو جانا اور وہاں سے دیول ہمارا معمول ہوگیا تھا۔ اب صبح مجھے بیدار کرنے کی زحمت سرلا کو اٹھانی نہیں پڑتی تھی۔

اکثر شام میں ہم دونوں دھان کے کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔ مجھے اب بھی یاد آتی ہیں وہ خنک ہوائیں اور وہ نظر فریب کھیتیاں تو دل چاہتا ہے کہ کسی گاؤں میں جا بسوں۔ میلوں سبز مخملی فرش اور اس میں سے موتی کی طرح شفاف بہتا ہوا پانی —— ایک طرف تو یہ روح افزا منظر اور دوسری طرف ایک روح فرسا تماشا —— غریب کسان کیچڑ سے اٹے ہوئے ہاتھ پیر دھو کر اپنا سامان کندھے اور سر پر اٹھائے اپنی جھونپڑیوں کی طرف لوٹتے۔ چہرے پر انتہائی تکان کے آثار لیکن پھر بھی خوش کہ چند گھڑیاں بال بچوں کے ساتھ ہنس بول کر گذارنے کا موقع ملا۔ ننھے ننھے سیاہ فام بچے جن کے تن پر کپڑا تک نہ ہوتا۔ باپ کو دور سے آتا دیکھکر دوڑے ہوئے آتے اس کو سامان سے لدا دیکھکر نادان یہ سمجھتے ہوں گے کہ ہمارا باپ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ہمارے لئے لا رہا ہے انہیں کیا خبر کہ ان کا جفاکش باپ آدھی رات سے دوڑا ہوا جا کر دن بھر جو مشقت اٹھاتا ہے وہ ان کے لئے نہیں بلکہ امیروں اور رئیسوں کے لئے ہے۔ کسانوں اور ان کے بدنصیب بیوی بچوں کے مقدر میں تو بھوک اور غربت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ افلاس —— ایک بڑا گناہ —— اس کی سزا —— بھوک۔ اف !!!

جس کھیت سے دہقاں کو میسر ہو روزی   اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

غزل

وحیدہ نسیم

زمانہ اب نیا ہوگا ہر اک دل شادماں ہوگا   خوشی کی زندگی ہوگی مقدر مہرباں ہوگا

جلا جو شب کو پروانہ تو رو کر شمع یہ بولی   سحر تک رازِ الفت کا ہمارے بھی عیاں ہوگا

شہاب، ناہید بہمن ۱۳۵۲ف

نشیمن پر گرے گی کس کے تو اے برق مضطر کل ۔ نہ شاخ آشیاں ہوگی نہ اپنا آشیاں ہوگا
مصیبت جب پڑی مجھ پر ندا یہ غیب سے آئی ۔ میرے صبر آزما بندے تیرا پھر امتحاں ہوگا
نسیم اپنی زباں میں آہ مرنا جس کو کہتے ہیں ۔ فسانہ زندگی کا اختتام داستاں ہوگا

"میاں بیوی اور آپس کے تعلقات"

رحیم النسا سبحانی

قدرت نے دونوں کو حقیقی معنوں میں شریک زندگی بنایا ہے۔ وہ بدقسمت ہیں جو آپس کے تعلقات ناخوشگوار کر لیتے ہیں۔

جس طرح بیوی پر چند ذمہ داریاں ہوتی ہیں اسی طرح شوہر کو بھی چاہیئے کہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرے اور صحیح معنوں میں زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔ اکثر گھرانوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ چاہے بیوی کتنی ہی فرمانبرداری، خدمت گذاری اور محبت سے اپنے فرض کو انجام دے رہی ہو مگر میاں صاحب کے دل میں اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔ ذراسی غلطی پر ہزاروں باتیں سنائی جاتی ہیں۔ اگر کسی بات کا رنج انسان کو ہوجائے تو وہ پتھر کی لکیر بن جاتا ہے اور اس کا شیشہ کے جیسا دل ہمیشہ کے لئے چکنا چور ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کو حتی الممکن طریقہ سے کوشش کرنا چاہیئے کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے آپس کے تعلقات ناخوشگوار ہو جائیں۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کے آرام آسائش کا خیال کرے۔ اُس کی خوشی کو مقدم رکھے، گھر کی سجاوٹ اور صفائی کی طرف سے کبھی لاپرواہی نہ برتے۔ گھر میں ہر طرح کے دلچسپی کا سامان مہیا کرے اور گھر کو اتنا دلچسپ بنائے کہ شوہر گھر کو جنت سمجھے۔ بچوں کی تربیت اچھی ہو۔ اچھی باتیں سکھائے۔

شوہر کا بھی فرض ہے کہ بیوی کی خوشی کو مقدم سمجھے۔ اُس کے آرام کا خیال کرے۔ اُس سے اچھی باتیں کرے۔ گھر کو ہوٹل نہ سمجھے جھگڑے کی باتوں سے اجتناب کرے اور بیوی کی دلچسپیوں کا بھی خیال رکھے اور یہ خیال کرنا چاہیئے کہ گھر کے کام دھندوں کو ختم کر کے کوئی وقت ایسا ملنا چاہیئے کہ وہ کسی سے ہنس بول سکے۔ اب ظاہر ہے کہ شوہر نے اگر لاپرواہی برتی تو غریب کدھر جائے گی۔ بعض شوہروں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ گھر میں کسی ضرورت کا سامان موجود نہیں رہتا۔ بچوں کو دیکھو تو میلے کچیلے۔ مگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ ان کی غلطی کا نتیجہ ہے ہر چیز مہیا کرنا اِن کا کام ہے اور روپیہ پیسہ دینا غرض یہ سب ان کی ذمہ داری ہے۔ معمولی معمولی سی باتوں کا خیال انسان کو کرنا چاہیئے ورنہ یہی باتیں جھگڑے پیدا کرتی ہیں اور زندگی اک عذاب بن جاتی ہے۔

محمودیہ پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب، بیرون دبیر پورہ سے شائع ہوا۔